معیاری

اردو گرامر اور کمپوزیشن

(بہ اضافات جدیدہ)

مطابق جدید سلیبس

طلبہ انٹرمیڈیٹ کے لیے

مرتبہ

پروفیسر محمد حیات خان سیال

ایم۔ اے

شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج جھنگ

©

سنز

۲۲۱۔ سرکلر روڈ۔ اردو بازار۔ لاہور

اردو لازمی پرچہ دوم مکمل

معیاری

اُردُو گرامر اور کمپوزیشن

(نیا ایڈیشن)

مطابق جدید سلیبس

طلبہ انٹرمیڈیٹ کے لیے

مرتبہ

پروفیسر محمد حیات خان سیال ایم۔ اے

شعبۂ اُردُو، گورنمنٹ کالج جھنگ

©

نذر سنز

۲۲۱۔ سرکلر روڈ۔ اردو بازار۔ لاہور

نقش اول—طبع اول : مارچ ۱۹۶۴

نقش جدید—طبع اول : ستمبر ۱۹۸۵ء

ناشر : نذر سنز ۔ لاہور

مطبع : اظہار سنز پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۲۵ روپے

دیباچہ نقش جدید

امتحان انٹرمیڈیٹ منعقدہ 1987ء کے اردو لازمی کے نصاب میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔

علم بیان اور اصناف نظم و نثر کو پرچہ ب میں سے خارج کر کے ان کی بجائے عملی قواعد، جملوں کی تصحیح وغیرہ کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ چنانچہ نصاب کی ان تبدیلیوں کے پیش نظر کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے تاکہ جدید نصاب کے مطابق طلبہ کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔

ناشر

نیا نصاب اردو لازمی پرچہ ب
برائے امتحان منعقدہ ۱۹۸۷

ا ۔ عملی قواعد — ۲۵ نمبر

قواعد سے متعلق سوالات ، غلط جملوں کی تصحیح ، محاورات اور روز مرہ کا درست استعمال ۔

ب ۔ تلخیص — ۱۵ نمبر

ج ۔ روداد نویسی/کالم نویسی — ۱۵ نمبر

د ۔ خط/آپ بیتی — ۱۵ نمبر

ہ ۔ مضمون — ۳۰ نمبر

تعارف

'معیاری اردو گرامر اور کمپوزیشن' میرے رفیق کار پروفیسر محمد حیات خاں سیال ایم - اے (اردو)، ایم اے (فارسی) کی تالیف ہے - پروفیسر موصوف ایک سنجیدہ اور متین استاد ہیں اور طلبا کے تدریسی مسائل پر نہایت سنجیدگی سے سوچتے ہیں اور ان کے اس خلوص کار نے طلبا کی نصابی مشکلات میں ہمیشہ راہ نمائی کی ہے -

زیر نظر کتاب انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کے نصاب کو مد نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے - اس سے لازمی و انتخابی اردو کے طلبا یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں، بلکہ میں تو دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ اردو کے تمام طالب علموں (مع السنہ شرقیہ) کے لیے یہ کتاب مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے - امتحانی نقطہ نگاہ کے علاوہ علمی اور معلوماتی نقطہ نظر سے بھی یہ کتاب پوری اہمیت کی حامل ہے -

کتاب کی تالیف میں پروفیسر موصوف نے جس کاوش اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے اس کا اندازہ مضامین کی فہرست دیکھنے ہی سے ہو جاتا ہے - اردو کے مستند اور معروف اہل قلم کے مضامین اس میں ملیں گے، خاموش اور مخلص دوستوں کی کاوش اس میں نظر آئے گی - مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے ایک طرف ادبی مسائل اور ادبی شخصیتوں پر سلجھے ہوئے مضامین کتاب میں شامل ہیں تو دوسری طرف عام معلوماتی اور انشائیہ مضامین بھی موجود

ہیں۔ تنوع نے کتاب کو خوش گوار بنانے میں کافی مدد دی ہے۔

اس میں نصاب کے عین مطابق قواعد کی مشقیں دی گئی ہیں اور وہ تمام مواد جمع کر دیا گیا ہے جس کے بغیر کوئی طالب علم گرامر کے حصے سے پورا انصاف نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ کہنے میں قطعی جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ یہ تالیف اردو کے ہر شائق کے لیے کارآمد ثابت ہو گی۔

پروفیسر تقی انجم (علیگ)
صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج ، لائل پور

مارچ ۱۹۶۴

ترتیب مندرجات

جزو اول (قواعد)

جزو دوم (محاورات)

جزو سوم (جملوں کی تصحیح)

جزو چہارم (تلخیص)

جزو پنجم (روداد نویسی ، مکالمہ نویسی)

جزو ششم (آپ بیتی ۔ خط ۔ عرضی)

جزو ہفتم (مضمون نگاری)

جُزوِ اوّل

قواعد

باب ۲

کلمہ اور اُس کی قسمیں

لفظ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک بامعنی اور دوسرے بے معنی۔ بامعنی لفظ کو موضوع اور بے معنی لفظ کو مہمل کہتے ہیں۔ مثلاً کھانا وانا۔ روٹی ووٹی اس میں کھانا اور روٹی بامعنی لفظ ہیں۔ مگر وانا اور ووٹی بے معنی، چنانچہ لفظ کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ کلمہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں۔ ان میں بیشتر بامعنی اور کچھ بے معنی ہوتے ہیں۔ بامعنی لفظ کو کلمہ کہتے ہیں۔ جیسے کتاب۔ قلم۔ لاہور۔

۲۔ مہمل بے معنی لفظ کو مہمل کہتے ہیں۔ جیسے روٹی ووٹی۔ پانی، وانی دانہ دنکا میں روٹی۔ پانی۔ دانہ بامعنی الفاظ ہیں لیکن ووٹی، وانی اور دنکا بے معنی مہمل ہیں۔ کلمہ ایک لفظ سے زیادہ الفاظ پر بھی مشتمل ہو سکتی ہے مثلاً کتاب پڑھنا۔ روٹی کھانا۔

نوٹ:۔ گرامر میں کلمہ سے بحث کی جاتی ہے۔

کلمہ کی قسمیں کلمہ کی تین قسمیں ہیں۔ اسم۔ فعل اور حرف۔

۱۔ اسم اسم وہ کلمہ ہے جو کسی انسان چیز یا جگہ وغیرہ کا نام ہو اور تنہا اپنے معنی دے لیکن اس میں کوئی زمانہ نہ پایا جائے۔ جیسے۔ اسلم۔ ہرن۔ کراچی۔ درخت۔ پاکستان۔ انسان۔

۲۔ فعل وہ کلمہ ہے جس میں کسی خاص زمانہ میں کام کا کرنا یا ہونا پایا جائے اور تنہا بھی اپنے معنی دے جیسے پڑھا۔ کھاتا ہے۔ لکھے گا۔

پڑھا میں زمانہ ماضی، کھاتا ہے۔ میں زمانہ حال اور لکھے گا۔ میں زمانہ مستقبل ہے۔

۳۔ حرف حرف وہ کلمہ ہے جو تنہا کچھ معنی نہ دے لیکن دوسرے کلموں کے ساتھ مل کر معنی دیتا ہو۔ جیسے سے، کو، پر، میں وغیرہ۔

اسلم نے خط لکھا۔ وہ پشاور سے آیا ہے۔

اِن جملوں میں اسلم، خط اور پشاور اسم ہیں۔ لکھا اور آیا ہے۔ فعل اور نے اور کو حرف ہیں۔

باب ۳

اِسم کا بیان

بناوٹ کے لحاظ سے اِسم کی قسمیں

بناوٹ کے لحاظ سے اِسم کی تین قسمیں ہیں۔ جامد۔ مصدر۔ مشتق۔

۱۔ اسم جامد اسم جامد وہ اِسم ہے جو نہ تو خود کسی کلمے سے نکلا ہوا ورنہ اس سے کوئی کلمہ نکلے۔ جیسے شہر۔ آدمی۔ میز۔ چاند۔

۲۔ اسم مصدر اِسم مصدر وہ اسم ہے جو خود تو کسی کلمے سے نہ نکلا ہو لیکن اِس سے اور کلمے مقررہ قاعدوں کے مطابق بنتے ہوں۔ جیسے پڑھنا۔ لِکھنا۔

مصدر کے معنی نکلنے کی جگہ کے ہیں۔

۳۔ اسم مشتق اِسم مشتق وہ اِسم ہے جو خود تو کسی کلمے سے نکلا ہو لیکن اِس سے کوئی کلمہ نہ نکلے۔ مثلاً پڑھنا سے پڑھنے والا۔ پڑھائی وغیرہ۔

معنوں کے لحاظ سے اِسم کی قسمیں

معنوں کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) خاص یعنی معرفہ (۲) عام یعنی نکرہ۔

۱۔ اِسم معرفہ اِسم معرفہ وہ اِسم ہے۔ جو کسی خاص جگہ، چیز یا شخص کا نام ہو۔ جیسے امتیاز، راوی، ملتان۔

۲۔ اِسم نکرہ اِسم نکرہ وہ اسم ہے۔ جو کسی عام جگہ چیز یا شخص کا نام ہو۔

جیسے مرد، دریا، شہر۔

تعداد کے لحاظ سے اِسم کی قسمیں

تعداد کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔ واحد اور جمع۔

واحد واحد وہ اسم ہے جو ایک چیز کے لیے بولا جائے جیسے۔ کتاب۔ لڑکا۔ میز

جمع جمع وہ اسم ہے جو ایک سے زیادہ چیزوں کے لیے بولا جائے۔ جیسے کتابیں۔ لڑکے۔ میزیں۔

تثنیہ عربی قاعدے سے دو کے لیے علیحدہ لفظ استعمال ہوتا ہے، اِسے تثنیہ کہتے ہیں۔ مثلاً والد سے والدین۔ مشرق سے مشرقین۔ فریق سے فریقین۔

جمع الجمع بعض جمع اسماء کی بھی جمع بنائی جاتی ہے۔ جیسے انبیاء سے انبیاؤں۔ وجہ (وجوہ) وجوہات۔

جنس کے لحاظ سے اسم کی قسمیں

جنس کے لحاظ سے اِسم کی دو قسمیں ہیں۔ مذکر اور مؤنث

مذکر مذکر وہ لفظ ہے جو نر کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے مرد۔ لڑکا۔

مونث مونث وہ لفظ ہے جو مادہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے عورت۔ لڑکی۔

طائرانہ نظر

بناوٹ کے لحاظ سے اِسم کی تین قسمیں ہیں۔

۱- اِسم جامد ۲- اِسم مصدر ۳- اِسم مشتق۔

معنوں کے لحاظ سے اِسم کی دو قسمیں ہیں۔

۱- اِسم معرفہ ۲- اِسم نکرہ

تعداد کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔

۱- واحد ۲- جمع

جنس کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔

۱- مذکر ۲- مؤنث

سوالات

۱- بناوٹ کے لحاظ سے اسم کی کتنی قسمیں ہیں سنہ ۱۹۶۶ء

۲- اسم مصدر اور اِسم مشتق میں کیا فرق ہے۔ مثالوں سے واضح کیجئے۔

۳- مہمل کی تعریف کیجئے اور مثالیں دیجئے۔

۴- کلمہ کی قسمیں بیان کیجئے۔

۵- ہر کلمہ لفظ ہوتا ہے۔ لیکن ہر لفظ کلمہ نہیں ہوتا۔ وضاحت کیجئے۔
(سنہ ۱۹۶۶ء)

باب ۳

اِسم معرفہ کی قسمیں

اِسم معرفہ کی چار قسمیں ہیں :۔

(۱) اِسم علم (۲) اِسم ضمیر (۳) اِسم اشارہ (۴) اِسم موصول ۔

اِسم علم | اِسم علم وہ اسم ہے . جو کسی خاص شخص مقام یا چیز کا نام ہو۔ جیسے امتیاز ۔ راوی ۔ ملتان وغیرہ ۔

اِسم علم کی پانچ قسمیں ہیں :۔

(ا) تخلص :۔ وہ مختصر نام جو شاعر لوگ اپنے اصلی نام کی بجائے اشعار میں استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً علی سکندر جگر ، الطاف حسین حالی ۔ اسد اللہ خان غالب ، محمد رفیع سودا ۔

(ب) خطاب :۔ وہ اِسم ہے جو اعزاز کے طور پہ بادشاہ یا حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے ۔ جیسے شمس العلماء ، سر ، رستم زمان ۔ ہلال پاکستان ۔ ستارہ جرأت

(ج) لقب :۔ وہ نام جو کسی خاص صفت کی وجہ سے مشہور ہو جائے ، لقب کہلاتا ہے ۔ جیسے کلیم اللہ (حضرت موسیٰ) ، اسد اللہ (حضرت علیؓ) خلیل اللہ (حضرت ابراہیم) ، اورنگ زیب عالمگیر (محی الدین)

(د) کنیت :۔ وہ نام ہے جو باپ بیٹے یا کسی اور رشتہ کے تعلق کی وجہ سے پکارا جائے ۔ مثلاً بن مریم (حضرت عیسےٰؑ) ، ابو تراب (حضرت علیؓ) ، صبیحہ کا باپ ، ام کلثوم ۔

(ھ) عرف :۔ وہ نام ہے جو پیار و محبت یا حقارت و ذلت کی وجہ سے مشہور ہو جائے ۔ جیسے کالے خان سے کلّن یا کلّو ، رشید سے شیدا ۔

مرزا نوشہ (غالب)

۲۔ اِسم ضمیر اسم ضمیر وہ اسم ہے جو کسی دوسرے اِسم کی جگہ استعمال ہو۔ جیسے اصغر نے اکبر سے کہا میں مصروف ہوں آپ ذرا کتاب تلاش کریں۔ اس جملے میں "میں" اصغر کی بجائے اور آپ اکبر کی بجائے استعمال ہوا ہے۔ یہ دونوں ضمیر ہیں۔ جس کے لیے ضمیر استعمال ہو اُسے مَرجع کہتے ہیں۔

۳۔ اِسم اشارہ اسم اشارہ وہ کلمہ ہے۔ جس سے کسی اسم کی طرف اشارہ کیا جائے۔ مثلاً وہ لڑکا، یہ کرسی وغیرہ۔

۱۔ اشارہ قریب:۔ جب اشارہ کسی قریب کے اسم کی طرف ہو تو اشارہ قریب کہا جاتا ہے۔ جیسے یہ کرسی، اِس لڑکے کا قلم، اِن پرندوں کے پر۔

۲۔ اشارہ بعید:۔ جب اشارہ کسی دُور کے اسم کی طرف ہو تو اشارہ بعید کہلاتا ہے۔ جیسے وُہ کرسی، اُس لڑکے کا قلم، اُن پرندوں کے پر۔

۳۔ مشارٌ الیہ:۔ جس اسم کی طرف اشارہ کیا جائے۔ اسے مشارٌ الیہ کہتے ہیں۔ جیسے اُوپر کی مثالوں میں کُرسی، لڑکا، پرندہ مشارٌ الیہ ہیں۔

۴۔ اِسم موصول اسم موصول وہ اسم ہے جو کسی اسم کی حالت بیان کرے۔ جیسے جو محنت کرے گا کامیاب ہوگا۔ اس میں جو، اِسم موصول ہے اس کے ساتھ جب تک ایک اور جملہ (جو صلہ کہلاتا ہے)، نہ لایا جائے اس کے معنی واضح نہیں ہوتے۔ جیسے اُوپر کی مثال میں کامیاب ہوگا۔ صلہ ہے۔

جو۔ جونسا، جو کوئی۔ جو کچھ، جس نے، جنھوں نے۔ جس کو، جیسے جن کو جنھیں، جس کا، جس کی، جن کا وغیرہ اِسم موصول ہیں۔

اِسم ضمیر (تفصیلی مطالعہ)

اِسم ضمیر وہ اسم ہے۔ جو جملے میں تکرار لفظی سے بچنے کے لیے کسی دوسرے اسم کی جگہ استعمال ہو۔ جیسے میں اصغر سے ملا اور اس سے پُوچھا تم کہاں جا رہے ہو۔ اس نے کہا میں کالج جا رہا ہوں۔

مذکورہ بالا جملوں میں اصغر کے لفظ کو بار بار لکھنے کی بجائے اس، تم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں یہ ضمیر کہلاتے ہیں۔

اسم ضمیر کی پانچ قسمیں ہیں:۔

(۱) ضمیر شخصی (۲) ضمیر اشارہ (۳) ضمیر موصولہ (۴) ضمیر استفہامیہ (۵) ضمیر تاکیدی

۱۔ ضمیر شخصی

ضمیر شخصی وہ ضمیر ہے جو کسی شخص کے لیے استعمال کی جائے اس کی تین صورتیں ہیں۔ فاعلی۔ مفعولی۔ اضافی۔

(ا) ضمیر فاعلی۔ وہ ضمیر ہے جو کسی جملے میں فاعل کا کام دے۔ جیسے میں

(ب) ضمیر مفعولی۔ وہ ضمیر ہے جو کسی جملے میں مفعول کا کام دے۔ جیسے مجھے۔

(ج) ضمیر اضافی۔ وہ ضمیر ہے جس میں کسی چیز کے ساتھ تعلق ظاہر کیا جائے جیسے میرا۔

ایک وہ جو بات کرتا ہے اسے متکلم کہتے ہیں۔ جیسے میں۔ ہم

دوسرا وہ جس سے بات کی جاتی ہے اُسے مخاطب کہتے ہیں جیسے تو۔ تم

تیسرا وہ جس کی نسبت بات کی جاتی ہے اُسے غائب کہتے ہیں جیسے وہ

صیغہ	فاعلی حالت	مفعولی حالت	اضافی حالت
واحد غائب	وہ اس نے	اس کو یا اُسے	اس کا اس کے اس کی
جمع غائب	وہ انھوں نے	ان کو یا انھیں	ان کا ان کے ان کی
واحد حاضر یا مخاطب	تو تو نے	تجھ کو یا تجھے	تیرا تیرے تیری
جمع حاضر	تم تم نے	تم کو یا تمہیں	تمہارا تمہارے تمہاری
واحد متکلم	میں میں نے	مجھ کو یا مجھے	میرا میرے میری
جمع متکلم	ہم ہم نے	ہم کو یا ہمیں	ہمارا ہمارے ہماری

ضمیر شخصی کی خصوصیات

(۱) اُردو ضمائر میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔

(۲) ضمائر غائب میں واحد اور جمع دونوں کے لیے وُہ آتا ہے اور اس میں اشخاص اور اشیاء کا فرق نہیں ہوتا۔ وہ آدمی، وہ کتابیں۔

(۳) واحد حاضر کا تو بے تکلفی اور محبت کے لیے آتا ہے۔ بے تکلف دوست کو تو کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسلم تو بڑا نادان ہے۔ اگر تو میرے دِل کا ٹکڑا ہے

(۴) نظم میں اکثر مخاطب کے لیے تو لاتے ہیں۔ بادشاہوں کے لیے بھی تو لکھتے ہیں۔

دُعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ
کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے (میرؔ)

تو سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار (غالبؔ)

(۵) دُعا مانگتے وقت خدا سے بھی 'تو' سے خطاب کیا جاتا ہے ؎

توفیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر (انیسؔ)

خلاق بے پایاں ہے تو آسائش دوراں ہے تو

(۶) تعظیم کے لیے تم کی بجائے آپ بولتے ہیں۔ جیسے آپ کا دولت خانہ کہاں ہے۔

(۷) آپ تعظیماً واحد غائب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کفار سے بھی آپ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔

(۸) بڑے آدمی واحد متکلم کی ضمیر کی بجائے جمع متکلم کی ضمیر بولتے ہیں۔ جیسے ہم نے دشمن کے ساتھ صلح کر لی ہے۔

(۹) نظم میں واحد متکلم کی جگہ عموماً ہم استعمال ہوتا ہے ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (غالبؔ)

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی (غالبؔ)

(۱۰) کبھی متکلم عمومیت کے خیال سے ہم استعمال کرتا ہے۔ جیسے ایک روز ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا پڑے گا۔

(۱۱) کبھی متکلم اپنے لیے ہم استعمال کرتا ہے۔

یہ چند روزہ صحبت غنیمت ہے ورنہ پھر ہم کہاں تم کہاں

(۱۲) بعض اوقات یارا ور یاروں کا لفظ واحد متکلم کے لیے استعمال ہوتا ہے ؎

کیا مدنظر تم کو ہے یاروں تو کہیئے
گر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہیئے

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا (ذوقؔ)

(۱۳) انکسار کے لیے متکلم کی ضمیر کے لیے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں:۔
کمترین، خاکسار، غلام، فدوی، بندہ، خادم، نیاز مند، خیر خواہ، فقیر، احقر، دعاگو، نیاز کیش۔

(۱۴) اگر کسی جملے میں دو ضمیریں اس طرح آئیں کہ پہلی ضمیر فاعلی اور دوسری اضافی ہو تو دوسری ضمیر اپنا، اپنے یا اپنی سے بدل جاتی ہے۔ آپ اپنا کام کریں۔

ع تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

؎ آپ ہی اپنا ذرا طرز تغافل دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

(۱۵) جب کسی جملے میں کوئی اسم یا ضمیر فاعلی حالت میں ہو اور وہی مفعول بھی ہو تو بجائے ضمیر مفعولی کے آپ کو، اپنے تئیں یا اپنے آپ کو استعمال کرتے ہیں۔

وہ اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا ہے۔

وہ اپنے تئیں افلاطون سمجھتا ہے۔

(۱۶) آپ اور اپنا دوسری ضمائر کے ساتھ تاکید کے لیے بھی آتی ہیں۔ جیسے میں آپ گیا تھا، میرا اپنا کام تھا۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام (غالبؔ)

فارسی کا لفظ خود بھی انہیں معنوں میں آتا ہے۔ جیسے انھوں نے خود فرمایا۔

(۱۷) ضمیر ہمیشہ اپنے مرجع کے بعد آتی ہے لیکن اشعار میں کبھی کبھی ضمیر اپنے مرجع سے پہلے بھی استعمال ہوتی ہے ؎

وہ واقف ہے اسے یاس کیونکر کرے گا
تو پیش خدا بے گناہی کا دعویٰ

اس شعر میں وہ ضمیر پہلے آگئی اور اس کا مرجع خدا بعد میں آیا۔ اسے اضمار قبل الذکر کہتے ہیں۔

۲۔ ضمیر اشارہ ضمیر اشارہ وہ ضمیر ہے جو اسم کی جگہ بطور اشارہ استعمال ہو۔ 'یہ' اشارہ قریب کے لیے اور وہ اشارہ بعید کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ واحد اور جمع میں یہ اور وہ یکساں آتے ہیں۔ حروف ربط کے آنے سے وہ اُس سے اور یہ اِس سے بدل جاتا ہے۔ اور جمع میں اُن اور اِن ہو جاتا ہے ؎

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اِس میں اور اُس میں

جس چیز یا شخص کی طرف اشارہ کیا جائے اسے مشارٌ الیہ کہتے ہیں۔

اسم اشارہ اور ضمیر اشارہ میں فرق اسم اشارہ اسم کے ساتھ اشارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے یہ میز، وہ لڑکا۔ اس میں یہ اور وہ اسم اشارہ ہیں۔ ضمیر اشارہ اِسم کی بجائے اشارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اسلم محنتی لڑکا ہے۔ وہ امتحان میں اوّل آئے گا۔ وہ ضمیر اشارہ ہے۔ مشارٌ الیہ کے ساتھ جب ضمیر اشارہ آئے تو وہ اسم معرفہ بن جاتا ہے۔ جیسے یہ درخت وہ مکان۔

ضمیر شخصی اور ضمیر اشارہ بعید کے لیے وہ استعمال کرتے ہیں۔ ضمیر شخصی کا تعلق دِل سے ہوتا ہے۔ لیکن اشارہ جسم کے کس عضو سے کیا جاتا ہے۔ ضمیر اشارہ بعید دُور کی چیز کے لیے آتی ہے۔ اور مشارٌ الیہ کا نظر آنا ضروری ہے۔ جیسے وہ مکان۔

۳۔ ضمیر موصولہ ضمیر موصولہ وہ ضمیر ہے جو کسی اسم کی جگہ یا اس کا پتہ یا حالت بیان کرنے کے لیے استعمال ہو۔ اس کے ساتھ ایک جملہ آتا ہے۔ جو اسی اسم کا بیان ہوتا ہے۔ جیسے وہ شخص جو محنت کرے گا کامیاب ہوگا اس میں جو ضمیر موصولہ ہے۔ محنت کرے گا۔ جملے کو مکمل کرتا ہے۔ اسے 'صِلہ' کہتے ہیں۔

ضمیر موصولہ کی مختلف حالتیں

حالت	واحد	جمع
فاعلی	جو، جس نے	جو۔ جنھوں نے
مفعولی	جسے، جس کو	جنھیں۔ جن کو
اضافی	جس کا، جس کے، جس کی	جن کا، جن کے، جن کی

ضمیر موصولہ یہ ہیں۔ جو، جو جو، جو کوئی، جونسا، جونسی، جیسا، جیسے، جیسی، جو کچھ، جس جس، جہاں جہاں، جتنا، جتنی۔

بعض دفعہ جو کے مقابلے میں سو آتا ہے۔ جو ہو سو ہو۔

ع کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

اس میں جو ضمیر موصولہ ہے اور اپنے فرق پہ تاج رکھتے تھے، صلہ ہے۔

۴۔ ضمیر تنکیری ضمیر تنکیری اور ضمیر ہے جو غیر معین اشخاص یا اشیا کے لیے آئے۔ جیسے کوئی اشخاص کے لیے اور کچھ اشیا کے لیے ؎

کوئی محو ہے فکر فرزند و زن میں کوئی چور ہے حب اہل وطن میں

مصرع ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

؎ دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

مصرع ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

؎ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

مصرع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۔ حروف ربط کے آنے سے کوئی کی صورت کسی ہو جاتی ہے۔

مصرع کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

۲۔ جب یہ ضمائر تکرار کے ساتھ استعمال ہوں تو اس میں خاص زور دیا جاتا ہے۔ مگر معنی قلت کے آتے ہیں۔ جیسے اب بھی کوئی نظر پڑ جاتا۔ ابھی کچھ درد باقی ہے ؎

آتا کوئی کوئی تیری محفل میں ہے نظر
ہوتے ہو مہربان جو تم کچھ کچھ کبھی کبھی

۳۔ عربی لفظ بعض بھی تنکیر کا کام دیتا ہے۔ جیسے بعض لوگوں کا خیال ہے۔ بعض بعض ایسے بھی ہیں۔ فلاں۔ کل اور چند بھی ضمیر تنکیر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

۴۔ ضمائر تنکیری دوسرے ضمائر کے ساتھ مل کر مرکب بھی آتی ہیں۔ جیسے جو کوئی، جو کچھ، جس کسی، ہر کوئی، جیسے جو کچھ کہہ بجا ہے۔ جو کچھ ہے غنیمت ہے۔

۵۔ کچھ ذرا سا کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

آپ اپنی عزّت کا کچھ تو خیال کریں

۵۔ ضمیر استفہامیہ ضمیر استفہامیہ وہ ضمیر ہے جو سوال پوچھنے کے موقع پر کسی اسم کی بجائے استعمال کی جائے۔ جیسے کون (جاندار کے لیے)، کیا (بے جان کے لیے)

شعر
ہُو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پہ تیر کون؟

مختلف حالتیں

	واحد	جمع
فاعلی	کون کس نے	کون کنھوں نے
مفعولی	کسے کس کو	کن کو کنھیں
اضافی	کس کا، کس کے، کس کی	کن کا، کن کے، کن کی
ظرفی	کس میں	کن میں

۱۔ جب یہ ضمیریں اسم کے ساتھ آتی ہیں تو صفت کا کام دیتی ہیں۔ اور صفات ضمیری کہلاتی ہیں۔

۲۔ کس۔ کون۔ کونسا، کون سی، کون سے، کیا، کیسے، کب، کے، کتنا، کتنے، کتنی، کہاں، کدھر بھی ضمیر استفہام کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

۳۔ کے استفہام عددی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور اس میں مذکر مؤنث کی تخصیص نہیں ہوتی۔ جیسے کے لڑکے، کے لڑکیاں، مگر یہ لفظ جمع کے لیے آتا ہے۔

۴۔ کون اور کس جاندار کے لیے آتے ہیں ؎

بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے
پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے ؟

ع دیکھیں مر گئے پہ کون اُٹھاتا ہے مجھے

۵۔ کونسا، کونسی بہت سی چیزوں میں کسی ایک چیز کو منتخب کرنے کے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ تمہیں کون سا شعر پسند ہے۔

۶۔ کتنا تعداد یا مقدار کے لیے آتا ہے اور بعض اوقات خبر کے لیے بھی جیسے کتنے ہی آدمی مجھ سے ملے، کتنی کتابیں بک چکی ہیں ؟

۷۔ کیوں، سبب اور وجہ پوچھنے کے لیے آتا ہے ؎

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کل تک نہ تھی پسند

۸۔ کب، وقت اور زمانہ معلوم کرنے کے لیے آتا ہے ؎

تو آتا ہے جب نہیں آتا میرؔ ،
اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا

۹۔ کہاں اور کدھر جگہ کے لیے آتے ہیں ؎

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

۱۰۔ کیونکر، وجہ یا تفصیل دریافت کرنے کے لیے آتا ہے ؎

کھاتے عزیزوں کی ٹھوکریں کیونکر
ہند میں اتفاق ہوتا اگر

آپ کیونکر یہاں پہنچے ؟

۱۱۔ بعض اوقات، کون، کس، کہاں، کتنا، تکرار آتے ہیں ؎

یا رب رکھیں گے پنبہ و مرہم کہاں کہاں
سوز دروں سے سارا بدن داغ داغ ہے

ع کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

ضمیر استفہامیہ کی قسمیں

۱۔ استفہام استخباری:۔ جس میں خبر پائی جائے۔ جیسے وہ کون آ رہا ہے۔
۲۔ استفہام انکاری:۔ جس میں انکار کے معنی پائے جائیں۔
نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔
؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے۔
۳۔ استفہام اقراری:۔ جس میں اقرار کے معنی پائے جائیں۔ جیسے
ع یہ محبت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟
کیا میں نے اُسے نہیں کہا تھا کہ تم فیل ہو جاؤ گے؟

۶۔ ضمیر تاکیدی وہ ضمیر ہے جس میں کسی شخصی ضمیر کی نسبت تاکید کی جائے۔ جیسے یہ آپ۔ اپنا، اپنے، اپنی اور خود لگانے سے بنتی ہے۔ جیسے میں خود یہ کام کروں گا۔ تمہارا اپنا بھائی کہتا ہے ؎
کہاں میں اور کہاں اے شادؔ دنیا — میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
؎ آپ ہی اپنا ذرا طرز تغافل دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

طائرانہ نظر

اِسم کی بناوٹ کے لحاظ سے قسمیں:۔(۱) اِسم جامد (۲) اسم مصدر (۳) اِسم مشتق
معنوں کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں:۔ اسم معرفہ اور اسم نکرہ۔
اسم معرفہ کی چار قسمیں ہیں:۔(۱) اِسم علم جیسے راوی (۲) اسم ضمیر جیسے تم۔ میں
(۳) اسم اشارہ جیسے وُہ۔ یہ (۴) اسم موصول جیسے جو۔ جونسا۔ جوکوئی وغیرہ۔

اِسم ضمیر کی قسمیں (۱) ضمیر شخصی (۲) ضمیر اشارہ (۳) ضمیر موصولہ۔
(۴) ضمیر تنکیری (۵) ضمیر استفہامیہ (۶) ضمیر تاکیدی۔

سوالات

۱- اسم معرفہ اور اسم نکرہ میں کیا فرق ہے۔ مثالوں سے واضح کیجئے۔

۲- اسم معرفہ کی کتنی قسمیں ہیں ہر ایک کی تعریف کیجئے اور کم از کم ایک مثال دیجئے۔

۳- اسم جامد- اسم مصدر اور اسم مشتق پر مختصر نوٹ لکھیئے۔

۴- ضمیر شخصی سے کیا مراد ہے۔

۵- اسم اشارہ اور ضمیر اشارہ میں کیا فرق ہے۔

۶- اِسم ضمیر 'وُہ' کی مختلف حالتیں فاعلی- مفعولی اضافی فقروں میں استعمال کرو۔

۷- مندرجہ ذیل گرامر میں کیا ہیں۔

خاقانیٔ ہند- کلیم اللہ- ابوالقاسم- شمس العلماء- ابوتراب۔

باب ۴

اسم نکرہ کی قسمیں

اِسم نکرہ وہ اسم ہے جو کسی عام چیز شخص یا جگہ کا نام ہو۔ اس کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں۔

۱۔ اسم ذات ۲۔ اِسم صفت ۳۔ اسم مصدر ۴۔ اسم استفہام۔
۵۔ اسم مشتق۔

۱۔ اِسم ذات

وہ اسم نکرہ ہے۔ جو ایک ہی قسم کی ایک چیز د[illegible] مشترکہ نام ہو۔ جیسے کتاب۔ چاقو۔ گھوڑا۔ چنانچہ ہر [illegible]ب کو کتاب اور ہر چاقو کو چاقو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسم ذات کی قسمیں یہ ہیں۔

۱۔ اسم تصغیر ۲۔ اسم مکبّر ۳۔ اسم ظرف ۴۔ اسم آلہ۔ ۵۔ اسم صوت
۶۔ اسم جمع۔ ان کا مفصّل بیان بعد میں آئے گا۔

۲۔ اسم صفت

اسم صفت وہ اسم ہے جو کسی دوسرے اسم کی اچھائی یا بُرائی بیان کرے۔ مثلاً سیاہ۔ سفید۔ نیک۔ بد سرد۔ گرم وغیرہ۔

۳۔ اِسم مصدر

اسم مصدر وہ اسم نکرہ ہے۔ جس سے کسی کام کا کرنا۔ ہونا یا سہنا ظاہر ہو لیکن زمانے کی قید نہ ہو مثلاً کھانا۔ پینا۔ سونا۔

۴۔ اسم استفہام

وہ اسم نکرہ ہے جو سوال پوچھنے یا کسی بات کے دریافت کرنے پر بولا جائے۔ مثلاً کون۔ کدھر۔ کب۔ کیسا۔

۵۔ اسمائے مشتق

اسم مشتق وہ اسم نکرہ ہے جو کسی مصدر سے نکلے لیکن اس سے اور کوئی کلمہ نہ بن سکے۔ مثلاً کھیلنا سے کھیلنے والا۔ کھیلا ہوا۔ کھیلتا ہوا۔ کھلاڑی۔

اسم مشتق کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں۔

ا۔ اسم معاوضہ:۔ اس اسم کو کہتے ہیں۔ جو کسی محنت یا خدمت کے معاوضہ کا نام ہو۔ مثلاً رنگنا سے رنگائی۔ سینا سے سلائی۔ دھونا سے دُھلائی وغیرہ۔

ب۔ اسم حالیہ:۔ وہ اسم ہے جو فاعل یا مفعول کی حالت ظاہر کرے۔ مثلاً کھیلتا ہوا۔ روتا جاتا۔ ہنستا ہوا۔

ج۔ اسم فاعل:۔ اسم فاعل وہ اسم مشتق ہے جو اس چیز یا شخص کو ظاہر کرتا ہے۔ جس سے کوئی فعل سرزد ہو۔ مثلاً کھیلنے والا۔ چرواہا۔

جب اسم فاعل کسی قاعدے کے مطابق بنے تو اسے اِسم فاعل قیاسی کہتے ہیں۔ جیسے لکھنے والا۔

جب اسم فاعل کسی خاص قاعدے کے مطابق نہ ہو تو اسے اسم فاعل سماعی کہتے ہیں۔ جیسے لکڑہارا۔ چرواہا۔ رکھوالا۔

د۔ اسم مفعول:۔ وہ اسم نکرہ مشتق ہے۔ جو کسی ذات کو ظاہر کرے۔ جس پر کوئی فعل واقع ہو۔ مثلاً کھیلا ہوا۔ مارا ہوا۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ سماعی اور قیاسی۔

ہ۔ اسم حاصل مصدر:۔ وہ اسم ہے۔ جو مصدر نہیں ہوتا لیکن اس میں مصدر کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس سے کسی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے اسم کیفیت بھی کہتے ہیں۔ مثلاً جلنا سے جلن، تڑپنا سے تڑپ۔ تھکنا سے تھکاوٹ حاصل مصدر ہیں۔

اِسم نکرہ کی اقسام کا تفصیلی مطالعہ:

اِسم ذات کی قسمیں

(۱) اِسم مکبّر (۲) اسم تصغیر (۳) اسم ظرف (۴) اسم آلہ (۵) اسم صوت (۶) اسم جمع -

۱- اسم مکبّر

اسم مکبّر وہ اسم ہے جس میں بڑائی کے معنی پائے جائیں- جیسے بات سے بتنگڑ، پگڑی سے پگڑ، چھتری سے چھتر وغیرہ -

بعض دفعہ اسم سے پہلے بڑا یا بڑی لگا کر اسم مکبّر بناتے ہیں- جیسے بڑا آدمی، بڑی میز -

فارسی اسمائے مکبّر بھی اردو میں استعمال ہوتے ہیں -ان سے پہلے شاہ، خر، دیو وغیرہ ہوتا ہے - جیسے راہ سے شاہراہ، پَر سے شہپر، توت سے شہتوت - سوار سے شہوار، مگس سے خرمگس، مہرہ سے خرمہرہ - دیوہیکل - دیو قد وغیرہ -

۲- اِسم تصغیر

اسم تصغیر وہ اسم ہے جس میں چھوٹائی کے معنی پائے جائیں جیسے پہاڑ سے پہاڑی، مشک سے مشکیزہ، باغ سے باغیچہ وغیرہ-

اِسم تصغیر پیار اور حقارت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے. جیسے مکھ سے مکھڑا، مرد سے مردوا -

چند مثالیں

اسم	اسم تصغیر	اسم	اسم تصغیر	اسم	اسم تصغیر
اماں	امّی	ٹانگ	ٹنگڑی	کھال	کھلڑی
آم	انبیا	ٹوکرا	ٹوکری	کمبل	کمبلی

اِسم	اِسم تصغیر	اِسم	اِسم تصغیر	اسم	اسم تصغیر
آنکھ	انکھڑی	تھال	تھالی	کوٹھا	کوٹھڑی
بھائی	بھیّا	ٹٹو	ٹٹوا	کونڈا	کونڈالی
باغ	باغیچہ	جورُو	جوروا	گھر	گھروندا
بیٹی	بٹیا	جی	جیوڑا	لوٹا	لٹیا
بالا	بالی	چادر	چدریا	لونڈی	لونڈیا
بچہ	بچونگڑا	چُڑی	چُڑیا	مرد	مردوا مردک
بندی	بندیا	دُکھ	دُکھڑا	مشک	مشکیزہ
بُرج	بُرجی	دیگ	دیگچہ	مُکھ	مکھڑا
پاگل	پگلا	ڈبہ	ڈبیا	نگر	نگریا
پتیلا	پتیلی	ڈھول	ڈھولک	ناند	نندولا
پنکھا	پنکھی	سانپ	سنپولیا	ہانڈی	ہنڈیا
پلنگ	پلنگڑی	کھاٹ	کھٹولا		

۳- اِسم ظرف

اِسم ظرف وہ اِسم ہے جس میں جگہ یا وقت کے معنی پائے جائیں۔ جیسے گھر۔ شام۔ مدرسہ وغیرہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں

(ا)۔ اگر جگہ کے معنی پائے جائیں تو اِسم ظرف مکان کہلاتا ہے۔ جیسے مکتب۔ سکول۔ مسجد باغ۔ مدرسہ وغیرہ۔

(ب)۔ اگر وقت یا زمانہ کے معنی ظاہر ہوں تو اِسم ظرف زماں کہلاتا ہے۔ جیسے صبح شام۔ دِن رات۔ سال۔ مہینہ (ظرف زماں مفرد) اور سحر گاہ۔ آج کل (ظرف زماں مرکب)

اِسم ظرف مکان بنانے کا طریقہ:۔ اسم ظرف مکان بنانے کا کوئی خاص قاعدہ نہیں ہے۔ اِسم کے بعد یا پہلے مختلف علامات بڑھا کر اسم ظرف

مکان بنا لیتے ہیں۔

۱- اوّل یا آخر میں مندرجہ ذیل ہندی علامات لگا کر

ال	سسرال	خانہ	ڈاک خانہ چنڈو خانہ	نگر	پری نگر کرشن نگر
باڑہ	امام باڑہ	کوٹ	شاہ کوٹ سیالکوٹ	واڑی	پھلواڑی
پال	چوپال	ڈیرہ	ڈیرہ غازی خاں	گڑھ	علیگڑھ مظفر گڑھ
پور	علی پور	سالہ	دھرم سالہ	گھر	بجلی گھر گھنٹہ گھر
دوارہ	گوردوارہ	پنڈی	راولپنڈی	گھاٹ	مرگھٹ
شالہ	گئوشالہ	گنج	شہید گنج	منڈی	سبزی منڈی۔ اناج منڈی

۲- بعض اوقات مصدر سے اسم ظرف مکان بنا لیتے ہیں جیسے بیٹھنا سے بیٹھک پڑنا سے پڑاؤ

۳- کبھی خود مصدر ہی ظرف مکان کے معنی دیتا ہے۔ جیسے جھرنا (پانی رسنے کی جگہ)

۴- کبھی اِسم اور فعل مل کر ظرف مکان بنتا ہے۔ جیسے بدرو (بدر۔ رو)

۵- فارسی اِسم ظرف مکان بھی اُردو میں مستعمل ہیں۔ جو مندرجہ ذیل علامات بڑھانے سے بنائے جاتے ہیں:-

دان :- قلمدان۔ نمکدان۔ عطردان۔

خانہ :- عبادت خانہ۔ کتب خانہ۔ مہمان خانہ۔ دولت خانہ۔

کدہ :- نمکدہ۔ آتش کدہ۔ میکدہ۔ عشرت کدہ۔

ستان :- گلستان۔ ہندوستان۔ ریگستان۔

گاہ :- عیدگاہ۔ آرام گاہ۔ چراگاہ۔ خواب گاہ۔ قیام گاہ۔

زار :- گلزار۔ سبزہ زار۔ چمن زار۔ سمن زار۔

شن :- گلشن۔

سار :- کوہسار۔ شاخسار۔ چشمہ سار

بار :- رودبار۔ جوئبار۔

سرائے :- مہمان سرائی۔ کاروان سرائی۔ ماتم سرائے۔

آباد :- وزیر آباد - سمن آباد - حیدر آباد -
لاخ :- سنگلاخ - دیولاخ -

۶- عربی ظرفِ مکان بھی اُردو میں استعمال ہوتے ہیں -
مَکتَب - مَشکَوٰۃ - مَخزَن - مَقتَل - مَطبَخ - مَسجِد - مَنزِل - مَحفِل - مَقبَرہ -

۴ - اِسمِ آلہ | اِسمِ آلہ وہ اسم ہے جو کسی اوزار یا ہتھیار کے معنی دے - جیسے تلوار - چاقو - بندوق - پستول -

بنانے کے قاعدے

۱- مصدر سے اسم آلہ بنایا جاتا ہے - جیسے چھاننا سے چھلنی - پھانسنا سے پھانسی - بیلنا سے بیلن - جھاڑنا سے جھاڑو - پھُونکنا سے پھونکنی - جھولنا سے جھولا -
۲- اسموں سے کچھ تغیّر کرکے بنایا جاتا ہے - جیسے گھڑی سے گھڑیال - ناک سے نکیل - دانت سے داتن - ہاتھ سے ہتھوڑا -
۳- بعض اوقات دو اسموں کو ملا کر اسم آلہ بناتے ہیں - جیسے دست پناہ -
۴- بعض اسمائے جامد بھی بطورِ اِسم آلہ استعمال ہوتے ہیں - جیسے چاقو - چھری - قینچی - کانٹا - خنجر - تلوار - بندوق - توپ -
۵- عربی اسم آلہ بھی مستعمل ہیں - ان کے پہلے میم مکسور آتا ہے - جیسے مِسوَاک - مِضرَاب ، مِقرَاض ، مِسطَر - مقیاس الہوا ، مقیاس الحرارت -
۶- فارسی اِسمِ آلہ بھی اُردو میں مستعمل ہیں - جو مختلف علامات سے بنتے ہیں :-

گیر :- کف گیر - گل گیر -
آنہ :- انگشتانہ -
کش :- دُودکش - بادکش - خط کش -
تراش :- قلمتراش -

مال :۔ دستمال ۔ رُومال ۔
بند :۔ کمربند ۔
سوز :۔ فتیلہ سوز ۔

۵ ۔ اِسم صوت اِسم صوت وہ اِسم ہے جو کسی جاندار یا بے جان کی آواز کو ظاہر کرے ۔ جیسے کائیں کائیں ۔ چوں چوں ۔ چھم چھم ۔ کھٹ کھٹ ۔ ٹپ ٹپ ۔

۶ ۔ اِسم جمع اِسم جمع وہ اِسم ہے جو بہت سی چیزوں کے مجموعے کو ظاہر کرے ۔ جیسے فوج ۔ لشکر ۔ جماعت ۔ گلہ ۔ ڈھیر ۔ انبوہ ۔ ٹیم ۔ بنڈل ۔ ریوڑ ۔

۲ ۔ اِسم صفت

(رسال اوّل ۱۹۶۵ء)

اِسم صفت وہ اِسم ہے جو کسی دوسرے اِسم کی اچھائی یا بُرائی بیان کرے ۔ مثلاً سیاہ ۔ سفید ۔ نیک ۔ بد ۔ اچھا ۔ بُرا ۔ کھرا ۔ کھوٹا ۔ نڈر ۔ اُونچا ۔

جس کی صفت بیان کی جائے اُسے موصوف کہتے ہیں ۔ جیسے نیک لڑکا ۔ لال دوپٹہ ۔ بُرا آدمی میں لڑکا ۔ دوپٹہ ۔ آدمی موصوف ہیں ۔

اس کی پانچ قسمیں ہیں ۔

(۱) صفت ذاتی (۲) صفت نسبتی (۳) صفت عددی (۴) صفت مقداری (۵) صفت ضمیری ۔

۱ ۔ صفت ذاتی صفت ذاتی وہ صفت ہے جو موصوف کی ذاتی حالت یا فضیلت بیان کرے اور مستقل طور پر پائی جائے جیسے سخی مرد ۔ اس میں سخی صفت ذاتی ہے ۔ خواہ وہ اس وقت سخاوت کرے یا نہ کرے مگر سخاوت کا وصف اس کی ذات میں موجود رہے ۔ اِسی طرح عقلمند ۔ اچھا ۔ بہادر ۔ دلیر ۔

صفت ذاتی ہیں۔ اِسے صفت مشبہ بھی کہتے ہیں۔
ساخت کے لحاظ سے صفت ذاتی کی دو قسمیں ہیں:۔
(ا) **صفت مفرد:**۔ جو اپنی ساخت کے لحاظ سے صفت ہو۔ جیسے نیک بد۔ دلیر۔
(ب) **صفت مرکب یا ترکیبی:**۔ جو دو یا دو سے زیادہ اسموں کی ترکیب سے بنے۔ جیسے خوب صُورت۔ سعادت مند۔ بدخُو۔

صفت ترکیبی بنانے کے قاعدے

۱۔ دو اسموں کو ملا کر جیسے سنگ دل۔ کام چور۔ منہ زور۔
۲۔ اِسم اور امر کو ملا کر جیسے بُت شکن، دیانت دار، تیز رو، دُور اندیش، خیرخواہ۔
۳۔ دو اسم حرف جار سے مل کر جیسے خانہ بدوش، سربمہر،
۴۔ عربی یا فارسی الفاظ کے آخر میں فارسی علامت مند لگا کر جیسے عقلمند، سعادت مند۔
۵۔ اِسم کے پہلے خوش، نیک یا بد لگا کر جیسے خوش گل۔ بدشکل۔ نیک خو۔
۶۔ دو مختلف الفاظ ملا کر ہنس مکھ، مُنہ پھٹ، سدابہار، من چلا۔
۷۔ کبھی مصدر سے صفت بنا لیتے ہیں۔ جیسے ہنسنا سے ہنسوڑ، کھیلنا سے کھلاڑی۔ جھگڑا سے جھگڑالو۔
۸۔ کبھی اِسم کے آخر میں الف بڑھا کر جیسے پیاس سے پیاسا، میل سے میلا۔
۹۔ مندرجہ ذیل علامات الفاظ کے شروع میں لگانے سے صفت ذاتی بناتے ہیں:۔
الف ۔ اٹل ۔ امٹ ن ۔ نڈر ۔ نکھٹو ۔ نکما

ان - ان پڑھ - انمول | بے - بے حیا بے بس - بے وقوف بے خوف
پُر - پُر رعب | نو - نو آموز - نو گرفتار
لا - لا علاج - لا زوال | صاحب - صاحب ذوق - صاحب فہم -
نا - نالائق - نا اہل | میر - میر کارواں
غیر - غیر ممکن | بن - بن دیکھی
کم - کم گو، کم ظرف، کم عقل | خلاف - خلاف قانون
اہل - اہل قلم، اہل سیف | ہم - ہمنشیں، ہم عمر، ہم خیال
نیم - نیم جان - نیم حکیم | بد - بدماغ - بدشکل - بدصورت
نر - نر دل - نردوش | ہمہ - ہمہ داں -

۱۰ - فارسی صفات بھی مستعمل ہیں :-
دانا - بینا - توانا - ہوشیار :-

۱۱ - عربی صفات بھی استعمال کی جاتی ہیں -
شریف - حسین - جمیل - کریم - شجاع - خلیق - علیم -

صفت ذاتی کے درجے

صفت ذاتی کے تین درجے ہوتے ہیں :-

۱ - **تفصیل نفسی** :- جس میں کسی شخص یا چیز کی ذاتی صفت حالت یا کیفیت بلا مقابلہ ظاہر کی جائے ۔ جیسے اچھا - بُرا - وُہ لڑکا اچھا ہے - وُہ آدمی بُرا ہے ۔

۲ - **تفضیل بعض** :- جس میں ایک چیز کو دوسری چیز پر ترجیح دی جائے ۔ جیسے یہ آم اس آم سے میٹھا ہے ۔ اسلم طالب سے ذہین ہے (اسلم کو طالب پر ترجیح دی گئی ہے) تفصیل نفسی سے پہلے بہت زیادہ - بڑا لگانے سے تفضیل بعض بناتے ہیں ۔ فارسی میں تفصیل نفسی کے بعد تر لگایا جاتا ہے - بُزرگ تر، بہتر -

۳ - **تفضیل کل** :- جس میں ایک چیز کو اسی قسم کی باقی تمام چیزوں پر ترجیح دی

جائے۔ جیسے یہ لڑکا اپنی جماعت میں سب سے اچھا ہے۔ اسلم سب لڑکوں سے ہوشیار ہے۔ وہ بہت ہی ذہین ہے۔ وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔ وہ پرلے درجہ کا بیوقوف ہے۔ وہ ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کا کاغذ ہے۔ وہ اچھے سے اچھا لڑکا ہے۔

فارسی میں تفضیل کل کے لیے ترین لگاتے ہیں۔ جیسے کمترین۔ بہترین۔ نیک ترین۔

عربی میں اِسم تفضیل اَفعَلُ اور فُعلیٰ کے وزن پر آتے ہیں۔ اشرف۔ اعظم۔ افضل۔ ادنیٰ۔ اعلیٰ۔

نوٹ:۔ صفت ذاتی کے بعد اگر موصوف مذکور نہ ہو تو وہ صفت خود ہی موصوف کا کام دیتی ہے۔ جیسے نیکوں کی صحبت اختیار کرو۔ بروں سے بچو!۔

چند صفات ذاتی

منصف۔ تاجور۔ بلوریں۔ دانش مند۔ شرمسار۔ بے شرم۔ معزز۔ نامور۔ ہُنرمند۔ اندوہناک۔ بھوکا۔ دردمند۔ شریر۔ روزانہ۔ روزینہ۔ بے نیاز۔ بے مروّت۔ گلفام۔ ہوشمند۔ ناکام۔ تنومند۔ بے حیا۔ خشمناک۔ غمگین۔ بدنام۔ دلاور۔ نیازمند۔

۲۔ صفت نسبتی

صفت نسبتی وہ اِسم صفت ہے جس میں کسی دوسری چیز سے لگاؤ یا نسبت پائی جائے۔ جیسے پاکستانی سپاہی۔ عربی گھوڑا۔ ایرانی قالین میں پاکستانی، عربی اور ایرانی صفات نسبتی ہیں۔

بنانے کے قاعدے

۱۔ اسم کے آخر میں یائے معروف لگانے سے:۔

پاکستان سے پاکستانی۔ لاہور سے لاہوری۔ پنجاب سے پنجابی۔

۲۔ اگر کسی اسم کے آخر میں 'ہ' ہو تو اسے یائے معروف سے بدل دیتے ہیں
مکّہ سے مکّی۔ کوفہ سے کوفی۔ امریکہ سے امریکی۔
۳۔ اگر کسی اسم کے آخر میں ا، ی یا ہ ہو اُسے 'وی' سے بدل دیتے ہیں
جیسے دہلی سے دہلوی، موسیٰ سے موسوی، انبالہ سے انبالوی۔
بعض اوقات الف کو حذف کر دیتے ہیں۔ جیسے بخارا سے بخاری۔
۴۔ اگر کسی اسم کے آخر الف ہو تو اُسے 'ئی' سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے
طلا سے طلائی۔ عیسیٰ سے عیسائی۔ دریا سے دریائی۔
۵۔ بعض دفعہ اِسم کے بعد 'انہ' زیادہ کر دیتے ہیں۔ جیسے غلام سے غلامانہ۔
فقیر سے فقیرانہ۔
۶۔ بعض اسموں کے آخر میں 'انی' لگاتے ہیں۔ جیسے جسم سے جسمانی، رُوح
سے رُوحانی۔ نور سے نُورانی۔
۷۔ اگر اسم کے آخر میں 'ہ' ہو۔ تو اسے گرا کر "ئی" بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے
سُرمہ سے سُرمئی۔ نقرہ سے نقرئی۔
۸۔ بعض اسما کے آخر میں 'ین' بڑھاتے ہیں۔
سیم سے سیمتن، زر سے زرّین۔
۹۔ اگر اسم کے آخر میں 'ہ' ہو تو ی اور ہ دونوں کو و سے بدل کر
ی نسبتی زیادہ کر دیتے ہیں۔ جیسے ہسپانیہ سے ہسپانوی۔
۱۰۔ ذیل کی علامتیں اسم کے آخر میں لگانے سے صفت نسبتی بن جاتی ہے۔
سا (چاندسا) یلی (پتھریلی۔ نوکیلی) لا (سانولا۔ مٹیالا) یا (دکھیا)
یلا (رنگیلا، چمکیلا) والا (لاہور والا) کا (غضب کا)
۱۱۔ بعض الفاظ سے صفت نسبتی خلاف قاعدہ بناتے ہیں۔ جیسے رے سے
رازی، یمن سے یمانی۔ ایک سے اکیلا۔

چند صفاتِ نسبتی | انسانی۔ آہنی۔ بلوچی۔ بنگالی۔ سندھی۔ ثانوی۔

حقّانی - دنیوی - ربّانی - سالانہ - صفراوی - رنگین - فدائی - گنوار - نمکین - زرینہ - نصرانی - ماہانہ - معنوی - سماوی - باتونی - زنانہ - بشر میلا -

نوٹ :- اگر صفت نسبتی کے بعد موصوف نہ ہو تو وہ لفظ خود اسم کا کام دے گا - جیسے پاکستانی بڑے بہادر ہیں -

۳ - صفت عددی

صفت عددی وہ صفت ہے جو کسی اسم کی تعداد ظاہر کرے - جیسے چار کرسیاں - پنجتن - بارہ امام - دُوسرا دِن -

جس اِسم کی تعداد ظاہر کی جائے اُسے 'معدود' کہتے ہیں -

صفت عددی کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) معیّن (۲) غیر معیّن -

۱ - عدد غیر معیّن :- وہ عدد ہے جس سے کسی چیز کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہ ہو - جیسے بعض ، کل ، تمام ، سب ، چند ، کئی ، تھوڑا ، زیادہ ، بہت کچھ - اگر عدد معیّن کے بعد لفظ ایک زیادہ کریں تو عدد غیر معین بن جاتا ہے - جیسے پندرہ ایک کتابیں فروخت ہوئیں یعنی تقریباً پندرہ -

عدد معیّن کی قسمیں :- ۱ - عدد ذاتی :- صرف تعداد ظاہر کرتے ہیں - جیسے دو - چار - پچاس - سو - پانچ ہزار -

۲ - عدد ترتیبی :- تعداد کے علاوہ ترتیب بھی ظاہر کرتے ہیں - جیسے - پہلا - دُوسرا - تیسرا - پانچواں - گیارھویں - ساتویں - یکم - دوم - چہارم - فرسٹ - سکینڈ - تھرڈ -

۳ - عدد ضعفی :- جس سے یہ معلوم ہو کہ چیز کتنے گنا ہے - جیسے دگنا - تگنا - چوگنا - دوچند - دوہرا - اکہرا -

۴ - عدد کسری :- جو کسی چیز کا کوئی حصّہ ظاہر کرے جیسے نصف - آدھا -

پون - سوا - ڈیوڑھا - چوتھائی - پانچ بٹہ سات - چوتھا حصّہ - پانچواں حصّہ -
۵ - عدد استغراقی :- جو اپنے معدود کی پوری تعداد ظاہر کرے - جیسے دونوں
چاروں ، آٹھوں ، چھٹوں ، نوڈوں -

نوٹ :- مو یا سات آتا ہے تو پانچ کی اپ حذف ہو جاتی ہے جیسے پان سات ، پانسو -

۴ - صفت مقداری

صفت مقداری وہ صفت ہے جس سے کسی چیز کی مقدار یا جسامت معلوم ہو - جیسے کچھ بہت - تھوڑا - اتنا - اس قدر - بے شمار - جتنا - کتنا - زیادہ ، کم -

یہی الفاظ عدد غیر معین کے لیے بھی آتے ہیں - جب یہ الفاظ ناپ تول کے معنی دیں تو صفت مقداری ہو جاتی ہے - جب تعداد ظاہر کریں تو عدد غیر معین - مثلاً وہاں بہت سی کتابیں پڑی تھیں - یہں عدد غیر معین ہے -

دکان میں بہت سے چاول پڑے تھے - یہں بہت صفت مقداری ہے

۵ - صفت ضمیری

صفت ضمیری وہ صفت ہے جو دراصل ضمیر ہو - لیکن صفت کے معنی بھی دے - جیسے چند ، دونوں ، کون ، ہر ، سب ، کئی ، ایسا ، کل ، بعض ، کیسا -

ع وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

اِس میں کونسا صفت ہے اور عقدہ موصوف ، کیا صفت ہے - اور کام موصوف محذوف ہے -

۳ - اِسم مصدر

مصدر کے لغوی معنی نکلنا کے ہیں - چونکہ اس سے اور کلمات نکلتے ہیں - اس لیے ایسے کلمہ کو مصدر کہتے ہیں - اس میں کسی کام کا کرنا ہونا یا سہنا

پایا جاتا ہے۔ اور وقت کا تعیّن نہیں ہوتا۔ جیسے پڑھنا، لکھنا۔ ہونا، آنا، جانا، سونا۔

علامت :۔ ۱۔ اُردو مصدر کے آخر میں ہمیشہ 'نا' ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اِس سے کسی کام کا نام ظاہر نہ ہو۔ جیسے گنّا۔ سونا (دھات) پرانا، نانا، ٹھکانا وغیرہ مصدر نہیں ہیں۔

۲۔ اگر علامت مصدر 'نا' دُور کر دیں تو امر کا صیغہ باقی رہ جاتا ہے۔ جیسے پڑھنا سے پڑھ، لکھنا سے لِکھ۔

بناوٹ کے لحاظ سے مصدر کی قسمیں

بناوٹ کے لحاظ سے مصدر کی دو قسمیں ہیں :۔

۱۔ اصلی یا وضعی اصلی یا وضعی مصدر وہ مصدر ہوتا ہے جو خاص مصدری معنوں کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ جیسے کھانا۔ پینا۔ ہونا۔ آنا وغیرہ۔

۲۔ جعلی یا غیر وضعی جعلی یا غیر وضعی مصدر وہ مصدر ہے جو بعض اِسموں پر یا دوسری زبانوں کے الفاظ پر اُردو مصدر لگا کر بنایا جائے۔ جیسے خوش ہونا، بھیک مانگنا۔ تشریف لانا۔ خدمت کرنا۔

بعض اوقات فارسی مصادر سے اُردو مصادر بنا لیتے ہیں۔

خریدن سے خریدنا۔ آزمودن سے آزمانا۔ بخشیدن سے بخشنا۔

کبھی کسی لفظ میں تھوڑا سا تغیّر یا کوئی حرف زیادہ کر دیتے ہیں :۔

شرم سے شرمانا، دفن سے دفنانا، گرم سے گرمانا۔ پتھر سے پتھرانا۔

کبھی دو مصدروں کو ملا دیتے ہیں۔ جیسے آنا جانا، کھانا پینا، رونا دھونا۔

مصدر کی قسمیں بلحاظ کمی بیشی الفاظ

۱۔ مصدر مجرّد مصدر مجرّد وہ مصدر ہے کہ اگر اس میں کوئی حرف کم کر دیا جائے تو مصدری صورت قائم نہ رہے جیسے آنا۔ جانا۔ لینا۔ پڑھنا۔

۲۔ مصدر مرکب یا مزید فیہ مصدر مرکب وہ مصدر ہے جو مصدر مجرّد پر کچھ حروف کا اضافہ کر کے بنایا جائے۔ جیسے ہو جانا، پینے لگنا، پڑھنے لگنا، لکھ چکنا۔ اُٹھ بیٹھنا، بیٹھا چاہنا۔ سینا پرونا، آنا جانا، پڑھتے رہنا، جانے دینا وغیرہ۔

مصدر کی قسمیں بلحاظ معانی

۱۔ مصدر لازم مصدر لازم وہ مصدر ہے جس سے بنا ہوا فعل صرف فاعل کو چاہے۔ جیسے چلنا، دوڑنا۔ سونا، جاگنا وغیرہ۔ اسلم دوڑا، وہ سوتا ہے۔ چلتے ہو تو چمن کو چلئے۔

۲۔ مصدر متعدّی مصدر متعدّی وہ مصدر ہے جس سے بنا ہوا فعل فاعل اور مفعول دونوں کو چاہے۔ جیسے لکھنا۔ پڑھنا۔ دینا۔ مارنا وغیرہ۔

میں نے خط لکھا (میں فاعل۔ خط مفعول۔ لکھا فعل) اس نے کتاب پڑھی۔ زید نے بکر کو مارا۔

پہچان:۔ اگر فعل ماضی مطلق صیغہ واحد غائب کے ساتھ لفظ وہ استعمال ہو سکے۔ تو وہ مصدر لازم ہو گا۔ جیسے دوڑنا سے وہ دوڑا اور اگر اس نے استعمال ہو سکے تو مصدر متعدی ہو گا۔ جیسے پینا سے اس نے پیا۔

بعض متعدّی مصادر ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ 'نے' نہیں آتی

جیسے لانا سے وہ لایا، بولنا سے وہ بولا۔ لے جانا سے وہ لے گیا۔

بعض مصدر لازم بھی ہوتے ہیں۔ اور متعدی بھی، جیسے شرمانا، سیکھنا، پکارنا، پڑھنا وغیرہ۔

میں نے اس کو بہت شرمایا۔ (متعدی)

میں اس سے شرما گیا۔ (لازم)

بعض لازم مصادر کے ساتھ مفعول بھی آتا ہے:۔

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

اس میں نہیں آتا۔ فعل لازم۔ رونا فاعل اور ہمیں مفعول ہے۔

متعدّی مصادر کی قسمیں

بناوٹ کے لحاظ سے متعدّی مصادر کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ متعدّی بنفسہٖ:۔ وہ مصدر ہے جو ابتدا ہی سے متعدّی معنوں کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ جیسے کھانا۔ پینا۔ لکھنا وغیرہ۔

۲۔ متعدّی بالواسطہ:۔ وہ مصدر ہے جو لازم سے متعدّی بنا لیا گیا ہو۔ جیسے جلنا سے جلانا، رونا سے رُلانا۔ بیٹھنا سے بٹھانا۔

۳۔ متعدّی المتعدّی:۔ وہ مصدر ہے جو متعدی سے متعدّی بنایا گیا ہو۔ جیسے سیکھنا سے سکھانا، کھانا سے کھلانا۔ پڑھنا سے پڑھانا۔

نوٹ:۔ جب متعدّی فعل صرف ایک مفعول کو چاہے تو اسے متعدّی بیک مفعول کہتے ہیں۔ اسلم نے روٹی کھائی (مفعول روٹی) جب دو مفعول چاہے تو اسے متعدّی بدو مفعول کہتے ہیں۔ جیسے:۔

اسلم نے محتاجوں کو روٹی کھلائی (محتاجوں روٹی مفعول)

جب تین مفعول کو چاہے تو اسے متعدّی بہ سہ مفعول کہتے ہیں۔ جیسے

اسلم نے فقیر کو انور سے روٹی دلوائی۔ (فقیر۔ انور۔ روٹی مفعول)

مصدر لازم سے متعدی بنانے کے طریقے

۱۔ علامت مصدر سے پہلے الف بڑھانے سے۔ جیسے :۔
پڑھنا سے پڑھانا۔ ڈرنا سے ڈرانا۔

۲۔ مصدر کے پہلے حرف کے بعد الف بڑھانے سے۔ جیسے مرنا سے مارنا۔

۳۔ اگر پنج حرفی مصدر میں دوسرا حرف علّت ہو تو وہ گر جاتا ہے۔ جیسے بیٹھنا سے بٹھانا۔

۴۔ اگر چار حرفی مصدر میں دُوسرا حرف علت ہو۔ تو وہ 'لا' سے بدل جاتا ہے۔ جیسے سونا سے سہلانا، رونا سے رُلانا۔

۵۔ دوسرے حرف کے بعد الف بڑھانے سے جیسے اُچھلنا سے اُچھالنا۔

۶۔ مصدر کے پہلے حرف کے بعد اس کی حرکت کے مطابق حروف علّت 'وای' زیادہ کر دیتے ہیں۔ جیسے رُکنا سے روکنا، پِسنا سے پیسنا۔ تُلنا سے تولنا۔

۷۔ بعض اوقات مصدر سے 'لے' یا 'دے' لگاتے ہیں جیسے لے آنا۔ دے مارنا۔

۸۔ بعض مصدر دو طرح سے متعدّی بنائے جاتے ہیں۔ جیسے :۔
دبنا سے دابنا اور دبانا۔

۹۔ تیسرے حرف کے بعد الف بڑھانے سے جیسے سنورنا سے سنوارنا۔

۱۰۔ بعض مصادر خلاف قاعدہ بنتے ہیں۔ جیسے دھونا سے دُھلنا۔ رہنا سے رکھنا۔ پڑنا سے ڈالنا۔

نوٹ :۔ ہر مصدر لازم سے متعدّی اور ہر متعدّی المتعدّی نہیں بنا سکتے۔ ایسے لازم مصدروں کو لازم محدود اور متعدّی مصدروں کو متعدّی محدود

کہتے ہیں۔

چند متعدّی المتعدی مصادر

لکھنا سے لکھوانا، پڑھنا سے پڑھوانا، کھانا سے کھلوانا، دینا سے دلوانا، پینا سے پلوانا، کرنا سے کرانا، سیکھنا سے سکھانا، تولنا سے تلوانا، نکالنا سے نکلوانا، بیچنا اور بکنا سے بکوانا، کھولنا سے کھلوانا، بھیجنا سے بھجوانا، بلانا سے بلوانا، کرنا سے کرانا،

بعض اوقات لازم مصادر سے بھی متعدی المتعدی بناتے ہیں۔ جیسے رُکنا سے رُکوانا، رونا سے رُلوانا۔

مصدر معروف :۔ وہ مصدر ہے جس کا فاعل معلوم ہو۔ جیسے جاوید نے خط لکھا۔ (اس میں فاعل (جاوید) معلوم ہے)

مصدر مجہول :۔ وہ مصدر ہے جس کا فاعل معلوم نہ ہو۔ جیسے خط لکھا گیا۔ (اس میں فاعل معلوم نہیں)

نوٹ :۔ مصدر معروف کے ماضی مطلق صیغہ واحد غائب کے بعد مصدر جانا بڑھانے سے مصدر مجہول بن جاتا ہے۔ جیسے دیکھنا سے دیکھا جانا۔ لِکھنا سے لِکھا جانا وغیرہ :۔

۴۔ اِسم حالیہ

اِسم حالیہ وہ اِسم مشتق ہے جس کے فاعل یا مفعول کی حالت ظاہر ہو۔ جیسے کھیلتا ہُوا۔ ہنستا ہُوا۔ روتے ہُوئے۔

اِسم حالیہ بنانے کے قاعدے

۱۔ مصدر کی علامت "نا" دُور کر کے تا ہوا، تی ہوئی، لگاتے ہیں۔ جیسے دَوڑ

کھیلتا ہوا آیا، وہ روتی ہوئی آئی - چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا - سنبھلتا ہُوا - اور چھلکتا ہوا -

۲- ماضی مطلق کے آخر میں 'ہوا' بڑھانے سے :- بیٹھا ہوا - لیٹا ہوا -

ع تانے ہوئے نیزوں کو سواران جفا کار
جوڑے ہوئے تیروں کو کمانوں میں کماندار
ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
وہ آئے موت کو میری دلہن بنائے ہوئے
نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

۳- کبھی ہوا محذوف کر دیتے ہیں - جیسے وہ روتی آئی -

۴- حالیہ کی تکرار سے جیسے چلتے چلتے، ٹہلتے ٹہلتے -

ع سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

۵- فارسی میں فعل امر کے بعد 'اں' لگانے سے اِسم حالیہ بن جاتا ہے - جیسے گریاں - خنداں - رواں دواں - افتاں خیزاں - فریاد کناں - شاداں - خراماں خراماں -

اِسم حالیہ اور اسم مفعول دونوں ماضی مطلق کے بعد 'ہوا' لگانے سے بنتے ہیں - اس لیے یاد رکھنا چاہیئے کہ جب یہ الفاظ اسم کی جگہ استعمال ہوں تو اِسم مفعول ہوں گے - اور اِسم کے ساتھ آئیں تو اِسم حالیہ کہلائیں گے - لیٹا ہوا اِسم مفعول ہے لیکن بچہ لیٹا ہوا پایا گیا میں لیٹا ہوا اِسم حالیہ ہے -

۵- اسم استفہام اِسم استفہام وہ اِسم نکرہ ہے جو پوچھنے کے موقع پر استعمال کیا جائے - جیسے کون - کب کدھر وغیرہ -

اسلم باغ میں کیوں گیا تھا ؟
اس نے کیا خریدا ؟
یہ کتاب کہاں سے چھپی ؟

۶- اِسم معاوضہ

اِسم معاوضہ وہ اِسم نکرہ مشتق ہے جو کسی خدمت کے بدلے کے معنی میں استعمال ہو۔ جیسے رنگائی۔ دُھلائی۔ چھپائی وغیرہ۔
اس کوٹ کی کیا سلائی ہے ؟
دھلائی پر کتنی رقم خرچ ہوئی ؟

۷- اِسم حاصل مصدر یا اِسم کیفیّت

وہ اِسم جو کسی چیز کی حالت۔ کیفیت یا نتیجہ ظاہر کرے۔ اِسم کیفیّت کہلاتا ہے۔ جب اِسم کیفیت کسی مصدر سے بنے تو اسے حاصل مصدر کہتے ہیں۔ جیسے آدمی سے آدمیّت اسم کیفیّت ہے اور پینا سے پیاس حاصل مصدر ہے ،

حاصل مصدر بنانے کے قاعدے

حاصل مصدر بنانے کا کوئی خاص قاعدہ نہیں ہے اور نہ ہی ہر مصدر سے حاصل مصدر بنایا جا سکتا ہے۔

۱- مصدر کی علامت 'نا' دُور کرنے سے حاصل مصدر بن جاتا ہے۔ جیسے مارنا سے مار۔ کھیلنا سے کھیل۔ بولنا سے بول۔ ناچنا سے ناچ۔
۲- کبھی مصدر کی علامت دُور کرکے الف یا ی بڑھاتے ہیں۔ جیسے جھگڑنا سے جھگڑا۔ ہنسنا سے ہنسی۔

۳۔ مصدر کے آخر کی الف دُور کرنے سے جیسے جلنا سے جلن، تھکنا سے تھکن۔
۴۔ فعل امر کے دوسرے حرف کے بعد الف یا ی بڑھانے سے جیسے چل سے چال۔
۵۔ دو امر مل کر جیسے لُوٹ مار۔ روک ٹوک۔ جان پہچان۔ لین دین۔ روک تھام۔ دوڑ دُھوپ۔
۶۔ کبھی صفت کے بعد ن، ی یا ئی لگانے سے بھی حاصل مصدر بن جاتا ہے۔ جیسے اونچا سے اونچان۔ اونچائی، بُرائی، چوری، ٹھگی، گرمی، سردی، نرمی، جوانی، روشنی۔
۷۔ مصدر کی علامت 'نا' دُور کر کے مندرجہ ذیل علامات زیادہ کرتے ہیں:۔

اپ ۔ ملنا سے ملاپ
ئی ۔ سلانا سے سلائی۔
ائی ۔ لکھنا سے لکھائی۔ پڑھنا سے پڑھائی۔
ت ۔ بچنا سے بچت۔ کھپنا سے کھپت۔
اؤ ۔ بچنا سے بچاؤ۔ بہنا سے بہاؤ۔ چھڑکنا سے چھڑکاؤ۔
اوٹ ۔ ملنا سے ملاوٹ۔ گرنا سے گراوٹ۔ تھکنا سے تھکاوٹ۔
ری ۔ بکنا سے بکری
ک ۔ بیٹھنا سے بیٹھک۔
تی ۔ بھرنا سے بھرتی۔ گننا سے گنتی۔
نت ۔ لڑنا سے لڑنت۔ گھڑنا سے گھڑنت
ہٹ ۔ گھبرانا سے گھبراہٹ
واس ۔ بکنا سے بکواس۔
اس ۔ نکلنا سے نکاس۔ پینا سے پیاس۔

۸۔ اسم صفت کے علامات لگانے سے:۔

ات ۔ بہت سے بہتات ۔
اس ۔ میٹھا سے مٹھاس ۔
پا ۔ موٹا سے موٹاپا ۔
پن ۔ پاگل سے پاگل پن ۔ دیوانہ سے دیوانہ پن ۔
یت ۔ انسان سے انسانیت ۔
ک ۔ ٹھنڈا سے ٹھنڈک ۔
نی ۔ چاند سے چاندنی ۔
ہٹ ۔ کڑوا سے کڑواہٹ ۔

۹ ۔ کبھی خلاف قاعدہ حاصل مصدر بنتا ہے ۔ جیسے سونا سے نیند ۔

۱۰ ۔ فارسی حاصل مصدر بھی اُردو میں استعمال ہوتے ہیں ۔ جیسے افتادگی ۔ آرائش ، آزمائش ، آفرینش ، آموزش ، آلائش ، افسردگی افشاں ، آمدورفت ، افزائش ، انجام ، آمرزش ، بالیدگی ، دستبرد ، برداشت ، بارش ، بازی ، بودوباش ، بندوبست ، پرستش ، پرداز ، پرورش ، پرسش ، پرواز ، پیمائش ، پوشاک ، توانائی ۔ تاب ، جستجو ، جنبش ، خراش ، خارش ، خواہش ، خموشی ، بینائی ، رفتار ، رسائی ، رہائی ، ساخت ، ستائش ، شورش ، شناخت طلب ، غنودگی ، فرمائش ، فروخت ، کوشش ، گزارش ، گریز ، گفتار ، گنجائش ، گفتگو ، لغزش ، نشست ، نگارش ، نوازش ، ورزش ،

۱۱ ۔ عربی مصادر جن کے آخر میں 'ت' ہو ۔ اُردو میں حاصل مصدر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ۔ جیسے حکمت ، شرافت ، قدرت ، بصارت ، دولت ، عبادت ، طاقت ، صداقت ، عظمت ، بشارت خدمت ،

۸- اِسم فاعل

اِسم فاعل وہ اِسم نکرہ ہے جو اُس چیز یا شخص کو ظاہر کرے جس سے کوئی فعل صادر ہوا ہو- جیسے دوڑنے والا- لکھنے والا- گانے والی-

اس کی دو قسمیں ہیں (۱) اِسم فاعل سماعی جو کسی خاص قاعدے کے مطابق ہو- جیسے پڑھنا سے پڑھنے والا-

۲- اِسم فاعل قیاسی جو کسی خاص قاعدے کے مطابق نہ ہو- جیسے کھلاڑی، گڈریا، کوچوان مفصّل بیان آگے آئیگا-

۹- اِسم مفعول

اِسم مفعول وہ اسم مشتق ہے جو اس ذات پر دلالت کرے جس پر فعل واقع ہو- مثلاً کھایا ہُوا- پڑھا ہُوا- لکھا ہُوا-

اِس کی دو قسمیں ہیں- (۱) اِسم مفعول سماعی (۲) اِسم مفعول قیاسی-

اسم مفعول سماعی: - وہ اسم مفعول ہے- جو کسی مقررہ قاعدے کے مطابق نہ بنا ہو- جیسے بیا بتا- چاہیتا-

اسم مفعول قیاسی: وہ اِسم مفعول ہے- جو کسی مقررہ قاعدے کے مطابق بنایا گیا ہو- جیسے کھانا سے کھایا ہو- پڑھنا سے پڑھا ہُوا-

طائرانہ نظر

اِسم نکرہ کی قسمیں یہ ہیں:-

(۱) اِسم ذات (۲) اِسم صفت (۳) اِسم مصدر (۴) اِسم حالیہ- (۵) اِسم استفہام (۶) اِسم معاوضہ (۷) اِسم حاصل مصدر (۸) اِسم فاعل- (۹) اِسم مفعول -

اِسم ذات کی چھ قسمیں ہیں ۔

(۱) اِسم مکبرّ جیسے پگڑی سے پگڑ (۲) اِسم تصغیر جیسے باغ سے باغیچہ ۔

(۳) اِسم ظرف مکان (جیسے مسجد) اور اِسم ظرف زماں جیسے صبح شام ۔

(۴) اِسم آلہ جیسے چاقو (۵) اِسم صوت جیسے کائیں کائیں (۶) اِسم جمع جیسے فوج ۔ لشکر ۔

صفت ذاتی کے درجے تین ہیں ۔

(۱) تفضیل ذاتی جیسے بزرگ ۔

(۲) تفضیل بعض جیسے بزرگ تر ۔

(۳) تفضیل کل جیسے بزرگ ترین ۔

صفت عددی کی دو قسمیں ہیں ۔

۱ ۔ معیّن یعنی جب ٹھیک تعداد معلوم ہو ۔ جیسے تین کتابیں ۔

۲ ۔ غیر معیّن یعنی جب ٹھیک تعداد معلوم نہ ہو ۔ جیسے تمام ۔ کل ۔ بہت وغیرہ ۔

معانی کے لحاظ سے مصدر کی دو قسمیں ہیں ۔

۱ ۔ مصدر متعدّی یعنی جس سے بنا ہوا فعل صرف فاعل کو چاہے ۔ جیسے دَوڑنا ۔

۲ ۔ مصدر متعدّی یعنی جس سے بنا ہوا فعل فاعل اور مفعول دونوں کو چاہے ۔ جیسے لِکھنا ۔ پڑھنا ۔

مصدر معروف وہ مصدر ہے جس کا فاعل معلوم ہو ۔ مصدر مجہول وہ مصدر ہے جس کا فاعل معلوم نہ ہو ۔ اسم حالیہ وہ اِسم مشتق ہے جس سے فاعل یا مفعول کی حالت ظاہر ہو ۔ جیسے کھیلتا ہوا ۔

اسم فاعل مشتق ہوتا ہے لیکن فاعل مشتق نہیں ہوتا ۔ دوڑنے والا نویسندہ ۔ عابد اسم فاعل ہیں ۔ اِسم فاعل کی دو قسمیں ہیں :۔

۱ ۔ سماعی جو کسی خاص قاعدے کے مطابق نہ بنے ہوں ۔ جیسے ڈاکو ۔ چور ۔

۲ - اِسم فاعل قیاسی وہ اِسم فاعل ہے - جو کسی خاص قاعدے کے مطابق بنایا جائے - اِسم فاعل قیاسی کو اِسم فاعل ترکیبی بھی کہتے ہیں -

سوالات

۱ - اِسم نکرہ کی کون کون سی قسمیں ہیں - مثالوں سے واضح کیجئے -

۲ - اِسم تصغیر کسے کہتے ہیں - ذیل کے اِسم تصغیر بنائیے :-
باغ - جھاڑ - رستہ - پلنگ - بیٹی - سانپ - کھاٹ - مرد - بھائی -

۳ - اِسم ظرف مکان بنانے کے قاعدے تحریر کیجئے - نیز ذیل کی علامات لگا کر ظرف مکان بنائیے - زار ، ناک ، گاہ ، سار - لاخ -

۴ - اِسم آلہ کسے کہتے ہیں - گھڑی - جھاڑنا - جھولنا - دھونکنا سے اسم آلہ بنائیے -

۵ - اسم صفت کی تعریف کیجئے اور اس کی قسمیں بتائیے -

۶ - صفت ذاتی کیونکر بنائی جاتی ہے - اس کے کتنے درجے ہوتے ہیں - مثالیں دیجئے -

۷ - صفت نسبتی بنانے کے قاعدے لکھئے اور ذیل سے صفت نسبتی بنائیے :- دین - دنیا - مدینہ - طلا - نور - نقرہ - زر - رے -

۸ - عدد معیّن اور عدد غیر معیّن میں کیا فرق ہے مثالیں دیجئے -

۹ - مصدر لازم اور مصدر متعدّی کی پہچان کس طرح کریں گے - ذیل میں سے لازم اور متعدّی الگ الگ کیجئے - دوڑنا - لکھنا - پڑھنا - سونا - مارنا - جاگنا - کھانا -

۱۰ - چند ایسے مصادر بتائیے جو لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں :-

۱۱ - مشبہ اسم فاعل سماعی اور اِسم فاعل قیاسی میں کیا فرق ہے -

۱۲۔ مندرجہ ذیل لاحقوں سے دو دو اسم فاعل ترکیبی بنائیے۔ گار۔ مند۔

۱۳۔ حاصل مصدر کی تعریف کیجیے اور بنانے کے قاعدے معہ امثلہ لکھیے۔

۱۴۔ مندرجہ ذیل سے حاصل مصدر بنائیے۔ بکنا، ہنسنا، ملنا، مُسکرانا۔ چلنا، بیٹا، بچنا، نکلنا، موٹا، ٹھنڈا، چاند، اُونچا، شوخ، آدمی۔ تھکنا۔

۱۵۔ قواعد اُردو کی رُو سے مندرجہ اسماء کی اقسام بتاؤ:۔ لشکر، چاقو، صبح، مسجد، شہسوار۔ شام، کائیں کائیں، پھلواڑی، ملتانی، جان پہچان، چلتے چلتے، پگڑ، انگھڑی، ریوڑ۔

باب ۵

واحد جمع

گنتی کے لحاظ سے اِسم کی دو قسمیں ہیں۔ واحد اور جمع ۔

واحد واحد وہ اِسم ہے جو ایک چیز کے لیے بولا جائے۔ جیسے کتاب لڑکا۔ گھوڑا وغیرہ۔

جمع جمع وہ اِسم ہے۔ جو ایک سے زیادہ چیزوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ جیسے کتابیں۔ لڑکے، گھوڑے وغیرہ۔

تثنیہ عربی میں دو کے لیے علیحدہ لفظ آتا ہے۔ جسے تثنیہ کہتے ہیں۔ اُردو میں تثنیہ نہیں ہوتا۔ البتہ اس قسم کے بعض عربی الفاظ اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے والد سے والدین۔ قطب سے قطبین۔ مشرق سے مشرقین فریق سے فریقین۔ حرم سے حرمین۔ طرف سے طرفین۔

جمع بنانے کے قاعدے

۱۔ مذکر واحد اسماء کے آخری حروف 'ا' یا 'ہ' کو یائے مجہول۔ (ے) سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے گھوڑا سے گھوڑے۔ کمرہ سے کمرے وغیرہ۔ لیکن اگر اگر ان کے بعد حروف عاملہ واقع ہوں تو گھوڑوں۔ کمروں استعمال ہوگا۔

۲۔ اگر واحد اسم کے بعد میں نون غنہ اور اس سے پہلے الف ہو تو جمع میں یائے مجہول سے بدل جائے گا۔ جیسے کنواں سے کوئیں۔ دھواں سے دھوئیں۔

۳۔ اگر واحد اِسم کے بعد الف ہو تو (ؤں) بڑھا دیتے ہیں جیسے دریا سے دریاؤں۔

۴۔ جن اسماء کے آخر میں الف یا 'نہ' ہو۔ تو واحد اور جمع دونوں طرح استعمال

ہوتے ہیں۔

۵۔ مؤنث اسما کے آخر میں ی ہونے کی صورت میں الف اور نون غنہ (اں) بڑھاتے ہیں۔ جیسے لڑکی سے لڑکیاں۔ چھڑی سے چھڑیاں وغیرہ۔

۶۔ دو مؤنث اسما کے آخر میں الف۔ 'واؤ' یا 'ہ'، ہو۔ تو عموماً "یں" بڑھاتے ہیں۔ گھٹا سے گھٹائیں۔ خوشبو سے خوشبوئیں وغیرہ۔

۷۔ اگر آخر میں 'یا' ہو تو نون غنہ بڑھاتے ہیں۔ جیسے چڑیا سے چڑیاں۔

۸۔ بعض اوقات "یں" بڑھاکر جمع بناتے ہیں۔ جیسے بات سے باتیں کتاب سے کتابیں۔

۹۔ واحد اسم کے آخر میں الف یا 'ہ' ہو تو 'ہ' کو گرا کر 'وں' بڑھاتے ہیں۔ مثلاً لڑکا سے لڑکوں۔ دریا سے دریاؤں وغیرہ۔

۱۰۔ ندا کی حالت میں الف یا 'ہ' حذف ہو جاتے ہیں اور واؤ مجہول زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے لڑکا سے لڑکو۔ بچہ سے بچو وغیرہ۔

جمع الجمع بعض جمع اسما کی بھی جمع بنائی جاتی ہے۔ انھیں جمع الجمع کہتے ہیں۔ جیسے انبیا سے انبیاؤں۔ اولیا سے اولیاؤں۔

عربی قواعد کے مطابق جمع کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) جمع سالم (۲) جمع غیر سالم۔

جمع سالم اگر واحد اسم جمع کی صورت میں بدستور قائم رہے تو اسے جمع سالم کہتے ہیں۔ جیسے باغ سے باغات۔ احسان سے احسانات۔

جمع سالم بنانے کے لیے عموماً 'ون' 'ین' لگاتے ہیں۔ مؤنث کی 'ہ' حذف کرکے 'ات' بڑھاتے ہیں۔ غیر جاندار کی جمع بھی 'ات' لگاکر بناتے ہیں۔ مثلاً صالح سے صالحین۔ طالبہ سے طالبات۔ مکان سے مکانات۔

جمع غیر سالم یا مکسر اسم واحد کے پہلے یا درمیان میں اور حرف زیادہ کرکے یا حرکات میں اگر ایسی تبدیلی کر دی جائے۔

کہ واحد اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہے۔ تو اسے جمع مکسّر کہتے ہیں۔ جمع مکسّر کے قاعدے مقرر نہیں۔ مختلف اوزان کے مطابق بنائی جاتی ہے۔ مثلاً"۔

اَفْعَال کے وزن پر:۔ آفت سے آفات۔ حکم سے احکام۔ نور سے انوار۔

مَفَاعِل کے وزن پر:۔ تحفہ سے تحائف۔ عقیدہ سے عقائد۔ امر سے اوامر۔ مدرسہ سے مدارس۔

فِعَال کے وزن پر:۔ خیمہ سے خیام۔ صفت سے صفات۔ نکتہ سے نکات۔

فُعُول کے وزن پر:۔ رقم سے رقوم۔ علم سے علوم۔ قلب سے قلوب۔

فُعَلَاء کے وزن پر:۔ ادیب سے اُدبا۔ رئیس سے رُؤسا۔ طالب سے طلبا۔

اَفْعِلَاء کے وزن پر:۔ غنی سے اغنیا۔ نبی سے انبیا۔ قریب سے اقربا۔

فُعَّال کے وزن پر:۔ تاجر سے تجّار۔ حاکم سے حکام۔ کافر سے کفّار۔

فِعَل کے وزن پر:۔ حصّہ سے حِصَص۔ ملّت سے مِلَل۔ محنت سے محن۔

فَعَالِلَہ کے وزن پر:۔ اُستاد سے اساتذہ۔ مَلَک سے ملائکہ۔ تلمیذ سے تلامذہ۔

اسم جمع | اسماء جمع وہ اسم ہیں۔ جو بظاہر واحد معلوم ہوتے ہیں لیکن معنی جمع کے دیتے ہیں۔ جیسے لشکر۔ فوج۔ گروہ۔ سپاہ۔ جماعت۔ مجلس۔ درجن۔ محفل۔ انجمن۔ دستہ۔ قافلہ۔ قوم۔ مجمع وغیرہ۔

جمع اور اسم جمع میں فرق | جمع اور اسم جمع میں یہ فرق ہے کہ جمع کے مقابل واحد ہوتا ہے۔ لیکن اسم جمع کا واحد نہیں ہوتا۔ بلکہ اسم جمع کی جمع بھی استعمال ہوتی ہے۔ جیسے لشکروں۔ افواج۔ مجالس۔ اقوام۔ جمع کے لیے فعل جمع آتا ہے۔ لیکن اسم جمع کے لیے فعل واحد ہوتا ہے۔

بعض جمع اُردو میں بطور واحد استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اخبار۔ اُصول۔ کرامات۔ اولاد۔ اخلاق۔ حوالات۔ اوقات وغیرہ۔

بعض واحد الفاظ اُردو میں بطور جمع استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے دستخط۔ نصیب۔ درشن۔

اِسمائے معیت کی صُورت میں اسم واحد ہی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ایک راس بیل۔ چار جلد کتاب۔ دو عدد قلم۔

بعض الفاظ کی جمع عربی و فارسی قواعد سے بھی بناتے ہیں۔ اور اُردو جمع بھی استعمال ہوتی ہے۔

واحد	اُردو جمع	عربی فارسی جمع
اُستاد	اُستادوں	اساتذہ
باغ	باغوں	باغات
بیگم	بیگموں	بیگمات
تصویر	تصویروں	تصاویر
حاجت	حاجتیں، حاجتوں	حوائج
خبر	خبروں	مرثیہ
رسالہ	رسالوں، رسالے	رسائل
سطر	سطروں، سطریں	سطور
غریب	غریبوں	غربا
فائدہ	فائدے، فائدوں	فوائد
قوم	قومیں، قوموں	اقوام
قِسم	قسمیں، قسموں	اقسام
مدرسہ	مدرسے، مدرسوں	مدارس
مرثیوں	مرثیوں، مرثیے	مراثی
ملک	ملکوں	ممالک

چارٹ واحد جمع

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
ابد	آباد	ابن	ابنا	اب	آبا
اجنبی	اَجانب	ادب	آداب	احسن	احاسن، محاسن
امنی	امانی	اسلوب	اسالیب	اسم	اسما
اسیر	اساریٰ	اصل	اصول	اعظم	اعاظم
افضل	افاضل	افق	آفاق	اقلیم	اقالیم

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
اثر	آثار	افغان	افاغنہ	الم	آلام
آخر	آواخر	امر(کام)	امور	اوّل	اوائل
امام	ائمہ	احمق	احمق	ایجاد	ایجادات
امر(حکم)	اوامر	اصلاح	اصلاحات	ام	امہات
اُمت	امم	اعلیٰ	اعالی	ارض	آراض
امن	امان	امیر	اُمرا		
اکبر	اکابر				

(ب)

باب	ابواب	بحر(سمندر)	ابحار	بحر(شعر)	بحور
بدن	ابدان	برج	بروج	برکت	برکات
باعث	بواعث	بدل	ابدال	برہان	براہین
بصر	ابصار	بصیرت	بصائر	بطن	بطون
بلد	بلاد	بیت(گھر)	بیوت	بیت(شعر)	ابیات
بیگم	بیگمات	بنت	بنات	بندق	بنادیق

(ت)

تاریخ	تواریخ	تالیف	تالیفات	تجربہ	تجربات، تجارب
تجلّی	تجلّیات	تجویز	تجاویز	تدبیر	تدابیر
ترجمہ	تراجم	ترکیب	تراکیب	تشریح	تشریحات
تصنیف	تصانیف	تصوّر	تصوّرات	تفسیر	تفاسیر
تفریق	تفاریق	تائب	تائبین، توّاب	تقی	اتقیا
توام	توائم				

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
		(ث)			
ثابت	ثوابت	ثاقب	ثواقب	ثانی	ثوانی
ثقہ	ثقات	ثمر	اثمار-ثمرات	ثور (بیل)	اثوار
		(ج)			
جاہل	جہلا-جہول	جامع	جوامع	جانب	جوانب
جرم	اجرام	جد	اجداد	جبل (پہاڑ)	جبال
جُرم	جرائم	جزُ	اجزا	جسم	اجسام
جن	اَجنّہ	جوہر	جواہر	جہت (طرف)	جہات
جیب (گریبان)	جیُوب	جناب	اجنبہ	جریدہ	جرائد
جنّت	جنّات	جزیرہ	جزائر	جنس	اجناس
جماد	جمادات	جن	جنّات	جامع	جوامع
		(ح)			
حاجت	حاجات-حوائج	حاجی	حجاج	حادثہ	حادثات-حوادث
حاشیہ	حواشی	حیوان	حیوانات	حرف	حروف
حَب (گولی)	حبوب	حاکم	حکّام	حاسد	حسود
حال	احوال	حد	حدُود	حورا	حوُر
حرم	احرام	حقیقت	حقائق	حکمت	حِکم
حس	حواس	حکایت	حکایات	حافظ	حفّاظ
حضرت	حضرات	حاضر	حضار-حاضرین	حُر	احرار
حزن	احزان	حسنہ	حُسنات	حکیم	حکما
حجت	حجج	حسب	احساب		

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع

(خ)

خاتم (انگوٹھی)	خواتم	خاصیّت	خواص	خان	خوانین
خادم	خدّام	خاص	خواص	خزانہ	خزائن
خصلت	خصائل	خلعت	خلاع	خلق	خلائق
خط	خطوط	خلق	اخلاق	خطرہ	خطرات
خلف	اخلاف	خیمہ	خیام۔ خیم	خطبہ	خطبات۔ خطب
خلیفہ	خلفا	خطا	خطایا		

(د)

دار گھر	دیار	درجہ	درجات	دستور	دساتیر
دعویٰ	دعاوی	دلیل	دلائل	دوا	ادوّیہ
دور	ادوار	دولت	دُوَل	دین	ادیان
دیوان	دوادین	دائرہ	دوائر	دعوت	دعوات
دُعا	ادعیہ	دفتر	دفاتر	دُرّہ	دُرَر
دِہ	دیہات	دستور	دساتیر	دہقاں	دہاقین

(ذ)

ذات	ذوات	ذخیرہ	ذخائر	ذرّہ	ذرّات
ذریعہ	ذرائع	ذکر	اذکار	ذہن	اذہان
ذمیمہ	ذمائم	ذلیل	اذلّہ	ذکر	اذکار

(ر)

رائے	آرا	رجل	رجال	رزق	ارزاق
رسم	رسوم	رعیّت	رعایا	رفیق	رفقا
رقم	رقوم	رُکن	ارکان	رمز	رموز

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
رُوح	ارواح	روضہ	ریاض	ریح	ریاح
ریحان	ریاحین	روایت	روایات	رب	ارباب
رسالہ	رسائل	رفیق	رفقا	رکن	ارکان-اراکین
رسم	رسوم-رسومات	رابطہ	روابط		

(ز)

زاویہ	زوایا	زائد	زوائد	زاہد	زہاد
زمان	زمن-ازمنہ	زوجہ	ازواج	زائر	زوار-زائرین

(س)

ساحل	سواحل	ساکن	ساکنان	سلف	اسلاف
سانحہ	سوانح	سامع	سامعین	سلطان	سلاطین
سبق	اسباق	سلسلہ	سلاسل	سند	اسناد
سجدہ	سجود	سیرت	سِیَر	سیّد	سادات
سحر	اسحار	سابق	سوابق	سر	اسرار
سعی	مساعی	سلاح	اسلحہ	سما (آسمان)	سمٰوات
سن	سنین	سم (زہر)	سموم	سفینہ	سفائن

(ش)

شاعر	شعرا	شاہد	شہود-اشہاد	شبہ	شبہات
شدّت	شدائد	شراب	اشربہ	شرط	شرُط-شرائط
شریر	اشرار	شریف	شرفا	شکل	اشکال
شہید	شہدا	شے	اشیاء	شیخ	شیوخ
شیطان	شیاطین	شعاع	اشعہ	شقی	اشقیا
شمع	شموع	شخص	اشخاص		

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
		(ص)			
صاحب	اصحاب	صاعقہ (بجلی)	صواعق	صالح	صلحا
صانع	صنّاع	صبح	اصباح	صدر	صدور
صندوق	صنادیق	صدمہ	صدمات	صفت	صفات
صنف (قسم)	اصناف	صبی (نابالغ لڑکا)	صبیان	صوت	اصوات
صُورت	صُور	صوم (روزہ)	صیام	صنعت	صنائع
صدقہ	صدقات	صفر	اصفار	صغیر	اصغار
		(ض)			
ضابطہ	ضوابط	ضد	اضداد	ضمیر	ضمائر
ضرب المثل	ضرب الامثال	ضلع	اضلاع	ضیف (مہمان)	ضیوف
		(ط)			
طاہر	اطہار	طائفہ	طوائف	طالب	طلبا۔ طلّاب
طبع	اطباع	طبیب	اطبّا	طبیعت	طبائع
طرف	اطراف	طریق	طرق	طعام	اطعمہ
طبق	اطباق	طفل	اطفال	طور	اطوار
		(ظ)			
ظریف	ظرفا	ظلمت (سیاہی)	اظلام۔ ظلمات	ظرف	ظروف
ظن (گمان)	ظنون	ظلم	مظالم	ظاہر	ظواہر
ظِل	ظِلال				
		(ع)			
عابد	عباد	عاجز	عواجز	عادت	عادات
عاشق	عشاق	عاقل	عقلا	عالم	علماء

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
عامل	عمّال۔عملہ	عالی	عوالی	عام	عوام
عبد	عباد	عالَم (جہاں)	عوالِم	عدد	اعداد
عرضی	عرائض	عزیز	اعِزّہ	علّت	علل
عسکر	عساکر	عطر	عطریات	عَلَم (جھنڈا)	اعلام
عضو	اعضا	عین (سردار)	اعیان	عمل	اعمال
عقب	اعقاب	عقیدہ	عقائد	عون (مددگار)	اعوان
عین (آنکھ)	عیون	عندلیب	عنادل	عارضہ	عوارض
عطیہ	عطیات	عظیم	عظّام	عنصر	عناصر
عیب	عیوب	عامل	عمّال		

(غ)

غذا	اغذیہ	غرض	اغراض	غریب	غربا
غزوہ	غزوات	غنی	اغنیا	غیر	اغیار
غلط	اغلاط	غزل	غزلیات	غلاف	غُلف

(ف)

فاتح	فاتحین	فاضل	فضلا	فائدہ	فوائد
فتح	فتوح	فتنہ	فتن	فتویٰ	فتاویٰ
فدوی	فدویان	فرد	افراد	فرض	فرائض
فرمان	فرامین	فصل (حصّہ)	فصول	فرعون	فراعنہ
فضیلت	فضائل	فرقہ	فِرَق	فقیر	فقرا
فلک	افلاک	فکر	افکار	فوج	افواج
فہم	افہام	فلسفی	فلاسفہ	فقیہہ	فقہا
فیض	فیوض	فن	فنون	فرقہ	فرق
فریضہ	فرائض				

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
		(ق)			
قاری	قراء	قاضی	قضات	قاعدہ	قواعد
قافیہ	قوافی	قانون	قوانین	قبر	قبور
قبیلہ	قبائل	قدیم	قدوم۔اقدام	قرن	قرون۔اقران
قرینہ	قرائن	قسط	اقساط	قِسم	اقسام
قصر	قصور	قصّہ	قصص	قصبہ	قصبات
قدیم	قدما	قطعہ	قطعات	قلب	قلوب
قندیل	قنادیل	قوت	قویٰ	قول	اقوال
قوم	اقوام	قید	قیود	قصّہ	قصص
قطعہ	قطعات	قلب	قلوب	قمر	اقمار
قول	اقوال	قریب	اقربا	قرینہ	قرائن
قصیدہ	قصائد	قدیم	قدما	قافلہ	قوافل
		(ک)			
کاسہ (پیالہ)	کاسات	کتاب	کتب	کرم (بخشش)	مکارم
کریم	کرام	کمال	کمالات	کلمہ	کلمات
کیفیت	کوائف	کوکب	کواکب	کافر	کفار
کبیر	کبار	کسر	کسور	کنایہ	کنایات
		(ل)			
لامع (روشن)	لوامع	لُب (خالص)	لبوب	لحن	الحان
لازم	لوازم	لسان	اِلسنہ	لفظ	الفاظ
لطیفہ	لطائف	لطف	الطاف	لوح	الواح
لون (رنگ)	الوان	لُولُو (موتی)	لآلی	لیل (رات)	لیالی

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
		(م)			
مقالہ	مقالات	منبر	منابر	منقبت	مناقب
مادہ	مواد	مال	اموال	مبحث	مباحث
مثال	امثال	مجلس	مجالس	مجمع	مجامع
محمل	محامل	محنت	محن	مخزن	مخازن
مدینہ	مدائن	مذہب	مذاہب	مرثیہ	مراثی
مرحلہ	مراحل	مسطر	مساطر	مسکن	مساکن
مہم	مہمات	مرتبہ	مراتب	مقبرہ	مقابر
مسئلہ	مسائل	مشہور	مشاہیر	مصدر	مصادر
مصلحت	مصالح	مطبع (چھاپہ خانہ)	مطابع	معلّم	معلّمین
مفتاح (کنجی)	مفاتیح	معصیت	معاصی	معجزہ	معجزات
ملک	ممالک	مقدار	مقادیر	مکان	مکانات، اماکن
مولیٰ	موالی	مِلک	املاک	منزل	منازل
منصب	مناصب	مندر	منادر	موج	امواج
موقع	مواقع	منظر	مناظر	مخزن	مخازن
		(ن)			
نبی	انبیا	نبات (سبزی)	نباتات	نتیجہ	نتائج
نصیحت	نصائح	نصیر (مددگار)	انصار	نعمت	نعم
نادر	نوادر	ناصر	انصار	ناظر	ناظرین
نجم	نجوم۔انجم	نجیب	نجبا	ندیم	نُدما
نظریہ	نظریات	نقش	نقوش	نقل	نقول
نکتہ	نکات	نور	انوار	نہی	نواہی
نوع	انواع	نقص	نقائص	نہر	انہار

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
		(و)			
وارث	ورثا	وسیلہ	وسائل	وقت	اوقات
وجہ	وجوہ۔ وجوہات	ورد	اوراد	ورق	اوراق
وزن	اوزان	وزیر	وُزرا	وصف	اوصاف
وفد	وفود۔ افاد	وقف	اوقاف	وکیل	وکلا
ولد	اولاد	وہم	اوہام	وحشی	وحش۔ وحوش
وطن	اوطان	وظیفہ	وظائف	وصیّت	وصایا
		(ہ)			
ہدایت	ہدایات	ہدف	اہداف	ہمّت	ہمم
ہندو	ہنود	ہول (ڈر)	اہوال	ہدیہ	ہدایا
ہرم	اہرام	ہیکل (شکل)	ہیاکل		
		(ی)			
یاقوت	یواقیت	یتیم	یتامیٰ	یوم	ایّام
یہودی	یہود				

جمع الجمع

واحد	جمع	جمع الجمع	واحد	جمع	جمع الجمع
ارض	اراضی	اراضیات	اِسم	اسما	اسامی
جوہر	جواہر	جواہرات	دوا	ادویہ	ادوّیہ
عارضہ	عوارض	عوارضات	لازمہ	لوازم	لوازمات
مکان	امکنہ	اماکن	وجہ	وجوہ	وجوہات

سوالات

1- جمع سالم اور جمع مکسّر کا فرق مثالیں دے کر واضح کیجئے۔
2- جمع اور اسم جمع میں کیا فرق ہے۔ مثالیں دیجئے۔
3- گنتی کے لحاظ سے اسم کی کتنی قسمیں ہیں۔
4- تثنیہ سے کیا مُراد ہے۔ طرف۔ جانب۔ عید۔ قطب۔ قوس سے تثنیہ بناؤ۔
5- جمع الجمع کسے کہتے ہیں۔ ذیل سے جمع الجمع بناؤ:۔

ارض۔ رسم۔ جوہر۔ لازمہ۔ وجہ۔

6- مندرجہ ذیل کے جمع بناؤ۔

اہل۔ قصّہ۔ دولت۔ محنت۔ فیض۔ قصیدہ۔ مرثیہ۔ حاجت۔ لباس۔ وسیلہ۔ عامل۔ تجربہ۔ فن، قندیل۔ جیلہ۔ شمع۔

7- حسب ذیل کے واحد بتاؤ۔

قلاع۔ امال۔ اعضا۔ عساکر۔ اوطان۔ املاک۔ آفاق۔ حواشی۔ حصص۔ حواس۔ ہمم۔ خواتین۔ اطراف۔ نسخ۔ تفاریق۔

8- ذیل کی عبارت کو اس طرح بدل کر لکھئے۔ کہ تمام اِسم، فعل اور ضمائر صیغہ جمع میں ہیں، واحد میں ہو جائیں۔ اور عبارت کے مفہوم میں کوئی فرق نہ آئے:۔

تم روئے اور ہمارا دل بے چین ہوا۔ تمہاری اُنگلی دُکھی تو ہمارے دِل پر چوٹ لگی۔ مصیبتیں ہم نے سہیں، تکلیفیں ہم نے اُٹھائیں، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر ہم بیٹھے، کندھے سے لگایا۔ چمکارا، لوریاں سنائیں۔ غرضیکہ جان مال آرام سب کچھ تمہارے لیے قربان کر دِیا۔ کیا اس کا یہی صلہ ہے۔

9- نیچے لِکھے ہوئے فقروں میں اسموں اور فعلوں کو جمع میں تبدیل کیجئے۔

۱- اس عورت نے فقیر کو روٹی دی۔
۲- ارشد نے اپنی لڑکی کی شادی کر دی ہے۔
۳- ماں اپنے بچے کو پیار کرتی ہے۔
۴- ہوشیار اور ذہین لڑکا اپنے استاد کی ہر بات فوراً سمجھ لیتا ہے۔

۱۵- واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھو۔

طلبا - وکیل - جُرم - آلہ - تاجر - کفّار - خیام - امام - اغنیہ - اُمّت - عوارض - جوہر - مراثی - مسکین - مفتاح - ںیل - وصیّت - فتویٰ - مشاہیر - مقبرہ - کیفیت - منبر - معارک - غنیمت - دولت۔

باب ٦

تذکیر و تانیث

جنس کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں:۔ مذکر اور مؤنث۔

مذکر | مذکر وہ لفظ ہے۔ جو نر کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے
مرد۔ گھوڑا۔ شوہر

مؤنث | مؤنث وہ لفظ ہے۔ جو مادہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے:۔
عورت۔ گھوڑی۔ بیوی۔

تذکیر و تانیث حقیقی | قدرت نے جانداروں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اس لیے ان کی تمیز کچھ مشکل نہیں۔ اس لیے جانداروں کی تذکیر و تانیث حقیقی کہلاتی ہے۔ جیسے لڑکا۔ لڑکی۔ بیل۔ گائے۔ کتّا۔ کتیا۔

تذکیر و تانیث غیر حقیقی | بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث غیر حقیقی کہلاتی ہے۔ اور وہ اہل زبان کے محاورے کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسے گھر مذکر ہے۔ اور کوٹھڑی مؤنث۔ دہی مذکر۔ کرسی مؤنث

جانداروں کی تذکیر و تانیث

۱۔ نر اور مادہ کے لیے جدا جدا الفاظ مقرر ہیں۔ جیسے:۔

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
ابّا	امّاں	باپ	ماں	بادشاہ	بیگم۔ ملکہ
بندہ	کنیز	بندہ	بندی۔ باندی	بھائی	بہن
جن	پری	خالو	خالہ	خاوند	جورُو۔ بیوی

مذکّر	مؤنّث	مذکّر	مؤنّث	مذکّر	مؤنّث
خواجہ	خاتون	داماد	بہو	دولہا	دلہن
راجہ	رانی	سسر	ساس	شوہر	بیوی
صاحب	میم	غلام	لونڈی	ماموں	ممانی
خان	خانم	مرد	عورت	نواب	بیگم
خصم	جورو	میاں	بی بی	بیل	گائے
رنڈوا	رانڈ	بوڑھا	بڑھیا	بھائی	بھاوج
پدر	مادر	پسر	دختر	برادر	خواہر

پیر مرد پیرزن ۔

۲۔ اگر مذکّر کے آخر میں الف یا "ہ" ہو۔ تو ان کو یائے معروف (ی) سے بدل دیتے ہیں ۔ جیسے :۔

بیٹا	بیٹی	بھانجا	بھانجی	پوتا	پوتی
بھتیجا	بھتیجی	شہزادہ	شہزادی	چچا	چچی
نواسہ	نواسی	صاحبزادہ	صاحبزادی	کبڑا	کبڑی
جولاہا	جولاہی	پیارا	پیاری	سالا	سالی
چیونٹا	چیونٹی	اندھا	اندھی	بہرا	بہری

۳۔ آخر میں یائے معروف لگانے سے :۔

برہمن	برہمنی	تیتر	تیتری	چمار	چماری (چمارن)
کبوتر	کبوتری	ہرن	ہرنی	پٹھان	پٹھانی
لوہار	لوہاری (لوہارن)				

۴۔ مذکّر کے آخر حرف کو (ن) سے بدل دینے سے یا آخری حرف کے آگے "ن" بڑھانے سے جیسے :۔

مراسی	مراسن	کنجڑا	کنجڑن	مالی	مالن

مذکّر	مؤنّث	مذکّر	مؤنّث	مذکّر	مؤنّث
بھنگی	بھنگن	یہودی	یہودن	نائی	نائن
جوگی	جوگن	دھوبی	دھوبن	بنگالی	بنگالن
گوالا	گوالن	حاجی	حجن	پنجابی	پنجابن
تیلی	تیلن	ٹھٹھیرا	ٹھٹھیرن	چودھری	چودھرائن
درزی	درزن	فرنگی	فرنگن	موچی	موچن
سمدھی	سمدھن	ہندو	ہندنی	ناگ	ناگن
بچھڑا	بچھڑی	سانپ	سانپن	بیراگی	بیراگن
سنیاسی	سنیاسن۔				

۵۔ آخری حرف حذف کر کے یا بغیر حذف کیے نی۔انی لگا کر مؤنّث بناتے ہیں:۔

اُستاد	اُستانی	شیر	شیرنی	مُلّا	مُلّانی
اُونٹ	اُونٹنی	مور	مورنی	بھُوت	بھُتنی
پنڈت	پنڈتانی	جیٹھ	جیٹھانی	ڈاکٹر	ڈاکٹرنی
ڈوم	ڈومنی	گویّا	گائن	مہتر	مہترانی
شیخ	شیخانی	فقیر	فقیرنی	سیّد	سیّدانی
مغل	مغلانی	دیور	دیورانی۔		

۶۔ عربی مذکّر اور مؤنّث بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مذکّر کے آخر میں "ہ" لگائی جاتی ہے:۔

حاکم	حاکمہ	شاعر	شاعرہ	صاحب	صاحبہ
حسین	حسینہ	زوج	زوجہ	سلطان	سلطانہ
طالب	طالبہ	والد	والدہ	قیصر	قیصرہ
جد	جدّہ	عم	عمّہ	محبُوب	محبُوبہ
مسلم	مسلمہ	قاتل	قاتلہ	ملازم	ملازمہ

مذکّر	مؤنّث	مذکّر	مؤنّث	مذکّر	مؤنّث
فاضل	فاضلہ	وارث	وارثہ	سلطان	سلطانہ

۷۔ مختلف تبدیلیوں سے :۔

سانپ	سانپن	چوہا	چوہیا	ہاتھی	ہتھنی
ٹٹو	ٹٹوانی	بھیڑ	بھیڑ	بھینسا	بھینس
بندر	بندریا	چڑا	چڑیا	کتا	کتیا

الفاظ کے ساتھ نر اور مادہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مادہ خرگوش نرگاؤ وغیرہ۔

۸۔ بعض جاندار ہمیشہ مذکّر استعمال ہوتے ہیں۔

کوّا۔ ہُدہُد۔ باز۔ شکرہ۔ اُلّو۔ لنگور۔ بھیڑیا۔ چیتا۔ عقاب۔ گدھ مگرمچھ۔ گینڈا۔ اژدہا۔ بگلا۔ جگنو۔ خرگوش۔ کھٹمل۔ مچھّر۔ سارس۔ طوطا۔ سانپ۔

۹۔ مندرجہ ذیل اسماء۔ مؤنّث بولے جاتے ہیں۔

قمری۔ فاختہ۔ چیل۔ مرغابی۔ مکھّی۔ بطخ۔ کوئل۔ گلہری۔ مچھلی۔ لومڑی۔ مینا۔ چھپکلی۔

بُلبل مذکّر اور مؤنّث دونوں طرح مستعمل ہے۔

ع بُلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

س کس طرف جائے گی بر داشتہ خاطر ہو کر
باغ کیوں کرتی ہے گلچیں کے حوالے بلبل

۱۰۔ بعض مؤنّث ایسے ہیں۔ جن کا مذکّر نہیں ہوتا۔ مثلاً چڑیل۔ بیوہ۔ سہاگن ڈائن وغیرہ۔

بے جان اسما کی تذکیر تانیث

۱۔ خُداوند تعالیٰ کے تمام اسما مذکّر بولے جاتے ہیں۔ ایشور۔ خُدا۔

۲۔ پہاڑوں کے نام مذکّر بولے جاتے ہیں۔ ہمالیہ۔ ہندوکش۔ راکپنر۔

۳۔ مہینوں کے نام مذکّر بولے جاتے ہیں۔ چیت۔ جنوری۔ محرّم۔ فیروزدین۔

۴۔ دنوں کے نام سوائے جمعرات کے سب مذکّر ہیں۔

۵۔ ستاروں، سیّاروں کے نام سب مذکّر ہیں۔ مگر زمین مؤنّث۔

۶۔ دھاتوں اور جواہرات کے نام سب مذکّر ہیں۔ مگر چاندی مؤنّث۔

۷۔ عربی اسم ظرف جیسے مکتب۔ مدفن۔ مخزن وغیرہ مذکّر بولے جاتے ہیں۔
مگر مسجد، مجلس، منزل، معدن، مسند، مؤنّث ہیں۔

۸۔ جن الفاظ کے آخر میں "ستان" ہو مذکر بولے جاتے ہیں۔ ہندوستان۔
قبرستان۔ خیالستان۔ بوستان۔ کتابوں کے نام مؤنّث ہیں۔

۹۔ گلوبند۔ ازاربند۔ کاروبار۔ بچپن۔ کوہسار۔ قلمدان۔ تالاب۔ بازار۔
گلزار۔ لالہ زار۔ مذکّر بولے جاتے ہیں۔ اِن کے آخر میں بند، زار یا سار ہے۔

۱۰۔ جن اسما کے آخر میں "ی" ہو۔ مؤنّث بولے جاتے ہیں۔ جیسے مکڑی۔ کوٹھی
تالی۔ کنجی۔ روٹی۔ ہڈی۔ ڈیوڑھی۔ سبزی۔ پریشانی۔ کشتی۔ چھتری۔ مگر پانی
افعی۔ موتی۔ گھی۔ دہی۔ مستثنیٰ ہیں۔ اور مذکّر بولے جاتے ہیں۔

۱۱۔ جن اسمار کے آخر میں 'ا' یا 'ہ' ہو مذکر بولے جاتے ہیں۔ دریا۔ نقشہ۔
پنکھا۔ دانہ۔ آئینہ۔ پروانہ۔ تالا۔ بوریا۔ لیکن بھاشا۔ پوجا۔ چھالیا
دُنیا۔ گنگا۔ مالا۔ ہوا۔ کٹیا۔ انگیا۔ سبھا۔ جمنا مؤنّث ہیں۔

۱۲۔ ایسے اسمائے تصغیر جن کے آخر میں 'یا' ہے۔ مؤنّث ہیں۔ پڑیا۔ ڈبیا۔
گڑیا۔

۱۳۔ جن کے آخر میں 'ہ' ہو۔ مؤنّث بولے جاتے ہیں۔ جیسے پناہ۔ توبہ۔
شفا۔ تنخواہ۔ توبہ۔ جگہ۔ چراگاہ۔ درگاہ۔

۱۴۔ کتابوں کے نام عموماً مؤنّث بولے جاتے ہیں۔ بانگ درا۔ آب حیات۔
گلستان سعدی۔

۱۵۔ زبانوں کے تمام نام مؤنث بولے جاتے ہیں۔ جیسے اُردو۔ انگریزی۔ پنجابی۔ بنگالی۔

۱۶۔ ایسے حاصل مصدر جن کے آخر میں ن، ہو۔ مؤنث بولے جاتے ہیں۔ جیسے:۔ سوجن۔ دھڑکن۔ پھسلن۔ مگر جلن مذکر ہے۔

۱۷۔ فارسی مصادر کے حاصل مصدر عموماً مؤنث بولے جاتے ہیں۔ جیسے آرائش۔ آزمائش۔

۱۸۔ آندھی۔ صبا۔ پُروا۔ پچھوا۔ نسیم وغیرہ مؤنث ہیں۔ لیکن جھکڑ اور طوفان مذکر بولے جاتے ہیں۔

۱۹۔ ایسے حاصل مصدر جن کے آخر میں 'پن' آئے مذکر بولے جاتے ہیں۔ مثلاً بچپن۔ لڑکپن۔ دیوانہ پن۔

۲۰۔ عربی مصدر جن کے آخر میں 'ت' ہو۔ مؤنث بولے جاتے ہیں۔ جیسے حکمت۔ ندامت۔ فرصت۔ قدرت۔

۲۱۔ عربی مصدر جن کے آخر میں الف ہو۔ مؤنث بولے جاتے ہیں۔ جیسے شفا۔ قضا۔ بقا۔ فنا۔ حیا۔ وفا۔

۲۲۔ ہندی لفظ جس کے آخر میں 'س' آئے مؤنث بولے جاتے ہیں۔ جیسے۔ مٹھاس۔ نکاس۔ بھڑاس۔ پیاس۔

۲۳۔ جس لفظ کے آخر میں 'کار' آئے۔ مؤنث ہیں۔ سرکار۔ للکار۔ پکار پرکار۔ وغیرہ مگر افکار۔ شکار۔ انکار۔ اذکار مذکر ہیں۔

۲۴۔ اردو حاصل مصدر مؤنث بولے جاتے ہیں۔ مثلاً لڑائی۔ بکواس۔ گفتگو۔ سوجن۔ جلن۔ گھبراہٹ۔ لگاوٹ وغیرہ مگر جلن مذکر ہے۔ بچاؤ کے وزن۔ پر دباؤ۔ بناؤ۔ لگاؤ۔ بھاؤ وغیرہ مذکر ہیں۔

۲۵۔ انگریزی الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اہل زبان کی پیروی کی جاتی ہے۔ چنانچہ کوٹ۔ ٹیچر۔ بنک۔ ڈپو۔ بٹن۔ پرمٹ۔ گیٹ۔ آفس۔ سٹیشن۔

سکول - کالج - فٹ بال - ریٹ - فوٹو وغیرہ مذکر بولے جاتے ہیں۔ لیکن موٹر - ریل - پارٹی - کلاس - ڈبیٹ - بائیسکل - کاپی - ٹیوب - میٹنگ وغیرہ مؤنث استعمال ہوتے ہیں۔

۲۶ - ذو معنی الفاظ (جن کے دو معنی ہوں ، معانی کے لحاظ سے مذکر اور مؤنث استعمال ہوتے ہیں۔

الفاظ	معنی	تذکیر تانیث	الفاظ	معنی	تذکیر و تانیث
آب	پانی	مذکر	آب	چمک	مؤنث
آہنگ	ارادہ	″	آہنگ	آواز	″
اُردو	لشکر	″	اُردو	زبان	″
چاہ	کنوآں	″	چاہ	محبّت	″
تاک	انگور کی بیل	″	تاک	تاکنا	″
گزر	جانا	″	گزر	بسر اوقات	″
دوپہر	چھ گھنٹے	″	دوپہر	بارہ بجے دن	″
عرض	چوڑائی	″	عرض	التماس	″
کان	کان عضو جسم	″	کان	معدنیات کی	″
کف	جھاگ	″	کف	ہتھیلی	″
صرف	خرچ	″	صرف	گرامر	″
مہر	سورج	″	مہر	محبّت	″
لگن	برتن	″	لگن	محبّت	″
میان	درمیان	″	میان	کمر	″
تکرار	کسی لفظ کا دوبارہ لانا	″	تکرار	بحث	″

۲۷ - ہندی مصدر مذکر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اس کا مرنا سب کو شاق گزرا - لیکن جب مؤنث لفظ سے متعلق ہو، تو اس کی صورت بھی مؤنث

ہو جاتی ہے جیسے

ع بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

اہل لکھنؤ ہر حال میں مصدر کو مذکر ہی بولتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔

۲۸۔ عربی الفاظ مُفَاعَلہ کے وزن پر مذکر بولے جاتے ہیں۔ جیسے مجادلہ۔ مشاعرہ۔ معاملہ۔ ناظرہ۔ اسی طرح تفعیل کے وزن پر تقریر۔ تحریر۔ تقدیر۔ تدبیر مؤنث ہیں۔ مگر تعویذ مذکر ہے۔

۲۹۔ عربی فارسی الفاظ جن کے آخر میں 'ہ' ہو اکثر مذکر ہوتے ہیں۔ جیسے نسخہ۔ روضہ۔ دورہ۔ شیشہ۔ آئینہ۔ پیمانہ۔ مگر دفعہ۔ توبہ مؤنث ہیں۔

۳۰۔ جو لفظ دو افعال یا اسم اور فعل سے مل کر بنتے ہیں۔ وہ اکثر مؤنث ہوتے ہیں۔ جیسے تراش خراش۔ تگ و دو۔ خرید و فروخت۔ آمد و رفت۔ بود و باش وغیرہ مگر سوز و گداز۔ بندوبست۔ ساز باز مذکر ہیں۔

۳۱۔ اگر ایسے الفاظ میں ایک مؤنث اور دوسرا مذکر ہو۔ تو فعل کی تذکیر و تانیث آخری لفظ کے لحاظ سے ہوگی۔ جیسے آب و ہوا۔ قلم دوات۔ آب و گل۔ گشت و خون۔ عنایت نامہ۔ خلوت خانہ وغیرہ۔ پیچ و تاب مستثنیٰ ہے۔

۳۲۔ حروف تہجی ا ب پ ت وغیرہ مؤنث بولے جاتے ہیں۔ جیم اور میم کے استعمال میں اختلاف ہے۔

۳۳۔ وہ الفاظ جو مذکر و مؤنث دونوں طرح بولے جاتے ہیں۔

چند الفاظ ایسے ہیں جنھیں اہل زبان مذکر و مؤنث دونوں طرح بولتے ہیں۔ یا بعض الفاظ ایسے ہیں۔ کہ وہ ایک جگہ مؤنث بولے جاتے ہیں۔ اور دوسری جگہ مذکر۔

اِملا۔ بلبل۔ نقاب۔ غور۔ سانس۔ فکر۔ موٹر۔ گیند۔ طرز۔ قمیض۔ درد۔ فاتحہ۔ کلک۔ قامت۔ زنّار۔ مالا۔ ایجاد۔ آغوش۔

مالا کو اہل لکھنؤ مذکر اور اہل دہلی مؤنث بولتے ہیں۔ متاع کو اہل لکھنؤ

مذکر اور اہل دہلی مونث بولتے ہیں۔
صفات۔ معلومات سوانح۔ شرائط۔ نشاط۔ اپیل۔ کمیشن۔ منازل۔
وجوہ۔ بچہ۔ دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں۔
۴۴۔ مندرجہ ذیل مذکر ہیں۔
آبشار۔ انبار۔ آنچل۔ انداز۔ پرہیز۔ پل۔ غار۔ تار۔ تھوک۔ جھاگ
حج۔ حرم۔ حظ۔ حرص۔ خواب۔ درد۔ زہر۔ ضبط۔ طوطی۔ طول۔ عفو۔
عقد۔ عیش۔ قلم۔ کھوج۔ گال۔ گیسو۔ گیہوں۔ ماپ۔ مزاج۔ مرہم۔ وہم۔
وصل۔ ہجر۔ ہوش۔ زخم۔ روگ۔
۴۵۔ مندرجہ ذیل مونث ہیں:۔
آستین۔ اساس۔ الوداع۔ پاداش۔ چلمن۔ رسن۔ رپٹ۔ سحر۔ شاباش
شاہراہ۔ شکن۔ فصل۔ کیچڑ۔ گھاس۔ مٹھاس۔ ناک۔ نبض۔ وفا۔ وبا۔
یاس۔ آنچ۔ پلک۔ ڈاک۔ تلاش۔

سوالات

1۔ جنس کے لحاظ سے اسم کی کتنی قسمیں ہیں۔ مثالیں دیجئے۔
2۔ تذکیر و تانیث حقیقی و غیر حقیقی سے کیا مراد ہے۔
3۔ جاندار کی تذکیر و تانیث کے کیا قاعدے ہیں۔
4۔ بے جان اسما کی تذکیر و تانیث کے چند قواعد تحریر کیجئے۔
5۔ پانچ ایسے الفاظ لکھئے جو بحالت مذکر کچھ اور معنی دیں۔ اور بحالت
مونث کچھ اور۔
6۔ مندرجہ ذیل کے مونث بتاؤ:۔
پدر۔ چودھری۔ سعید۔ چوہا۔ ہاتھی۔ غلام۔ دھوبی۔ کتا۔ حاجی۔ سنار۔
استاد۔

7 - مذکر بتاؤ۔

ساس - جورو - بھاوج - بہو - ناگن - دیورانی - خانم۔

8 - مذکر کے مؤنث اور مؤنث کے مذکر تحریر کیجئے۔

زوجہ - داماد - خالہ - خادم - سانپ - رانڈ - بیل - کنجڑا - ہندو - شیخ - ملا۔

9 - ذیل کے الفاظ مذکر بھی بولے جاتے ہیں - اور مؤنث بھی۔ فقروں میں استعمال کرکے دکھاؤ۔

سانس - نقاب - لگن - عرض - گزر - تکرار - آب۔

10 - مذکر کے مؤنث اور مؤنث کے مذکر بدل کر فقروں کو مناسب تبدیلیوں کے بعد لکھیئے:-

1 - گوالا شہر میں دودھ لایا کرتا تھا۔
2 - بھوت مسافروں کو ڈراتا ہے۔
3 - ڈومنی ابھی ابھی یہاں سے گزری ہے۔
4 - آپ کی کنیز بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔
5 - میری ساس اخبار شوق سے پڑھتی ہے۔

11 - مندرجہ ذیل الفاظ میں سے مذکر اور مؤنث علیحدہ علیحدہ لکھو۔

مزاج - راہ - چہرہ - احسان - قلم - مہک - دوا - دعا - قبد - گھاس - عطر - شفا - چلن - مکتب - مسند - توبہ - چھم چھم۔

باب ۷

افعال

فعل فعل وہ کلمہ ہے۔ جو کسی خاص زمانے میں کسی کام کا وقوع ظاہر کرے۔ جیسے میں نے خط لکھا۔ وہ کھاتا ہے۔ تم کتاب پڑھوگے۔ میں لکھا، کھاتا ہے۔ اور پڑھوگے فعل ہیں۔

زمانے تین ہیں:-

۱۔ ماضی :- وہ زمانہ جو گزر چکا ہے۔ جیسے میں نے خط پڑھا۔

۲۔ حال :- وہ زمانہ جو اب گزر رہا ہے۔ جیسے میں خط لکھتا ہوں۔

۳۔ مستقبل :- وہ زمانہ جو آیندہ آئے گا۔ جیسے میں خط لکھوں گا۔

ان تینوں زمانوں کو ازمنہ ثلاثہ کہتے ہیں۔

؎ بس دیکھ لیا۔ دیکھتا ہوں دیکھونگا کب تک
دُنیا میں تیری شعبدہ بازی کا تماشا

اِس میں دیکھ لیا ماضی۔ دیکھتا ہُوں حال اور دیکھونگا مستقبل ہے۔

بناوٹ کے لحاظ سے فعل کی قسمیں

۱۔ فعل مفرد فعل مفرد وہ فعل ہے۔ جو مفرد مصدر سے بنایا گیا ہو۔ جیسے اُٹھنا۔ لکھنا۔ پڑھنا سے اُٹھو، لکھتا ہوں۔ پڑھے گا وغیرہ۔

؎ کیا لکھوں میرا اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں ہُوا پامال

اِس شعر میں لکھوں اور ہُوا مفرد مصادر لکھنا اور ہونا سے ہیں۔

۲۔ فعل مرکب فعل مرکب وہ فعل ہے۔ جو مرکب مصدروں سے بنایا گیا ہو جیسے آنکھ لگنا۔ جگا دینا۔

پہلے گلشن کی ہوا دیکھ لے رہ کر چندے
آشیاں کی تو ابھی طرح نہ ڈال اے بلبل

ہوا دیکھنا اور طرح ڈالنا دو مرکب مصدر ہیں۔ یہ درحقیقت محاورے کہلاتے ہیں:۔

معنوں کے لحاظ سے فعل کی قسمیں

۱۔ فعل لازم فعل لازم وہ فعل ہے، جو صرف فاعل تک محدود ہو۔ جیسے ممتاز آیا۔ اس میں ممتاز فاعل اور آیا فعل لازم ہے، جو صرف فاعل کو چاہتا ہے۔

۲۔ فعل متعدّی فعل متعدّی وہ فعل ہے۔ جس کے لیے فاعل کے علاوہ مفعول کی بھی ضرورت پڑے۔ جیسے تاجور نے روٹی کھائی۔ اس میں تاجور فاعل کھائی فعل متعدی۔ اور روٹی (جس پر کھانے کا کام ہوا ہے) مفعول ہے۔

۳۔ فعل ناقص فعل ناقص وہ کلمہ ہے۔ جو فعل کے قائم مقام ہو۔ یہ کسی پر اثر نہیں ڈالتا۔ بلکہ کسی اثر کو ثابت کرتا ہے۔ جیسے پرؔویز بیمار ہے۔ اس میں فعل کا کرنا نہیں بلکہ ہونا پایا جاتا ہے۔ پرؔویز کام کا لینے والا ہے۔ کرنے والا نہیں اور 'بیمار' اس کی حالت کی خبر دیتا ہے۔ ایسے افعال یا کلمات دو اسموں کا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ ایک کو اسم یا مبتدا کہتے ہیں۔ اور دوسرے کو خبر۔ پرؔویز مبتدا ہے اور بیمار خبر۔

افعال ناقص اکثر یہ آتے ہیں۔ ہونا فعل ناقص ہے۔ اس کے علاوہ بننا۔ نکلنا۔ رہنا۔ پڑنا۔ لگنا۔ نظر آنا۔ دکھائی دینا وغیرہ کبھی ناقص آتے ہیں۔ اور

کبھی تام - جیسے :-

وہ امیر بن گیا (ناقص)، مَیں ڈاکٹر بنوں گا (لازم)

وہ بھلا لگتا ہے (ناقص)، اس کے اینٹ لگی (لازم)

۱- مثبت فعل فعل مثبت وہ فعل ہے - جس میں کسی کام کا کرنا پایا جائے - جیسے صبیحہ لکھتی ہے -

۲- منفی فعل منفی فعل وہ فعل ہے جس میں کسی کام کا نہ کرنا پایا جائے - جیسے صبیحہ نہیں لکھتی ہے -

فاعل کے لحاظ سے فعل کی قسمیں

۱- فعل معروف فعل معروف جس فعل کا فاعل معلوم ہو - خواہ وہ لازم ہو خواہ متعدی - جیسے ریل آئی - ہم ریل پر سوار ہوئے -

اس میں 'آئی' اور سوار ہوئے، فعل معروف ہیں - کیونکہ ان کے فاعل گاڑی اور ہم معلوم ہیں، پہلا فعل لازم ہے اور دوسرا متعدّی -

۲- فعل مجہول فعل مجہول وہ فعل ہے جس کا فاعل معلوم نہ ہو - جیسے خط لکھا گیا - اس میں لکھا گیا فعل مجہول ہے - کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ فاعل کونسا ہے -

فعل مجہول کا فاعل معلوم نہیں ہوتا - اس لیے مفعول ہی فاعل کا قائم مقام ہوتا ہے - اسے مفعول مالم یسمّ فاعلہ بھی کہتے ہیں -

فعل مجہول بنانے کا طریقہ:- فعل مجہول ہمیشہ متعدّی فعل سے بنتا ہے - کسی معروف فعل سے ماضی مطلق بنا کر اس کے آخر میں جانا مصدر کا مطلوبہ فعل اور صیغہ لگا دیا جاتا ہے - جیسے کھانا مصدر سے فعل مستقبل مجہول بنانا چاہتے ہیں تو کھانا سے کھایا ماضی مطلق بنا - اب جانا سے مستقبل جاہوگا - چنانچہ کھایا جائے گا، فعل مستقبل مجہول ہو گا -

زمانہ کے لحاظ سے فعل کی قسمیں

۱۔ فعل ماضی فعل ماضی وہ فعل ہے جس میں کام کا ہونا کسی گذشتہ زمانے میں پایا جائے۔ جیسے دیکھا تھا۔

ع کسے اب یاد ہے اک خواب دیکھا تھا جوانی میں

۲۔ فعل حال فعل حال وہ فعل ہے جس میں کام کا ہونا موجودہ زمانے میں ظاہر ہو جیسے کہتا ہوں۔

ع کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

۳۔ فعل مستقبل فعل مستقبل وہ فعل ہے۔ جس میں کام کا ہونا آیندہ زمانے میں ظاہر ہو۔ جیسے مرجائیں گے۔

ے اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

دُوسری قسمیں

۱۔ فعل مضارع فعل مضارع وہ فعل ہے جو موجودہ اور آیندہ دونوں زمانوں کو ظاہر کرے۔ جیسے وہ پڑھے۔ دہ جائے۔

اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اب پڑھے یا آیندہ۔ اب جائے یا آیندہ۔

۲۔ فعل امر فعل امر وہ فعل ہے۔ جس میں کسی کام کرنے کا حکم پایا جائے جیسے کھانا کھاؤ۔ آہستہ چل۔

۳۔ فعل نہی فعل نہی وہ فعل ہے۔ جس میں کسی کام کرنے سے روکا جائے جیسے کھانا نہ کھاؤ۔ آہستہ مت چل۔

فعل ماضی کی قسمیں

فعل ماضی کی چھ قسمیں ہیں:۔

(۱) ماضی مطلق (۲) ماضی قریب (۳) ماضی بعید (۴) ماضی استمراری
(۵) ماضی شکیہ یا احتمالی (۶) ماضی تمنائی یا شرطی۔

۱۔ فعل ماضی مطلق

ماضی مطلق وہ فعل ہے جس میں گزرا ہوا زمانہ بلا لحاظ وقت پایا جائے۔

بنانے کا قاعدہ:- ۱۔ علامت مصدر 'نا' دُور کرنے سے اگر آخری حرف الف یا واؤ رہے۔ تو 'یا' بڑھاتے ہیں۔ جیسے رونا سے رویا۔ کھانا سے کھایا۔ آنا سے آیا۔

۲۔ اگر آخری حرف الف یا واؤ نہ ہو۔ تو الف بڑھاتے ہیں۔ جیسے پڑھنا سے پڑھا۔ لکھنا سے لکھا۔

۳۔ بعض بے قاعدہ بھی آتے ہیں۔ جیسے جانا سے گیا۔ ہونا سے ہوا۔ کرنا سے کیا۔

گردان (لانا مصدر سے)

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وُہ لایا اُس نے کھایا	وُہ لائے انہوں نے کھایا	تُو لایا تُو نے کھایا	تم لائے تم نے کھایا	مَیں لایا مَیں نے کھایا	ہم لائے ہم نے کھایا
مؤنث	وُہ لائی اُس نے کھایا	وُہ لائیں انہوں نے کھایا	تُو لائی تُو نے کھایا	تم لائیں تم نے کھایا	میں لائی میں نے کھایا	ہم لائے ہم نے کھایا

۲۔ فعل ماضی قریب

ماضی قریب وُہ فعل ہے جس میں کسی کام کا ہونا قریب کے زمانے میں پایا جائے۔ جیسے وُہ گیا ہے۔ ہم آئے ہیں۔

بنانے کا قاعدہ:- ماضی مطلق صیغہ واحد غائب کے بعد 'ہے' لگاتے ہیں۔

گردان (بیٹھنا مصدر سے)

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وہ بیٹھا ہے	وہ بیٹھے ہیں	تو بیٹھا ہے	تم بیٹھے ہو	میں بیٹھا ہوں	ہم بیٹھے ہیں
مؤنث	وہ بیٹھی ہے	وہ بیٹھی ہیں	تو بیٹھی ہے	تم بیٹھی ہو	میں بیٹھی ہوں	ہم بیٹھے ہیں

۳-ماضی بعید ماضی بعید وہ فعل ماضی ہے جس میں دور کا گزرا ہوا زمانہ پایا جائے۔ جیسے وہ لایا تھا۔ اس نے پانی پیا تھا۔

بنانے کا قاعدہ:۔ ماضی مطلق واحد غائب کے بعد 'تھا' یا 'تھی' زیادہ کرنے سے بنتا ہے۔ جیسے لایا سے، لایا تھا۔

گردان (لانا مصدر سے)

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وہ لایا تھا	وہ لائے تھے	تو لایا تھا	تم لائے تھے	میں لایا تھا	ہم لائے تھے
مؤنث	وہ لائی تھی	وہ لائی تھیں	تو لائی تھی	تم لائی تھیں	میں لائی تھی	ہم لائے تھے

۴-ماضی استمراری ماضی استمراری وہ فعل ماضی ہے جس میں کام کا گزرے ہوئے زمانے میں جاری رہنا پایا جائے۔ جیسے وہ پڑھتا تھا۔

بنانے کا قاعدہ:۔ علامت مصدر دور کرکے آخر میں 'تا، تھا' لگانے سے ماضی استمراری بن جاتا ہے۔ مثلاً لانا مصدر سے 'لاتا تھا'۔

کبھی رہا تھا، لگا کر بھی استمراری کا کام لیا جاتا ہے۔ جیسے وہ پڑھ رہا تھا۔
کبھی ماضی مطلق کے بعد کرتا تھا لگاتے ہیں۔ جیسے وہ پڑھا کرتا تھا۔

گردان (لانا مصدر سے)

جمع متکلم	واحد متکلم	جمع حاضر	واحد حاضر	جمع غائب	واحد غائب	حالت
ہم لاتے تھے	میں لاتا تھا	تم لاتے تھے	تو لاتا تھا	وہ لاتے تھے	وہ لاتا تھا	مذکر
ہم لاتے تھے	میں لاتی تھی	تم لاتی تھیں	تو لاتی تھی	وہ لاتی تھیں	وہ لاتی تھی	مؤنث

۵۔ فعل ماضی شکیہ یا احتمالی

ماضی شکیہ یا احتمالی وہ فعل ماضی ہے جس میں گزرے ہوئے زمانے میں کام کے کرنے یا ہونے میں شک یا احتمال پایا جائے۔ جیسے وہ لایا ہوگا۔ اس نے خط لِکھا ہوگا۔

بنانے کا قاعدہ :۔ ماضی مطلق واحد غائب کے بعد ہوگا۔ لگنے سے بنتا ہے مثلاً لانا سے لایا ہوگا۔ کھانا سے کھایا ہوگا۔

مصدر کی علامت دُور کرکے "تا ہوگا"۔ بڑھانے سے بھی بنایا جاتا ہے۔ مثلاً لِکھنا سے لِکھتا ہوگا۔

بعض اوقات ماضی مطلق کے بعد صرف "ہو" لگاتے ہیں۔ جیسے یہ کام تم نے کیا ہو۔

گردان (لانا مصدر سے)

جمع متکلم	واحد متکلم	جمع حاضر	واحد حاضر	جمع غائب	واحد غائب	حالت
ہم لائے ہونگے ہم لاتے ہونگے	میں لایا ہونگا میں لاتا ہونگا	تم لائے ہوگے تم لاتے ہوگے	تو لایا ہوگا تو لاتا ہوگا	وہ لائے ہونگے وہ لاتے ہونگے	وہ لایا ہوگا وہ لاتا ہوگا	مذکر
ہم لائے ہونگے ہم لاتے ہونگے	میں لائی ہونگی میں لاتی ہونگی	تم لائی ہوگی تم لاتی ہوگی	تُو لائی ہوگی تُو لاتی ہوگی	وُہ لائی ہونگی وہ لاتی ہونگی	وُہ لائی ہوگی وہ لاتی ہوگی	مؤنث

۶۔ ماضی تمنائی یا شرطیہ

ماضی تمنائی یا شرطیہ وہ فعل ماضی ہے جس میں گزرے ہوئے زمانے میں کسی کام کا ہونا شرط یا آرزو کے ساتھ پایا جائے۔ جیسے اگر وہ محنت کرتا تو کامیاب ہو جاتا۔ کاش وہ پڑھتا۔

ے میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یارب کئی دے ہوتے

بنانے کا قاعدہ :۔ ۱۔ علامت مصدر 'نا' دُور کر کے 'تا' لگاتے ہیں۔ مثلاً کھانا سے کھاتا۔ لانا سے لاتا۔

۲۔ ماضی مطلق کے بعد 'ہوتا' زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے کھایا ہوتا۔ لایا ہوتا۔

۳۔ ماضی شکیہ کے آخر سے گا۔ گے۔ گی دُور کرنے سے جیسے لایا ہوگا سے لایا ہو۔

ع کاش وہ آجاتے تو یہ رنج نہ ہوتا

گردان (لانا مصدر سے)

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وہ لاتا وہ لایا ہوتا	وہ لاتے وہ لائے ہوتے	تو لاتا تو لایا ہوتا	تم لاتے تم لائے ہوتے	میں لاتا میں لایا ہوتا	ہم لاتے ہم لائے ہوتے
مونث	وہ لاتی وہ لائی ہوتی	وہ لاتیں وہ لائی ہوتیں	تو لاتی تو لائی ہوتی	تم لاتیں تم لائی ہوتیں	میں لاتی میں لائی ہوتی	ہم لاتے ہم لائے ہوتے

فعل معطوف

فعل معطوف دو فعلوں سے مل کر بنتا ہے۔ جیسے وہ پڑھ کر چلا گیا۔ اُس نے آکر کہا۔ وہ اُٹھا اور دوڑا۔

پہلا فعل معطوف علیہ اور دوسرا فعل معطوف کہلاتا ہے۔

ے جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

؎ آج اس کی ہے نوبت تو کل اس کی ہے باری
بن بن کے یُوں ہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

فعل مضارع مضارع وہ فعل ہے۔ جو موجُودہ اور آیندہ دونوں زمانوں کو ظاہر کرے۔ جیسے وہ پڑھے۔ وہ جائے۔

بنانے کا قاعدہ:۔ مصدر کی علامت 'نا' دُور کرکے آخر میں یائے مجہول لگاتے ہیں۔ جیسے پڑھنا سے پڑھے، لانا سے لائے اور اگر 'نا' دُور کرنے کے بعد یائے مجہول نیچ رہے۔ تو وہی مضارع ہوگا۔ جیسے دینا سے دے۔

؎ چوٹ دِل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو
صدمہ شیشے کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

گردان (لانا مصدر سے)

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکّر	وہ لائے	وُہ لائیں	تو لائے	تم لاؤ	مَیں لاؤں	ہم لائیں
مؤنّث	وہ لائے	وُہ لائیں	تو لائے	تم لاؤ	مَیں لاؤں	ہم لائیں

فعل حال فعل حال وہ فعل ہے۔ جس میں فعل کا واقع ہونا موجُودہ زمانہ میں پایا جائے۔ جیسے وہ کھاتا ہے۔

بنانے کا قاعدہ:۔ ۱۔ مصدر کی علامت 'نا' دُور کرکے 'تا' ، 'ہے' لگاتے ہیں۔ جیسے اُڑنا سے اُڑتا ہے۔

۲۔ ماضی تمنائی کے بعد رہتا ہے لگا کر جیسے کھاتا رہتا ہے۔

۳۔ کبھی مضارع سے بھی فعل حال کا کام لیتے ہیں۔

؎ وُہ بدخُو اور میری داستانِ عشق طولانی — عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

گردان (لانا مصدر سے)

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وہ لاتا ہے	وہ لاتے ہیں	تو لاتا ہے	تم لاتے ہو	میں لاتا ہوں	ہم لاتے ہیں
مؤنث	وہ لاتی ہے	وہ لاتی ہیں	تو لاتی ہے	تم لاتی ہو	میں لاتی ہوں	ہم لاتے ہیں

نوٹ :- ۱- کبھی فعل حال ماضی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مورخ لکھتے ہیں۔

۲- کبھی مستقبل کے لیے استعمال ہوتا ہے

ع
ایسی ہی بیقراری رہی متصل اگر
اے شیفتہ تم آج نہیں بچتے شب تلک

۳- کبھی "ہے" حذف کر دیتے ہیں۔ ع

موت کا اک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

فعل مستقبل فعل مستقبل وہ فعل ہے۔ جس میں کام کا ہونا آیندہ زمانہ میں پایا جائے۔ جیسے وہ پڑھے گا۔ ہم جائیں گے۔

بنانے کا قاعدہ :- فعل مضارع کے بعد "گا" لگاتے ہیں۔ اگر کام کا جاری رہنا پایا جائے تو اسے فعل مستقبل دوامی کہتے ہیں۔ جیسے وہ پڑھتا رہے گا۔

ع جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

گردان (لانا مصدر سے)

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
مذکر	وہ لائے گا	وہ لائیں گے	تو لائے گا	تم لاؤ گے	میں لاؤں گا	ہم لائیں گے
مؤنث	وہ لائے گی	وہ لائیں گی	تو لائے گی	تم لاؤ گی	میں لاؤں گی	ہم لائیں گے

فعل امر فعل امر وہ فعل ہے جس میں کسی کام کرنے کا حکم پایا جائے۔ جیسے سُن۔ دیکھو۔ جاؤ۔

بنانے کا قاعدہ:۔ علامت مصدر "نا" دُور کرنے سے فعل امر رہ جاتا ہے۔ جیسے بیٹھنا سے بیٹھ۔ لکھنا سے لکھ۔ فعل امر میں مذکرّ اور مؤنثّ کے صیغے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ متکلمّ کے صیغے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اپنے آپ کو حکم نہیں دے سکتے۔

گردان

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلمّ	جمع متکلمّ
مذکرّ	وہ لائے	وہ لائیں	تو لایا	تم لاؤ	×	×
مؤنثّ	وہ لائے	وہ لائیں	تو لایا	تم لاؤ	×	×

فعل نہی فعل نہی وہ فعل ہے جس میں کسی کام کے نہ کرنے کا حکم ہو۔ جیسے نہ دیکھ۔ نہ پڑھو۔

قاعدہ:۔ فعل امر سے پہلے "نہ" یا "مت" لگاتے ہیں۔

گردان

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلمّ	جمع متکلمّ
مذکرّ	وُہ نہ لائے وُہ مت لائے	وہ نہ لائیں وہ مت لائیں	تو نہ لایا تو مت لا	تم نہ لاؤ تم مت لاؤ	× ×	× ×
مؤنثّ	وہ نہ لائے وہ مت لائے	وہ نہ لائیں وہ مت لائیں	تو نہ لا تو مت لا	تم نہ لاؤ تم مت لاؤ	× ×	× ×

مجہول افعال

	حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
ماضی مطلق مصدر لانا	مذکر ۱ مؤنث ۲	وہ لایا گیا وہ لائی گئی	وہ لائے گئے وہ لائی گئیں	تو لایا گیا تو لائی گئی	تم لائے گئے تم لائی گئیں	میں لایا گیا میں لائی گئی	ہم لائے گئے ہم لائے گئے
ماضی قریب مصدر مارنا	مذکر ۱ مؤنث ۲	وہ مارا گیا ہے وہ ماری گئی ہے	وہ مارے گئے ہیں وہ ماری گئی ہیں	تو مارا گیا ہے تو ماری گئی ہے	تم مارے گئے ہو تم ماری گئی ہو	میں مارا گیا ہوں میں ماری گئی ہوں	ہم مارے گئے ہیں ہم مارے گئے ہیں
ماضی بعید مصدر پالنا	مذکر ۱ مؤنث ۲	وہ پالا گیا تھا وہ پالی گئی تھی	وہ پالے گئے تھے وہ پالی گئی تھیں	تو پالا گیا تھا تو پالی گئی تھی	تم پالے گئے تھے تم پالی گئی تھیں	میں پالا گیا تھا میں پالی گئی تھی	ہم پالے گئے تھے ہم پالے گئے تھے
ماضی استمراری دیکھنا مصدر	مذکر ۱ مؤنث ۲	وہ دیکھا جاتا تھا وہ دیکھی جاتی تھی	وہ دیکھے جاتے تھے وہ دیکھی جاتی تھیں	تو دیکھا جاتا تھا تو دیکھی جاتی تھیں	تم دیکھے جاتے تھے تم دیکھی جاتی تھیں	میں دیکھا جاتا تھا میں دیکھی جاتی تھی	ہم دیکھے جاتے تھے ہم دیکھے جاتے تھے
ماضی شکیہ مارنا	مذکر مؤنث	وہ مارا گیا ہوگا وہ ماری گئی ہوگی	وہ مارے گئے ہونگے وہ ماری گئی ہونگی	تو مارا گیا ہوگا تو ماری گئی ہوگی	تم مارے گئے ہوگے تم ماری گئی ہوگی	میں مارا گیا ہونگا میں ماری گئی ہونگی	ہم مارے گئے ہونگے ہم مارے گئے ہونگے
ماضی تمنائی مارنا	مذکر ۱ مؤنث ۲	وہ مارا جاتا وہ ماری جاتی	وہ مارے جاتے وہ ماری جاتیں	تو مارا جاتا تو ماری جاتی	تم مارے جاتے تم ماری جاتیں	میں مارا جاتا میں ماری جاتی	ہم مارے جاتے ہم مارے جاتے
فعل حال مجہول پالنا	مذکر ۱ مؤنث ۲	وہ پالا جاتا ہے وہ پالی جاتی ہے	وہ پالے جاتے ہیں وہ پالی جاتی ہیں	تو پالا جاتا ہے تو پالی جاتی ہے	تم پالے جاتے ہو تم پالی جاتی ہو	میں پالا جاتا ہوں میں پالی جاتی ہوں	ہم پالے جاتے ہیں ہم پالے جاتے ہیں
ماضی مستقبل بلانا	مذکر ۱ مؤنث ۲	وہ بلایا جائیگا وہ بلائی جائیگی	وہ بلائے جائینگے وہ بلائی جائینگی	تو بلایا جائیگا تو بلائی جائیگی	تم بلائے جاؤگے تم بلائی جاؤگی	میں بلایا جاؤنگا میں بلائی جاؤنگی	ہم بلائے جائینگے ہم بلائی جائینگی
ماضی مضارع پالنا	مذکر ۱ مؤنث ۲	وہ پالا جائے وہ پالی جائے	وہ پالے جائیں وہ پالی جائیں	تو پالا جائے تو پالا جائے	تم پالے جاؤ تم پالی جاؤ	میں پالا جاؤں میں پالی جاؤں	ہم پالے جائیں ہم پالے جائیں

فعل تام اور فعل ناقص

فعل تام فعل تام وہ فعل ہے جو صرف فاعل سے یا فاعل اور مفعول دونوں سے بات کو مکمل کرے یعنی فعل لازم اور فعل متعدّی فعل تام ہوتے ہیں۔ مثلاً پروین نے خط لکھا۔ ہرن دوڑا۔

فعل ناقص فعل ناقص وہ فعل ہے جو بظاہر فعل تام معلوم ہو لیکن جب تک فاعل کے علاوہ کوئی اور اسم یا صفت ساتھ نہ ملے تو پورا مطلب واضح نہ کرے۔ ایسے افعال کے فاعل کو مبتدا یا اسم کہتے ہیں۔ اور فاعل کے علاوہ اسم یا صفت کو خبر کہتے ہیں۔

افعال کے ساتھ کون کے جواب میں اسم اور کیا کے جواب میں خبر ہوتی ہے مثلاً ارشد بیمار ہے۔ اس میں ارشدؔ اسم بیمار خبر اور ہے فعل ناقص ہے۔

افعال ناقصہ یہ ہیں:-

(ا) ہے۔ ہیں۔ ہو۔ ہوں۔ تھا۔ تھی۔ تھے۔ تھیں۔ سہی۔

(ب) ہونا۔ ہوجانا۔ بننا۔ بن جانا۔ رہنا۔ لگنا۔ نظر آنا۔ پڑنا۔ دکھائی دینا۔ معلوم ہونا۔

مندرجہ بالا میں الف جز کے افعال اور ہونا اور ہوجانا ہمیشہ بطور فعل ناقص استعمال ہوتے ہیں۔ باقی افعال فعل ناقص کے طور بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور فعل تام بھی (۱) ہے اور تھا جب کبھی جزو فعل کا کام دیتے ہیں تو فعل ناقص نہیں ہوتے۔ جیسے وہ لکھتا تھا۔

۲۔ جب ان افعال ناقصہ میں سے کوئی فعل ایک ہی اسم پر پورا ہو تو فعل تام ہوجاتا ہے۔ جیسے مصیبت بن گئی ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

پہلے مصرع میں ہوتی ہے فعل تام ہے اور صبح اور شام اس کے فاعل ہیں۔

لیکن دُوسرے مصرع میں ہوتی ہے۔ فعل ناقص ہے اور عمر اُس کا اسم اور تمام خبر ہے۔

جاوید آج پریشان نظر آتا ہے۔ (فعل ناقص نظر آنا)
آج چاند نظر نہیں آتا۔ (فعل تام " ")
وُہ امتحان میں اوّل رہا۔ (فعل ناقص رہا)
مَیں چار دِن کراچی رہا۔ (فعل تام رہا)

امدادی افعال ایک امدادی فعل وہ فعل ہے۔ جو کسی دوسرے فعل کے ساتھ مل کر مرکب فعل بنائے۔ جیسے اُٹھالینا۔ بنا دینا۔ گر پڑنا۔ سو رہنا۔ ٹوٹ جانا۔ اُبھر آنا۔ کر چکنا۔

اِن میں اُٹھنا۔ بتانا۔ گرنا۔ سونا۔ ٹوٹنا۔ اُبھرنا۔ اصل فعل ہیں اور لینا۔ دینا۔ پڑنا۔ رہنا۔ جانا اور آنا امدادی فعل ہیں۔

امدادی افعال کی مدد سے بے شمار محاورات بن گیے ہیں۔ ان میں سے اکثر افعال ایسے ہیں جو تنہا بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے معنی مختلف ہوتے ہیں۔

امدادی افعال:۔

آنا :۔ اُگ آنا۔ نکل آنا وغیرہ۔

اُٹھنا :۔ چلّا اُٹھنا۔ چیخ اُٹھنا۔ بول اُٹھنا۔

ہونا :۔ آیا ہوتا۔ سُنایا ہوتا۔ سُنا ہوتا۔

ع کچھ ہم سے سُنا ہوتا پھر تم نے کہا ہوتا

ع دِل اس بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے

دینا :۔ سمجھا دینا۔ بنا دینا۔ منا دینا۔ نکال دینا۔

لینا :۔ بُلا لینا۔ رکھ لینا۔ بچا لینا۔ پی لینا۔

جانا :۔ ٹوٹ جانا۔ بگڑ جانا۔ بکھر جانا۔ چلے جانا۔

ڈالنا :۔ مار ڈالنا - کاٹ ڈالنا - چیر ڈالنا -
رہنا :۔ سو رہنا - بیٹھ رہنا - جاتے رہنا -
پڑنا :۔ دکھائی پڑنا - لڑ پڑنا -
چکنا :۔ کر چکنا - لکھ چکنا -

بعض امدادی فعل جاری ہونے یا فاعل کی عادت کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے وُہ آیا کرتا تھا۔ وہ اس طرح رویا کیا۔ وہ بولتا رہا۔ کھاتا رہ۔ روتا رہے گا۔

فاعل اُور فعل کی مطابقت

۱۔ افعال کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمع فاعل کے مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً فاعل مذکر یا مؤنث ہے۔ تو فعل بھی مذکر یا مؤنث ہوگا۔ جیسے مرد آیا۔ عورت روئی۔ مرد آئے۔ عورتیں روئیں۔

۲۔ اگر کسی جملے میں فاعل ایک سے زیادہ ہوں۔ تو فعل کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمع اس اسم کے مطابق ہوگی۔ جو فعل کے زیادہ قریب ہے۔ مثلاً تمام لڑکے اور لڑکیاں چلی گئی ہیں۔ بکریاں اُور گھوڑے خریدے گئے۔

۳۔ اگر ایک سے زیادہ فاعل بصورت واحد ہوں۔ تو فعل ہمیشہ جمع آئے گا۔ جیسے ایک لڑکا اور ایک لڑکی جا رہے تھے۔

۴۔ متعدی افعال میں ماضی مطلق۔ قریب۔ بعید اُور شکیہ میں فعل کی مطابقت مفعول کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ جیسے گھوڑا دیکھا گیا۔ اکبر نے روٹی کھائی۔ لڑکی نے دُودھ پیا۔ عورتوں نے حج کیا۔

۵۔ متعدی بہ دو مفعول میں دوسرے مفعول کے لحاظ سے جیسے حامد نے فقیر کو روٹی دی۔ مَیں نے مزدور کو چھ روپے دئے۔

۶۔ متعدی بہ سہ مفعول میں تیسرے مفعول کے لحاظ سے جیسے :۔

اُس نے محمود کو اسلم سے کتاب دلوائی۔
باقی متعدّی افعال میں فاعل کے مطابق فعل آتا ہے۔
۷۔ تمام افعال میں جمع متکلم کا مذکرّ و مؤنث میں یکساں آتا ہے۔
سوائے ان متعدّی فعلوں کے جن کے فاعل کے ساتھ نے آتا ہے جیسے مذکرّ کے لیے ہم کھاتے تھے۔ اور مؤنث کے لیے بھی ہم کھاتے تھے۔ استعمال ہوگا۔
۸۔ فعل متعدّی میں جب علامت مفعول 'کو' مذکور ہو۔ تو فعل ہمیشہ واحد اور مذکرّ ہوگا۔ جیسے ہم نے اسلم کو دیکھا۔

طائرانہ نظر

۱۔ بناوٹ کے لحاظ سے فعل کی دو قسمیں ہیں:۔
۱۔ فعل مفرد جیسے لکھنا۔ پڑھنا۔
۲۔ فعل مرکب جیسے آنکھ لگنا۔ جگا دینا۔
۲۔ معنوں کے لحاظ سے فعل کی دو قسمیں ہیں:۔
۱۔ فعل لازم جو فاعل تک محدود ہو۔ جیسے ممتاز آیا، اسلم گیا۔
۲۔ فعل متعدّی جس میں فاعل کے علاوہ مفعول کی بھی ضرورت پڑے۔
جیسے مَیں نے روٹی کھائی۔ اُس نے خط لکھا۔
۳۔ فعل معروف۔ وہ فعل ہے جس کا فاعل معلوم ہو۔ جیسے ریل آئی۔ ہم نے کتاب پڑھی۔ میں آئی اور پڑھی فعل معروف ہیں۔
۴۔ فعل مجہول۔ وہ فعل ہے جس کا فاعل معلوم نہ ہو۔ جیسے خط لکھا گیا۔ وہ پالی جاتی تھی۔ میں لکھا گیا اور پالی جاتی تھی۔ فعل مجہول ہیں۔
۵۔ زمانہ کے لحاظ سے فعل کی تین قسمیں ہیں:۔

۱- فعل حال جیسے وہ لکھتا ہے۔
۲- فعل ماضی جیسے اس نے لکھا۔
۳- فعل مستقبل جیسے وہ لکھے گا۔
۴- فعل مضارع وہ فعل ہے جو موجودہ اور آئندہ دونوں زمانوں کو ظاہر کرے۔ مثلاً وہ آئے۔ ہم جائیں۔
فعل امر میں کسی کام کے کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ جیسے کھاؤ۔ دوڑو اور فعل نفی میں کسی کام سے منع کیا جاتا ہے۔ نہ کھاؤ، مت دوڑو۔
۷- فعل ماضی کی چھ قسمیں ہیں:-
(۱) ماضی مطلق (وہ لایا) (۲) ماضی قریب (وہ لایا ہے) (۳) ماضی بعید (وہ لایا تھا) (۴) ماضی استمراری (وہ لاتا تھا) (۵) ماضی شکیہ یا احتمالی (وہ لایا ہوگا) (۶) ماضی تمنائی (وہ لایا ہوتا)
۸- مجہول افعال صیغہ واحد غائب:-
ماضی مطلق (وہ لایا گیا) ماضی قریب (وہ لایا گیا ہے) ماضی بعید (وہ لایا گیا تھا) ماضی استمراری (وہ لایا جاتا ہے۔ ماضی شکیہ (وہ لایا گیا ہوگا) ماضی تمنائی (وہ لایا جاتا) فعل حال (وہ لایا جاتا ہے) مستقبل (وہ لایا جائیگا) مضارع (وہ لایا جائے)
۹- فعل تام- وہ فعل ہے جو صرف فاعل سے یا فاعل اور مفعول دونوں سے بات کو مکمل کرے۔ مثلاً وہ دوڑا۔ فوزیہ نے خط لکھا۔
۱۰- فعل ناقص- وہ فعل کہ جب تک فاعل کے علاوہ کوئی اور اسم یا صفت ساتھ نہ ملے پورا مطلب نہ دے۔ جیسے "ارشد بیمار ہے"۔ ارشد (اسم) بیمار (خبر) ہے (فعل ناقص)
۱۱- افعال ناقص یہ ہیں: (الف) ہے۔ ہیں۔ ہو۔ ہوں۔ تھا۔ تھی۔ تھے۔ تھیں۔ سہی۔ (ب) ہونا۔ ہوجانا۔ بننا۔ بن جانا۔ رہنا۔ لگنا۔ نظر آنا۔ دکھائی دینا۔ معلوم ہونا۔

سوالات

1 ۔ فعل ماضی کی اقسام مع تعریف و امثلہ تحریر کیجئے ۔

2 ۔ فعل لازم اور فعل متعدّی کا فرق مثالوں سے واضح کیجئے ۔

3 ۔ افعال ذیل کی تعریف کرو ۔ اور ایک ایک مثال دو :۔

فعل مضارع ۔ فعل امر ۔ ماضی استمراری ۔ فعل حال مجہول ۔ ماضی قریب ۔

4 ۔ پالنا مصدر سے فعل حال معروف ، ماضی تمنائی معروف اور ماضی بعید مجہول کی گردانیں کرو ۔

5 ۔ کھانا مصدر سے مندرجہ ذیل صیغے بناؤ :۔

ماضی قریب واحد حاضر مؤنّث + مضارع جمع متکلّم مذکّر + شکیہ جمع حاضر مؤنّث ۔ مستقبل جمع متکلّم مؤنّث ۔ فعل حال مجہول واحد غائب ۔ فعل امر ۔ جمع حاضر مذکّر ۔ شرطیہ جمع غائب مذکّر ۔ فعل حال واحد حاضر مؤنّث ۔

6 ۔ لکھنا مصدر سے ماضی قریب مجہول اور مضارع معروف کی گردانیں لکھو ۔

7 ۔ فعل تام اور فعل ناقص کا فرق مثالوں سے واضح کرو ۔

8 ۔ مندرجہ ذیل کے افعال اور صیغوں کے نام تحریر کیجئے :۔

وہ کھائے ۔ ہم جاتے تھے ۔ وہ نہا رہی تھی ۔ تو جائے گی ۔ وہ پائے جائینگے ۔ وہ لکھتا ہوگا ۔ وہ آجاتے ۔ مت دوڑو ۔ میں گاتی تھی ۔ وہ مارا گیا ہوگا ۔

9 ۔ فعل کی مطابقت پر بحث کیجئے ۔

10 ۔ مندرجہ ذیل عبارت میں فعل کی قسمیں بتاؤ ۔

غالباً یہ سمجھا جائے گا کہ ہم ان جملوں کو سُن کر یا تو دروازہ کی جانب دوڑے ہونگے یا وحشیانہ تندی کے ساتھ گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیا ہوگا ۔ ورنہ بیہوش تو ضروری ہو گیے ہوں گے ۔ مگر نہیں ان میں سے کوئی سی حالت بھی طاری نہ ہوئی ۔ اور اس کی کوئی ظاہری وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ پارٹی کا ہر فرد جس جگہ کھڑا تھا ۔ یونہی بے حس و حرکت کھڑا رہا ۔ گویا کوئی سنجیدہ واقعہ نہ ہوا تھا ۔

باب ۸

اِسم فاعل اور فاعل
اِسم مفعول اور مفعول

اِسم فاعل اِسم فاعل وہ اِسم نکرہ مشتق ہے جو اس چیز یا شخص کو ظاہر کرتا ہے جس سے کوئی کام سرزد ہو۔ جیسے کھانے والا، دوڑنے والے۔ لکھنے والی۔ گانے والیاں۔

اے جہاں اے روشیں تازہ بدلنے والے — نت نئی چال نئی ڈھال سے چلنے والے
موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنے والے — روز ایک سوانگ نیا بھر کے نکلنے والے
آج کچھ اور ہے اور بھی کچھ شان تری
ایک سے ایک نہیں ملتی کہیں آن تری

اِن اشعار میں بدلنے والے، چلنے والے، ڈھلنے والے، نکلنے والے، اسم فاعل ہیں

اسم فاعل کی قسمیں اِسم فاعل کی قسمیں دو ہیں۔

(۱) اِسم فاعل سماعی (۲) اسم فاعل قیاسی

۱۔ **اِسم فاعل سماعی**:۔ وہ اسم ہے جو کسی خاص قاعدے سے نہ بنایا جائے بلکہ جس طرح اہل زبان سے سنا گیا ہو اسی طرح استعمال ہو۔ ایسے اسم فاعل اپنے معنوں سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ڈاکو، لیٹرا، راہزن، کھلاڑی پیرا۔ گڈریا۔ چرواہا۔ کوچوان، پیراک، رکھوالا۔

۲ - اِسم فاعل قیاسی :- وہ اِسم ہے جو کسی مقررہ قاعدے کے مطابق بنا ہو جیسے پڑھنا سے پڑھنے والا لکھنا سے لکھنے والا ۔

اِسم فاعل بنانے کے قاعدے

۱- مصدر کے آخری الف کو یائے مجہول (ے) سے بدل کر لفظ " والا " بڑھا دیتے ہیں ۔ جیسے لکھنا سے لکھنے والا اور جمع کی حالت میں لکھنے والے اسی طرح پڑھنا سے پڑھنے والی اور پڑھنے والیاں ۔

۲- بعض اوقات دو لفظ مل کر اِسم فاعل کے معنی دیتے ہیں ۔ جیسے دولت والا ۔ دودھ پیتا ۔

۳- آخری الف کو گرا کر " ہار " لگانے سے ۔ جیسے ہونا سے ہونہار ۔

۴- مختلف حروف بڑھا کر جیسے پیٹو ۔ جھگڑالو ۔ ڈاکیا ۔ بجاری ۔ کھلنڈرا ۔ گاڑی بان ۔ شرمیلا ، اڑیل ، ملنسار ۔ خزانچی ۔

۵- اِسم اور فعل امر مل کر جیسے گھڑی ساز (گھڑی اِسم ۔ ساز امر) چِٹھی رساں ۔ برتن ساز ۔

۶- بعض پیشے اصلی صورت میں اِسم فاعل کے معنی دیتے ہیں ۔ دھوبی ، جلاہا ۔ بڑھئی ۔

۷- فارسی اِسم فاعل بھی اردو میں مستعمل ہیں ۔ جیسے چرندہ ، پرندہ ، زرگر ماہی گیر ۔ کاشت کار ۔ توپچی ، غمناک ، پاسبان ، جاندار ، تاجور ، غریب نواز ، پیامبر ، عقلمند ، حملہ آور ، نکتہ چین ، دغاباز وغیرہ ۔

۸- دو اِسم ملا کر جیسے نیک دل ، خود غرض ۔ نیاز کیش ۔

۹- عربی اِسم فاعل جو حسب ذیل اوزان پر آتے ہیں ۔

فَاعِل :- قاتل ۔ حاکم ۔ رازق ، عالم ، طالب ، غالب ، عابد ، زاہد ، ناظر ، شاکر ، صابر ، حامی ۔

مُفعِلُ :- موجد۔ مجرم۔
مُفَعِّل :- مصنّف۔ مصوّر۔ مدرّس۔
مُتَفَاعِلُ :- متوازی۔ متصادم۔ متجاوز۔
مُفتَعِلُ :- معتبر۔ معتمد۔ مشتہر۔
مُفَاعِلُ :- محاسب۔ ملازم۔ مسافر۔ مجاہد
مُنفَعِلُ :- مندرج۔ منقلب۔ منعکس۔
فَعِیل :- کریم۔ رفیق۔ لطیف۔ خلیل۔ رحیم۔

نوٹ :- عربی اِسم فاعل کی صورت میں "م" مضموم اور آخری حرف سے پہلا حرف مکسور ہوتا ہے۔

فاعل کسی کام کے کرنے والے کو فاعل کہتے ہیں۔ مثلاً۔ اسلم نے خط لکھا۔ اس فقرے میں لکھنے کا کام اسلم سے سرانجام ہوا ہے۔ چنانچہ اسلم فاعل ہے اور لکھا فعل۔ لڑکا دوڑنے والا ہے۔ اِس فقرے میں لڑکا فاعل ہے۔

اِسم فاعل اَور فاعل کا فرق

(۱) فاعل کسی کام کے کرنے والے کو کہتے ہیں اور یہ اِسم جامد ہوتا ہے یعنی کسی اسم سے مشتق نہیں ہوتا۔ مثلاً اکبر نے کتاب پڑھی۔ لڑکی نے کھانا کھایا۔ ان جملوں میں اکبر اور لڑکی فاعل ہیں جن سے کوئی کام سرانجام ہوا ہے۔ لیکن یہ اسمار کسی اَور لفظ سے نہیں نکلے۔ چنانچہ فاعل نہ خود کسی مصدر سے نکلتا ہے نہ اس سے کوئی کلمہ بنتا ہے۔ اس کے برعکس اسم فاعل مشتق ہوتا ہے۔ یعنی کسی مصدر سے بنتا ہے۔ مثلاً یہ کہیں کہ پڑھنے والے نے کتاب پڑھی۔ کھانے والی نے کھانا کھایا تو پڑھنے والا اور کھانے والی اسم فاعل ہونگے کیونکہ یہ پڑھنا اور لکھنا سے مشتق ہیں۔

گویا اسم فاعل ہمیشہ کسی مصدر سے مشتق ہوتا ہے۔ لیکن فاعل مشتق نہیں ہوتا بلکہ اسم معرفہ یا اسم نکرہ ہوتا ہے۔

۲۔ اسم فاعل عموماً صرف میں آتا ہے۔ مگر فاعل نحو میں۔

اسم فاعل اور صفت مشبہ میں فرق اسم فاعل میں صفت عارضی ہوتی ہے۔ مثلاً قاتل۔ تو لیندہ۔ پڑھنے والا۔ لیکن صفت مشبہ مستقل یعنی ہمیشہ کا ساتھ دینے والی ہوتی ہے۔ مثلاً کریم دانا۔ خلیق۔ تاہم اکثر صفات مشبہ اسم فاعل بھی ہیں۔

فاعل کی پہچان فاعل کی پہچان یہ ہے کہ جملے میں فعل لازم کے ساتھ "کون" اور فعل متعدی کے ساتھ کس نے لگا کر سوال کریں تو جواب فاعل ہوتا ہے مثلاً

اسلم دوڑا (دوڑا فعل لازم ہے)

سوال کریں کون دوڑا ؟ جواب ہوگا اسلم (فاعل)

اصغر نے چائے پی۔ کس نے چائے پی ؟ اصغر نے۔ (اصغر فاعل)

اسم مفعول اور مفعول

اسم مفعول اسم مفعول وہ اسم مشتق ہے جو اس ذات پر دلالت کرتا ہے جس پر کوئی فعل واقع ہو مثلاً۔ کھایا ہوا۔ لکھی ہوئی۔ پڑھا ہوا۔

اسم مفعول کی دو قسمیں ہیں (۱) اسم مفعول سماعی (۲) اسم مفعول قیاسی

اسم مفعول سماعی:۔ وہ اسم مفعول ہے جو کسی خاص قاعدے کے مطابق نہ بنا ہو اور جیسے اہل زبان بولتے ہوں ویسے ہی استعمال کیا جائے جیسے چاہتا (پسندیدہ) بیاہتا (بیاہی ہوئی)

اسم مفعول قیاسی:۔ وہ اسم مفعول ہے جو کسی خاص قاعدے کے مطابق بنایا

جائے مثلاً لکھنا سے لکھا ہوا۔ پڑھنا سے پڑھی ہوئی وغیرہ۔

اسم مفعول بنانے کے قاعدے

۱۔ ماضی مطلق کے بعد تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے لحاظ سے ہوا۔ ہوئی۔ ہوئے لگا کر مثلاً پڑھا ہوا۔ لکھی ہوئی۔ دیکھے ہوئے۔

۲۔ کبھی صرف ماضی مطلق بھی۔ اسم مفعول کے معنی دیتا ہے مثلاً منہ سے نکلی بات واپس نہیں آتی۔ یہاں نکلی ہوئی مراد ہے۔

۳۔ کبھی کبھی ماضی مطلق کی تکرار سے بھی اسم مفعول کے معنی لیے جاتے ہیں جیسے بیٹھے بیٹھے وہ تھک گیا ہے۔

۴۔ فارسی اسم مفعول بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ جو بالعموم ماضی مطلق کے بعد "ہ" کے اضافے سے بنتے ہیں۔ مثلاً گذشتہ، نوشتہ، پرورده، پختہ، کشتہ وغیرہ

۵۔ فارسی اسمائے مفعول ترکیبی بھی اردو میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً خانہ زاد۔ خون آلود، خدا داد، گرفتار، بریاں، درد آمیز۔

۶۔ عربی اسمائے مفعول بھی اردو میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔

مَفعُول کے وزن پر:۔ مظلوم۔ محروم۔ مقتول۔ منقول۔

مَفعُولہ کے وزن پر:۔ مخدومہ۔ مظلومہ۔ ممدوحہ۔

مُفَعَّل کے وزن پر:۔ مکرّم۔ معظّم۔ مقدّم

مُفعِل کے وزن پر:۔ ملزم۔ مخبر۔

مفعول | جس چیز یا شخص پر کوئی فعل واقع ہو اُسے مفعول کہتے ہیں مثلاً اقبال نے کتاب پڑھی۔ اس جملے میں پڑھنے کا کام کتاب پر ہوا ہے، اس لیے کتاب مفعول ہے۔

پہچان:۔ فعل متعدی کے ساتھ کیا۔ کس کو۔ کس سے۔ لگا کر سوال کریں تو جواب

میں مفعول آتا ہے۔ اقبال نے روٹی کھائی۔ کیا کھایا؟ روٹی (مفعول)

مفعول کی قسمیں

اردو میں مفعول کی پانچ قسمیں ہیں۔

۱۔ مفعول بہ وہ کلمہ ہے جس پر فعل واقع ہو۔ جیسے عزیز نے قلم خریدا۔ قلم مفعول بہ ہے۔ بعض اوقات دو مفعول ہوتے ہیں مثلاً میں نے اسلم کو روپیہ دیا۔ اسلم اور روپیہ مفعول ہیں۔

۲۔ مفعول لہٗ وہ کلمہ ہے جو فعل کے سبب کے طور پر واقع ہوا ہو مثلاً لڑکا استاد کی تعظیم کو اٹھا۔ یہاں اُٹھنے کا سبب تعظیم ہے۔ فعل کے ساتھ کیوں لگا کر پوچھیں تو جواب میں مفعول لہٗ آتا ہے۔ کیوں اُٹھا۔ تعظیم کے لیے۔ عابد کپڑا خریدنے بازار گیا۔ کیوں گیا؟ کپڑا خریدنے کے لیے

۳۔ مفعول مطلق جب فعل کے ساتھ اس کا مصدر یا حاصل مصدر آئے تو اسے مفعول مطلق کہتے ہیں۔ مثلاً خالق سو گز کی دوڑ دوڑا۔ وہ خوب کھیل کھیلا۔ اس نے بڑی مار ماری۔ یہاں دوڑ کھیل اور مار مفعول مطلق ہیں۔

۴۔ مفعول فیہ یہ ظرف مکان یا ظرف زمان پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے وہ دکان پر بیٹھا ہے۔ دکان مفعول فیہ ہے۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی حرف آتا ہے۔

۵۔ مفعول معہٗ جس چیز کے ساتھ فعل واقع ہوا ہو۔ اُسے مفعول معہٗ کہتے ہیں۔ مثلاً میں نے لاٹھی سے سانپ مارا۔ اس میں لاٹھی مفعول معہ، یا مفعول منہٗ ہے۔

اِسم مفعول اَور مفعول کا فرق

۱- جس چیز یا شخص پر کوئی فعل واقع ہو۔ اسے مفعول کہتے ہیں۔ مثلاً ناصر نے خط لکھا۔ اس میں خط مفعول ہے۔ اور لِکھنا فعل کے تعلق سے لِکھا ہوا" اسم مفعول ہوگا۔ مثلاً لکھا ہوا خط کہاں رکھا ہے ؟

۲- اِسم مفعول عام طور پر مشتق ہوتا ہے۔ مگر مفعول مشتق نہیں ہوتا۔

۳- اِسم مفعول متعدّی مصدروں سے بنتا ہے۔ لازم مصدروں سے نہیں بنتا کیونکہ لازم مصدروں سے جو فعل بنتے ہیں وہ صرف فاعل کو چاہتے ہیں۔ ان کا مفعول نہیں ہوتا۔

۴- اسم مفعول عام ہوتا ہے اور مفعول خاص۔

اِسم حالیہ اور اِسم مفعول میں فرق

اِسم حالیہ اور اِسم مفعول دونوں ماضی مطلق کے بعد "ہوا" لگانے سے بنتے ہیں لیکن جب یہ الفاظ اِسم کی جگہ استعمال ہوں تو اِسم مفعول ہونگے اور اسم کے ساتھ اس کی حالت بیان کرنے کے لیے آئیں تو اِسم حالیہ مثلاً تھکا ہوا۔ لیٹا ہوا اِسم مفعول ہیں مگر " بچہ لیٹا ہوا پایا گیا " میں 'لیٹا ہوا' اِسم حالیہ ہے۔

اِسم حالیہ کسی اِسم کی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اسم مفعول کسی اِسم کی حالت کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ کسی اسم کی بجائے استعمال ہوتا ہے۔

طائرانہ نظر

اِسم فاعل اور فاعل: ۱- اِسم فاعل مشتق ہوتا ہے۔ مثلاً لکھنا سے لِکھنے والا۔ لیکن مفعول اِسم جامد ہوتا ہے۔ مثلاً اکبر نے خط لکھا" میں اکبر کسی

مصدر سے نہیں نکلا۔ (۲) اسم فاعل عموماً صرف میں آتا ہے مگر فاعل نحو میں۔
اِسم مفعول اور مفعول ۱۔ ا۔ جس پر کوئی فعل واقعہ ہوا سے مفعول کہتے ہیں۔ مثلاً اسلم نے کتاب پڑھی۔ کتاب مفعول ہے۔ لیکن پڑھنا سے پڑھی ہوئی اِسم مفعول ہے (۲) اسم مفعول مشتق ہوتا ہے لیکن مفعول مشتق نہیں ہوتا اسم مفعول عام ہوتا ہے۔ اور مفعول خاص۔

سوالات

۱۔ اِسم فاعل سے کیا مراد ہے۔ اس کی کتنی قسمیں ہیں ؟
۲۔ اِسم فاعل اور فاعل کا فرق واضح کیجئے۔
۳۔ اِسم مفعول اور مفعول کا فرق تحریر کیجئے۔
۴۔ اِسم فاعل اور صفت مشبہ اور اسم مفعول اور اسم حالیہ میں کیا فرق ہے
۵۔ مفعول کسے کہتے ہیں۔ اس کی کتنی قسمیں ہیں مثالیں دیجئے۔

یادداشتیں

باب ۹

حُروف

حرف حرف وہ کلمہ ہے جو بولنے اور لکھنے میں اکیلا خود کچھ معنی نہ دے لیکن دوسرے الفاظ کے ساتھ مِل کر کلام کو موزوں بنا دے اور مطلب واضح کر دے

حروف جار عربی زبان میں چند حروف جو ، سے ، میں ، پر ، مانند ، تک ، واسطے ، ساتھ وغیرہ کے معنی دیتے ہیں حروف جار کہلاتے ہیں ۔ اس لیے کہ جَر کسر کو کہتے ہیں ۔ اور جن الفاظ پر وہ حروف داخل ہوتے ہیں ۔ ان کے حرف آخر کو مکسور کر دیتے ہیں ۔ جیسے مِنَ اللّٰہِ میں مِنْ حرف جار ہے اور آخری حرف مکسور ہے ۔ فارسی اور اُردو میں حروف جار کا یہ عمل نہیں ہے ۔

جر کھینچنے کو بھی کہتے ہیں ۔ اور حروف جار فعل یا شبہ فعل کے معنوں کو کھینچ کر مجرور سے ملاتے ہیں ۔ ان کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے ۔ کہ حروف جار وہ حروف ہیں ۔ جو کسی اسم ، ضمیر یا صفت کا تعلق فعل کے ساتھ پیدا کرتے ہیں ۔ مثلاً وہ صبح سے شام تک کھیلتا رہا ۔ میں ، سے اور تک حروف جار ہیں ۔ جن اسموں کے بعد حروف جار واقع ہوتے ہیں ان کو مجرور کہتے ہیں ۔ مثلاً گھر میں میز پر ۔ میں ' میں ' اور ' پر ' حروف جار ہیں اور گھر اور میز مجرور ہیں ۔

حروف جار کو حروف ربط بھی کہتے ہیں ۔ یہ مندرجہ ذیل کے بعد آتے ہیں ۔

۱ ۔ اِسم کے بعد جیسے عمّار سے کہو ۔

۲ ۔ صفت کے بعد جیسے بدے بچو ۔

۳۔ ضمیر کے بعد جیسے ان سے ملو۔
۴۔ فعل کے بعد جیسے اس کے سننے میں فرق ہے۔

حروف جار مندرجہ ذیل ہیں:۔

میں۔ سے۔ کو۔ تک۔ تلک۔ پر۔ پہ۔ اُوپر۔ نیچے۔ آگے۔ پیچھے۔ بیچ۔ درمیان۔ اندر۔ سمیت۔ واسطے۔ ساتھ۔ لیے۔ بے۔ بن۔ نزدیک۔ جز۔ بجز۔ سوا۔ بدول۔ علاوہ۔ باہر۔ بعد۔ پیش۔ قبل۔ جانب۔ بجائے۔ نے۔

۲۔ حروف عطف

وہ حروف ہیں جو دو اسموں یا دو جملوں کو ملاتے ہیں پہلے اِسم یا جملہ کو معطوف علیہ اور دوسرا اِسم یا جملہ کو معطوف کہتے ہیں۔

دوات اور قلم لاؤ (دوات معطوف علیہ اور حرف عطف۔ قلم معطوف)

حروف عطف یہ ہیں:۔

اور۔ و۔ پھر۔ کر۔ کے۔

۱۔ محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

۲۔ قناعت نہ کر عالم رنگ و بُو پر
چمن اُور بھی آشیاں اور بھی ہیں

۳۔ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا۔

۴۔ پہلے اصغر آیا پھر سلیم۔

حروف علّت

وہ حروف ہیں جو کسی بات کا سبب ظاہر کریں۔ جیسے کہ۔ کیونکہ، اس لیے، تاکہ، پس، کہ، تا، اس واسطے کہ، سو۔

۱۔ ع کر و کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے۔

۲۔ ؎ ایک سے جب دو ہوئے تو لطف یکتائی نہیں
اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھچوائی نہیں

۳۔ کھایا پیا کرو تاکہ صحت اچھی ہو۔

۴۔ اس نے زیادہ محنت نہ کی اس لیے فیل ہوگیا۔

حروفِ اضافت وہ حروف ہیں جن سے دو کلموں میں لگاؤ یا تعلق پایا جائے جیسے کا، کے، کی،

شمیم کی کتاب۔ ممتاز کا کھلونا۔ شہناز کے جوتے

حروفِ تردید وہ حروف ہیں جو کسی کو رَد کرنے کے موقع پر بولے جائیں جیسے نہ، خواہ، چاہے۔ یا، یا تو

ع نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

ع پُوچھا سودا سے میں اک روز کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں

حروفِ اضراب وہ حُروف ہیں جو ایک چیز کو دوسری چیز پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ اور کہ حروف اضراب ہیں۔

۱۔ ع وہ نہیں ہم کہ کریں خوں کا دعویٰ تجھ سے
بلکہ پُوچھے گا خُدا بھی تو مکر جائیں گے (ذوقؔ)

۲۔ یہ کتا نہیں بلکہ بھیڑیا ہے۔

حروفِ استثنیٰ وہ حروف ہیں جو ایک کلمے یا جملے کو دوسرے کلمے یا جملے سے جُدا کریں۔ وہ یہ ہیں:۔

سوا۔ ماسوا۔ جز۔ بجز۔ لیکن۔ علاوہ۔ بدوں۔ بن۔ الّا۔ بغیر۔

ع زائران کعبہ سے اقبالؔ یہ پُوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

حروفِ استدراک وہ حروف ہیں۔ جو دو جملوں کے درمیان آتے ہیں۔ اور پہلے جملے کے شک وشبہ کو دُور کرتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

پر۔ مگر۔ الّا۔ لیکن۔ سو۔ البتہ۔ مگر ہاں۔ ولیکن۔

۱- کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا۔
۲- ہے انسان صانع قدرت کا اک صندوق سربستہ

۳- ع ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا
۴- س شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

حروف استفہام

وہ حروف ہیں جو کوئی بات دریافت کرنے کے موقع پر بولے جائیں۔ جیسے:۔

کیا۔ کیوں۔ کس واسطے۔ کیسے۔ کس لیے۔ آیا۔ کاہے کو۔ کیونکر۔ کس طرح۔

۱- س یارب مجھ کو زمانہ مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں (غالبؔ)

۲- س کیوں اتنا گرانبار ہے جو رختِ سفر بھی
اے راہ رو ملکِ عدم! اٹھ نہیں سکتا (ذوقؔ)

۳- س تیرے رخسار و گیسو کو بتا تشبیہ دوں کیونکر
نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہے سنبل میں بو ایسی

۴- ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے (غالبؔ)

۵- س کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھنا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

حروف شرط و جزا

وہ حروف ہیں جو شرط کے موقع پر بولے جائیں جیسے اگر۔ جو۔ جب۔ جس وقت۔ جس دم۔ چونکہ۔ جو کہ۔ جبکہ۔ ورنہ۔ وگرنہ۔ گرچہ۔ ہرچند۔ جوں جوں۔ بسکہ۔ گو۔ گو کہ۔ ازبسکہ۔ تاوقتیکہ۔ جب تک۔

جس جملے میں حرفِ شرط آتا ہے۔ اُسے شرط کہتے ہیں۔ اور دوسرے

متعلقہ جملے کو جو شرط کے جواب میں آتا ہے جزا کہتے ہیں۔ تو۔ سو۔ جب،
تب حروف جزا ہیں۔

اگر محنت کروگے تو کامیاب ہوگے
شرط جزا

۱۔ گر وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے
۲۔ سو اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے
۳۔ سو گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یُوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا (غالبؔ)
۴۔ گو بسکہ دُشوار ہے ہر کام کو آسان ہونا
۵۔ سو گو نازنیں کہنے سے بُرا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی
۶۔ جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں۔

حروفِ ندا وہ حروف ہیں جو پکارنے کے موقع پر بولے جائیں۔ جیسے
اے۔ ارے۔ ابے۔ اے۔ ہوت۔ ای او۔ ارے۔ او۔ او
میاں۔ ابے او۔ الف (ا) یا

ان میں ارے۔ ارے او۔ ابے۔ ابے او حقارت کے لیے بولے جاتے
ہیں۔ جیسے ابے بے وقوف۔

۱۔ لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خُدایا میری
(خُدایا میں الف)
۲۔ ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں
۳۔ دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب

جس اسم کو پکارا جائے اُسے منادی کہتے ہیں۔ ندا پہلے آتا ہے اور

منادیٰ بعد ہیں۔

حروفِ ندبہ و تاسّف وہ حروف ہیں۔ جو افسوس کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

ہائے۔ ہائے۔ ہائے رے۔ وائے۔ ہے۔ آہ۔ اُف۔ افسوس۔ حیف۔ دریغا۔ ہیہات۔ وامصیبتا۔ واحسرتا۔ اُف۔ صد افسوس۔ صد حیف۔ آہ۔

۱۔ ؎ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

۲۔ ؎ واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
مجھ کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

۳۔ ہے ہے مرا پھول لے گیا کون

حروفِ انبساط وہ حروف ہیں۔ جو خوشی کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔ جیسے آہا۔ آہاہا۔ واہ۔ واہ وا۔ سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔ بارک اللہ۔ چشم بد دُور۔ آخاہ۔ خوشا۔ اوہو۔

۱۔ آہاہا۔ کیسا سہانا موسم ہے۔

۲۔ واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا

۳۔ کھلے ہیں کیسے رنگین گل آہاہا اور ہو ہو ہو

۴۔ سبحان اللہ کیا دماغ پایا ہے۔

حروفِ بیان وہ حروف ہیں۔ جو کسی بات کو واضح کرنے کے لیے دو جملوں کے درمیان آئیں۔ جیسے :۔

"کہ"۔ ۱۔ ؏ کیا سبب ہے کہ ہے دُنیا میں تیرا نام بڑا

؎ جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۲۔ ؎ عطا ایسا بیاں مجھ کو ہُوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں (اقبالؔ)

۳- آپ جانتے ہیں کہ میں ان کا خیر خواہ ہوں

۴- س
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں (غالبؔ)

حروف تاکید وہ حروف ہیں، جو تاکید کے موقع پر بولے جائیں۔ مثلاً۔ ضرور۔ بالضرور۔ اصلا۔ زنہار۔ ہرگز۔ بالکل۔ خود۔ آپ۔ کبھی۔ سب کے سب۔ بے شک۔ سراسر۔ بھر۔

حروف توبہ وہ حروف ہیں۔ جو پناہ مانگنے اور کسی کام سے باز رہنے کا اقرار کرتے وقت بولے جاتے ہیں۔

توبہ۔ توبہ توبہ۔ الحذر۔ الاماں الاماں۔ معاذ اللہ۔ نعوذ باللہ۔ عیاذاً باللہ۔ الحفیظ۔

۱- ع
وہ لُو کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں

۲- توبہ توبہ کس قدر سخت گرمی ہے۔

حروف تنبیہہ وہ حروف ہیں۔ جو کسی کو دھمکانے یا خبردار کرنے کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔ مثلاً دیکھ۔ ہیں۔ ہیں ہیں۔ ہوں۔ خبردار۔ دیکھنا۔ دیکھو۔ خیر سنو۔ سُن۔ سنو۔ سنو تو سہی۔ کیا۔

۱- ع
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گُل

۲-
ہیں ہیں سنبھل کے کہنا یہ گستاخی کیسی

۳- ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

۴- س
اے ذوقؔ دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے کافر لگی ہوئی

۵- ع
سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

۶- ع
میری سُنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

حروف ایجاب وہ حروف ہیں جو جواب یا کسی امر کے اقرار کے موقع پر

بولے جائیں۔ مثلاً ہاں۔ جی۔ بھلا۔ اچھا۔ اچھا جی۔ بہت اچھا۔ کیوں نہیں۔ درست۔ بجا۔ واقعی۔ ٹھیک۔

۱۔ جی ہاں، اب ایسا ہی ہو گا۔

۲۔ کیا آپ میرے ساتھ آئیں گے۔ کیوں نہیں؟

۳۔ جو کچھ آپ نے کہا۔ بالکل بجا اور درست ہے۔

حروفِ حصر و خصوصیّت وہ حروف ہیں۔ جو اسم یا فعل کے ساتھ مل کر کوئی خصوصیّت پیدا کریں۔ مثلاً بھی۔ ہی۔ ہر۔ صرف۔ محض۔ اکیلا۔ تنہا۔ فقط۔ بس۔ خالی۔ نِرا۔ یہی۔ تو۔

۱۔ ع اور بھی غم ہیں زمانے میں محبّت کے سوا

۲۔ خالی سفارش کس کام کی۔

۳۔ میں اکیلا یہ کام کر سکتا ہوں۔

حروفِ تعجّب وہ حروف ہیں۔ جو اظہارِ تعجّب کے لیے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً آہا۔ اوہ۔ اُف رے۔ لاحول ولا قوۃ۔ حاشا و کلّا۔ اللہ اللہ۔ اللہ اکبر۔

۱۔ ؎ چین بر جبیں قریب جو وہ شیر نر گیا
اللہ رے رُعب حق پسر سعد ڈر گیا

۲۔ اوہو کتنی دیر ہو گئی۔

حروفِ تشبیہ وہ حروف ہیں۔ جو مشابہت کے لیے استعمال ہوں۔ مثلاً سا۔ ایسا۔ جیسا۔ ویسا۔ جوں۔ بعینہٖ۔ مانند۔ طرح۔ گویا۔ یوں۔ ہوبہو۔ آسا۔

؎ ہوبہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

حروفِ نفرت مثلاً لعنت۔ تف۔ ہش۔ دُر دُر۔ پھٹکار۔ خُدا کی مار۔

حروف تحقیق | مثلاً بے شک - بلا شبہ - بلا شک - لامحالہ - قطعاً - یقیناً - لاجرم - ضرور - بے گمان -

حروف مناجات | مثلاً ناگہاں - ناگاہ اچانک - دفعتہً - یک لخت - اتفاقاً -

ع گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہ دل کو اپنے قرار ہے -

حروف تحسین | مثلاً آفریں - شاباش - خوب - مرحبا - احسنت - زہے -

طائرانہ نظر

حروف جار :- وہ حروف ہیں - جو کسی اسم ضمیر یا صفت کا تعلق فعل کے ساتھ پیدا کرتے ہیں - مثلاً گھر میں - شہر تک - دور سے (میں - تک - سے حروف جار ہیں)

حروف جار یہ ہیں :-

ہیں - سے - تک - پر - نیچے - آگے - بیچ - درمیان - اندر - ساتھ - لیے جز - واسطے - سوا - علاوہ - سمیت وغیرہ -

حروف کی دیگر قسمیں :- علت - اضافت - تردید - استثنا - شرط - تنبیہہ - تاکید - ندا - ندبہ - ایجاب - تعجب - انبساط - تشبیہہ - بیان - نفرت - آفرین - تحقیق وغیرہ -

---

سوالات

1 - حروف جار کی تعریف کرو - اور مثالیں دو -

2 - میں ، کن کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے - مثالوں سے وضاحت کریں

3 - ذیل کے جملوں میں "سے" کن معنوں میں استعمال ہوا ہے :-

۱- جھوٹ سے آدمی ذلیل ہوتا ہے ۔

۲- میں نے اشرف سے کہا ۔

3- اُس نے چاقو سے شاخ کاٹی ۔

۴- وہ نسیم سے ذہین ہے ۔

4 - مندرجہ ذیل کو فقروں میں استعمال کرو ۔
تک - آگے - اندر - جز - سمیت - علاوہ ۔

5 - گرامر میں کیا ہیں :-
شاباش - مگر - سبحان اللہ - وائے - جزاک اللہ

6 - ذیل کے حروف فقروں میں استعمال کریں ۔
آہ - یونہی - چنانچہ - اگرچہ - ہُو بہُو - اُف - واہ وا ۔

7 - مندرجہ ذیل کی تعریف کریں - اور مثالیں دیں :-
حروف ندبہ - حروف عطف - حروف تشبیہہ - حروف تعجّب - حروف استثنا ۔

باب ۱۰

مُرکبّات

دو یا دو سے زیادہ کلمات کے مجموعے کو کلام یا مرکب کہتے ہیں۔ جیسے میرا قلم۔ زید کی کتاب۔ میرا قلم ٹوٹ گیا۔ اسلم نے کتاب خریدی۔ خوبصورت پھول۔ گلاب کا پھول خوبصورت ہوتا ہے۔ دس کتابیں۔ بت کدہ۔ فیصل آباد۔ ناصر فیصل آباد گیا۔

مرکب کی قسمیں

۱۔ مرکب ناقص ۲۔ مرکب تام۔

مرکب ناقص وہ مرکب ہے جس سے سننے والا پورا مطلب نہ سمجھ سکے اور کسی اور بات کا منتظر رہے۔ جیسے ناصر کا قلم۔ سفید کپڑا۔ میری کتاب وغیرہ ان سے کوئی واضح مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ مرکب ناقص ہمیشہ جملہ کا جزو ہوتا ہے۔ اسے کلام ناقص بھی کہتے ہیں۔

مرکب تام وہ مرکب ہے جس سے سننے والے کو پورا پورا مطلب سمجھ میں آجائے۔ جیسے یہ ناصر کا قلم ہے۔ اس نے سفید کپڑا خریدا۔ میری کتاب کہاں ہے وغیرہ۔ مرکب تام کو مرکب مفید۔ کلام تام یا جملہ بھی کہتے ہیں۔

مرکب ناقص کی قسمیں

۱۔ مرکب اضافی (۲) مرکب توصیفی (۳) مرکب ظرفی (۴) مرکب امتزاجی۔

(۵) مرکب عددی (۶) مرکب عطفی (۷) تابع مہمل (۸) تابع موضوع (۹) بادل و مبدل منہ (۹) تاکید و مؤکد (۱۱) اشارہ و مشارٌ الیہ (۱۲) عطف بیان (۱۳) جار مجرور۔ (۱۴) حال ذوالحال (۱۵) مستثنیٰ، مستثنیٰ منہٗ (۱۶) تمیز و ممیّز۔

مرکب اضافی دو مختلف اسموں کے ملنے سے ایک اُدھورا سا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ناتمام لگاؤ کو اضافت کہتے ہیں جیسے انور کی کتاب میں 'کی' اضافت ہے۔ جس اسم کا دوسرے اسم کے ساتھ تعلق ظاہر کیا جائے اس کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ مضاف اور مضاف الیہ سے مل کر جو مرکب بنے اس کو مرکب اضافی کہتے ہیں۔ جیسے انور کی کتاب، میرا کالج۔ آپ کا شہر۔

خواص ۱۔ عربی اور فارسی میں مضاف مقدّم ہوتا ہے۔ یعنی پہلے آتا ہے اور مضاف الیہ بعد میں جیسے کتاب انور۔ شاعر پاکستان۔ عہدہٗ صدارت

۲۔ اُردو میں مضاف الیہ پہلے آتا ہے۔ اور مضاف بعد میں جیسے اکبر کا قلم (اکبر مضاف الیہ۔ کا۔ حرف اضافت۔ قلم مضاف)

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

۳۔ نظم میں بعض اوقات مضاف پہلے آجاتا ہے۔

جوہر دکھاؤ صاحب جوہر کے سامنے ہے قدر آئینے کی سکندر کے سامنے
(قدر مضاف ہے اور آئینہ مضاف الیہ)

؎ کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

۴۔ اضافت کی تذکیر و تانیث وحدت جمع بلحاظ مضاف ہوتی ہے۔ مثلاً اسلم کا گھوڑا۔ اسلم کے گھوڑے۔ اسلم کی گھوڑی۔ اسلم کی گھوڑیاں۔

۵۔ مضاف اور مضاف الیہ میں فاصلہ نہیں ہوتا۔ لیکن نظم میں ایسا ہو جاتا ہے۔ جیسے ؎

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی تبسم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

۶۔ کبھی مضاف الیہ اور مضاف مل کر پھر مضاف الیہ ہو جاتے ہیں۔ درختوں کے پتوں کا شور اور کبھی مضاف جیسے میری سونے کی انگوٹھی۔

۷۔ جب۔ میرا۔ میری۔ میرے۔ تیرا۔ تیری۔ تیرے۔ تمہارا۔ تمہارے۔ تمہاری۔ ہمارا۔ ہمارے۔ ہماری۔ اپنا۔ اپنے۔ اپنی۔ مضاف الیہ ہوں تو علامت اضافت کا۔ کے۔ کی۔ حذف ہو جاتی ہے۔ جیسے میری کتاب۔ تمہارا امتحان

۸۔ مضاف اور مضاف الیہ کی پہچان یہ ہے، کہ سوال میں جس اسم کے ساتھ کس کا۔ کس کے۔ کس کی وغیرہ لگ سکے وہ مضاف ہوگا۔ اور جو اسم اس کے جواب میں ہوگا۔ وہ مضاف الیہ جیسے انور کی کتاب۔ اگر یہ پوچھیں کس کی کتاب تو جواب ہوگا۔ انور کی کتاب۔ پس انور مضاف الیہ اور کتاب مضاف ہے۔ اضافت کی کئی قسمیں ہیں۔ ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔

مرکب توصیفی وہ مرکب ہے، جو صفت اور موصوف سے مل کر بنے۔ جیسے نیک لڑکا۔ لال دوپٹہ۔ عجیب لڑکی۔ نرم بستر۔

ان میں نیک۔ لال۔ عجیب اور نرم صفات ہیں۔ اور لڑکا۔ دوپٹہ۔ لڑکی اور بستر موصوف۔ اُردو میں صفت پہلے آتی ہے۔ اور موصوف بعد میں۔ جیسے سرد پانی۔

خواص:- ۱۔ صفت کی تذکیر و تانیث اور وحدت جمع موصوف کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسے اچھا لڑکا۔ اچھی لڑکی۔ اچھے لڑکے۔ اچھی لڑکیاں۔

وہ اُجلا سا میدان چمکتی سی ریت
اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

۲۔ صفت مفرد بھی ہوتی ہے اور مرکب بھی۔ جیسے بد خود آدمی۔ بدصورت لڑکا۔

۳۔ صفت اور موصوف میں فاصلہ درست نہیں۔ لیکن نظم میں یہ فاصلہ

درست ہوتا ہے۔

رنگ ہر شاخ پہ پاؤ گے نرالا میرا　　　روپ ہر نخل پہ دیکھو گے نرالا میرا

۴۔ اگر کسی موصوف کی کئی صفتیں ہوں تو تمام صفتیں واحد آتی ہے جیسے مکار دغا باز۔ بے ایمان لوگوں سے خدا پناہ دے۔ لیکن موصوف محذوف ہو تو آخری صفت جمع آتی ہے۔ جیسے راست باز۔ نیک خو اور دیانت داروں کی صحبت اختیار کرو۔

۵۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ جس اسم کے ساتھ سوال میں کیسا۔ کیسے۔ کیسی لگ سکے وہ موصوف ہے اور جو جواب میں واقع ہو وہ صفت جیسے نیک لڑکا۔ اگر پوچھیں کیسا لڑکا جواب ہوگا نیک۔

۶۔ فارسی کے مرکب توصیفی بھی اُردو میں مستعمل ہیں۔ ان میں صفت بعد میں آتی ہے۔ گُلِ تر۔ میوۂ شیریں۔ شب تار۔

مرکب ظرفی وہ مرکب ہے جو ظرف اور مظروف سے مل کر بنے۔ جیسے شراب خانہ۔ پاندان۔ بت کدہ۔

شراب۔ پان اور بُت مظروف ہیں اور خانہ۔ دان اور کدہ ظرف۔

مرکب امتزاجی جب دو یا دو سے زیادہ اسم مل کر ایک ہی اسم ہو جائیں تو ایسے مرکب کو مرکب امتزاجی کہتے ہیں۔

مثلاً اسلام آباد۔ سبزی منڈی۔ فیروز پور۔ محمد اشرف۔

مرکب عددی مرکب عددی عدد اور معدود سے مل کر بنتا ہے۔ مثلاً چالیس چور آٹھ کتابیں۔ سو روپے۔

مرکب عددی میں عدد پہلے آتا ہے اور معدود بعد میں جیسے چالیس چور میں چالیس عدد ہے اور چور معدود۔ لیکن نظم میں معدود پہلے بھی آجاتا ہے۔

مرکب عطفی وہ مرکب ہے جو معطوف علیہ اور معطوف سے مل کر بنے مثلاً

دین و دُنیا ۔ کاغذ اور قلم ۔ فیض اور ناصر ۔

معطوف علیہ پہلے اور عطف بعد میں آتا ہے ۔ دین ۔ کاغذ اور فیض معطوف علیہ ہیں ۔ اور دُنیا ۔ قلم ۔ ناصر معطوف ہیں ۔ ’و‘ اور ’حروف عطف ہیں ۔

تابع مہمل و متبوع وہ مرکب ہے ۔ جس میں ایک بامعنی لفظ کے بعد محاورہ کے مطابق کوئی بے معنی مہمل لفظ آتے ہیں جیسے

سچ مچ ۔ غلط سلط ۔ پوچھ گچھ ۔ جھوٹ موٹ

ان میں مچ ۔ سلط ۔ گچھ ۔ موٹ : تابع مہمل ہیں ۔ اور سچ ۔ غلط ۔ پوچھ ۔ متبوع ہیں ۔

تابع موضوع وہ مرکب ہے جس میں ایک بامعنی لفظ کے بعد محاورے کے مطابق ایک بامعنی لفظ استعمال کیا جائے ۔ جیسے

رونا دھونا ۔ چیخ پکار ۔ چال ڈھال ۔

ان میں رونا ۔ چیخ اور چال متبوع ہیں ۔ اور دھونا ۔ پکار اور ڈھال تابع موضوع ۔

بدل و مبدّل منہٗ جب دو لفظ کلام میں اس طرح استعمال ہوں کہ ایک سے جو مراد ہو ۔ دوسرے سے بھی وہی مراد ہو ۔ لیکن دوسرے سے چنداں غرض ہو ۔ جیسے ناہید کا بھائی سلیم ۔

جو مقصود بالذات ہوتا ہے اُس کو بدل کہتے ہیں اور دوسرے کو مبدّل منہٗ اُوپر کے فقرے میں صاف طور پر واضح نہیں ہوتا تھا ۔ کہ کونسا سلیم مراد ہے ۔ اس لیے ناہید کا بھائی کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ چنانچہ ناہید کا بھائی بدل اور سلیم مبدّل منہٗ ہوا ۔ بدل مبدّل منہٗ کی وضاحت کرتا ہے ۔

تاکید و مؤکّد مرکب ہے جو تاکید اور مؤکّد سے مل کر بنے ۔ ان میں سے ایک دوسرے کی تاکید کرتا ہے ۔ اور کلام میں زور پیدا ہوتا ہے ۔

مثلاً کل آدمی ۔ سب سامان ۔ تمام عورتیں ۔

ان میں کل۔ سب اور تمام تاکید ہیں۔ اور آدمی۔ سامان اور عورتیں مؤکد ہیں۔ تاکید کے الفاظ یہ ہیں۔ سب۔ سب کے سب۔ بالکل۔ سبھی۔ کل۔ تمام سراسر۔ سربسر۔ سراپا۔ آپ۔ خود۔ وغیرہ۔

تکرار لفظ سے بھی تاکید پیدا ہوتی ہے۔ جیسے آہستہ آہستہ۔ چور چور۔ ہاں ہاں۔

اشارہ و مشارٌ الیہ وہ مرکب ہے جو اسم اشارہ اور مشارٌ الیہ سے بنتا ہے۔ مثلاً یہ کرسی۔ وہ عمارت۔ وہ لڑکا۔

ان میں یہ۔ وہ اسم اشارہ ہیں اور کرسی۔ عمارت اور لڑکا مشارٌ الیہ۔

عطف بیان و مبیّن وہ مرکب ہے جس میں دو اسم اس طرح استعمال کیے جائیں کہ دوسرا اسم پہلے اسم کی وضاحت کرے تو وضاحت کرنے والے اسم کو عطف بیان کہتے ہیں اور جس اِسم کی وضاحت کرتا ہے۔ اس کو مبیّن کہتے ہیں۔ مثلاً

اسد اللہ خان غالب۔ محمد حسین آزاد۔ محمد علی جناح۔ موسیٰ کلیم اللہ۔ سعدی شیرازی وغیرہ۔

ان میں اسد اللہ خاں۔ محمد حسین۔ محمد علی۔ موسیٰ اور سعدی مبیّن ہیں۔ اور غالب۔ آزاد۔ جناح۔ کلیم اللہ۔ شیرازی۔ عطف بیان۔

جارمجرور وہ مرکب ہے جو جار اور مجرور سے مل کر بنے۔ مثلاً کالج سے۔ شہر تک۔ چھت پر۔ ان مثالوں میں سے۔ تک اور پر جار ہیں۔ اور کالج۔ شہر اور چھت مجرور ہیں۔

جار مجرور مل کر جملہ فعلیہ میں متعلق فعل اور جملہ اسمیہ میں متعلق خبر ہوا کرتے ہیں۔

حال ذوالحال جو لفظ کسی فاعل یا مفعول کی حالت کو ظاہر کرے اس کو حال کہتے ہیں۔ اور جس فاعل یا مفعول کی حالت کو ظاہر

کرے اُسے ذوالحال کہتے ہیں۔ مثلاً

اشرف روتا ہوا آ رہا ہے۔ اس میں روتا ہوا حال اور اشرف ذوالحال ہے۔

۱۔ مَیں ہارا تھکا شام کو گھر پہنچا (۲) محمود خوش خوش نظر آ رہا ہے۔

۳۔ وہ مارا مارا پھرتا ہے۔

مستثنیٰ / مستثنیٰ منہ وہ مرکب ہے جو مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ سے مل کر بنے جیسے طلعت کے سوا سب آ گئے۔

جب دو اسموں کے درمیان حرف استثنیٰ آئے تو جس اسم کو الگ کیا جائے اسے مستثنیٰ کہتے ہیں اور جس سے الگ کیا جائے اسے مستثنیٰ منہ۔ طلعت مستثنیٰ سب مستثنیٰ منہ اور سوا حرف استثنیٰ ہے۔

تمیز و ممیّز وہ الفاظ جو کسی اسم مفرد یا جملے سے شک دُور کریں، ممیز کہلاتے ہیں۔ اور جن سے شک دُور کریں۔ ان کو تمیز کہتے ہیں

جیسے: پانچ کتابیں۔ آٹھ من چاول۔ سات گز ململ۔

ان میں کتابیں۔ چاول اور ململ ممیز ہیں اور پانچ۔ آٹھ من اور سات گز تمیز ہیں۔

اضافت کی قسمیں

۱۔ اضافت تملیکی جس میں مضاف اور مضاف الیہ میں سے ایک مالک ہو اور دوسرا مملوک جیسے احمد کا گھوڑا (احمد مالک گھوڑا مملوک)، ایران کا بادشاہ (ایران مملوک۔ بادشاہ مالک)۔

احمد کا گھوڑا۔ 'احمد' مضاف الیہ۔ 'کا' حرف اضافت۔ 'گھوڑا' مضاف،

۲۔ اضافت ظرفی اس میں مضاف الیہ ظرف اور مضاف مظروف ہوتا ہے۔ جیسے کالج کا میدان۔ کنوئیں کا پانی۔

کبھی مضاف الیہ مظروف ہوتا ہے اور مضاف ظرف جیسے شربت کا گلاس۔ پانی کا گھڑا۔

۳۔ اضافت بیانی | اس میں مضاف۔ مضاف الیہ سے بنتا ہے۔ جیسے سونے کی انگوٹھی۔ ریشم کا کپڑا۔

۴۔ اضافت تخصیصی | جس میں مضاف اپنے مضاف الیہ کی وجہ سے خاص ہو جائے۔ لیکن تملیکی یا ظرفی نہ ہو۔ مثلاً اشرف کا بھائی۔ عطار کی دکان۔

۵۔ اضافت توضیحی | اس میں مضاف الیہ مضاف کی وضاحت کرتا ہے یعنی مضاف الیہ خاص ہوتا ہے۔ جیسے اپریل کا مہینہ۔ لاہور کا شہر۔

اضافت تخصیصی اور اضافت توضیحی میں فرق

۱۔ اضافت تخصیصی میں مضاف اپنے مضاف الیہ کے ساتھ مل کر کوئی خصوصیت حاصل کرتا ہے۔ مگر توضیحی میں مضاف الیہ صرف مضاف کی وضاحت کرتا ہے

۲۔ ان مثالوں میں اپریل مہینہ ہے۔ لاہور شہر ہے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اضافت تخصیصی میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

۶۔ اضافت بہ ادنیٰ تعلق | اس میں مضاف الیہ کو مضاف کے ساتھ تھوڑا سا تعلق ہوتا ہے۔ جیسے ہمارا پاکستان ان کا محلہ۔ اسلم کا گاؤں۔

۷۔ اضافت ابنی | اس میں مضاف الیہ باپ اور مضاف بیٹا ہو۔ جیسے محمود سبکتگین یعنی محمود سبکتگین کا بیٹا۔

۸۔ اضافت استعارہ | استعارہ کے معنی مانگنے کے ہیں۔ اس میں کسی لفظ کے مفہوم کو کچھ اور فرض کر لیتے ہیں۔ پس اس قسم کی

اضافت کو جو مضاف کو مضاف الیہ کا حصّہ ظاہر کرے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہ ہو، اضافت استعارہ کہتے ہیں۔ جیسے عقل کے ناخن۔ حسد کی آگ۔

۹۔ اضافت تشبیہی

اس میں مضاف الیہ کو مضاف کے مشابہ کہا جاتا ہے۔ جیسے نگاہ کا تیر۔ زلف کا سانپ (زلف مشبہ۔ سانپ مشبہ بہ)

اضافت استعارہ اور تشبیہی میں فرق

اضافت تشبیہی میں مضاف الیہ یعنی مشبہ کو مضاف یعنی مشبہ بہ کی مانند کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً نگاہ کا تیر، نگاہ کو تیر کی مانند کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح زلف سانپ کی مانند۔ لیکن اضافت استعارہ میں مضاف الیہ کو مضاف کی مانند نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً عقل کے ناخن میں عقل ناخن کی مانند نہیں کہہ سکتے۔

۱۰۔ اضافت توصیفی

وہ مرکب ہے۔ جو صفت اور موصوف سے مل کر بنتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ جس میں مضاف موصوف اور مضاف الیہ صفت ہو۔ جیسے نیک لڑکا

۲۔ مضاف الیہ اور مضاف صفت ہو۔ جیسے ارادے کا پکا۔ بے نمک سالن۔

نوٹ ۱:۔ اضافت کے دور کرنے کو فک اضافت کہتے ہیں۔ مثلاً۔ سرچشمہ۔ غلام محمد۔

۲۔ جب مضاف اور مضاف الیہ کی اصل ترتیب الٹ جائے تو اسے اضافت مقلوب کہتے ہیں۔ جیسے سالار سپہ کی جگہ سپہ سالار۔

طائرانہ نظر

علم نحو:۔ وہ علم ہے جس میں اجزائے کلام کی صحیح ترتیب ترکیب اور باہمی تعلقات سے بحث ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان صحیح کلام بولتا ہے اور زبان کی غلطیوں سے بچا رہتا ہے۔

مرکب کی دو قسمیں ہیں :۔ (۱) مرکب ناقص (۲) مرکب تام۔
مرکب یا کلام ناقص :۔ جس سے سننے والا پورا مطلب نہ سمجھ سکے۔
جیسے ناصر کا قلم۔ سفید کپڑا۔
مرکب یا کلام تام :۔ جس سے سننے والے کو پورا مطلب سمجھ میں آجائے۔
جیسے یہ ناصر کا قلم ہے۔ اس نے سفید کپڑا خریدا۔
مرکب ناقص کی اہم قسمیں یہ ہیں :۔

۱۔ مرکب اضافی :۔ جیسے انور کی کتاب (انور مضاف الیہ۔ کتاب مضاف، کا حرف اضافت) عام طور پر مضاف الیہ پہلے آتا ہے اور مضاف بعد میں۔
۲۔ مرکب توصیفی :۔ جیسے نیک لڑکا (نیک صفت۔ لڑکا موصوف)
۳۔ مرکب ظرفی :۔ جیسے شراب خانہ (شراب مظروف، خانہ ظرف)
۴۔ مرکب امتزاجی :۔ جیسے اسلام آباد۔ حیدر آباد (دو یا دو سے زیادہ اسموں سے مل کر بنتا ہے)
۵۔ مرکب عددی :۔ جیسے چالیس چور (چالیس عدد۔ چور معدود)
۶۔ مرکب عطفی :۔ دین و دنیا۔ دین معطوف علیہ دُنیا معطوف ہے)
۷۔ تابع مہمل :۔ جیسے سچ مچ۔ جھوٹ موٹ (مچ۔ موٹ مہمل ہے)
۸۔ تابع موضوع :۔ جیسے رونا دھونا۔ چال ڈھال۔
۹۔ بدل مبدل منہٗ :۔ جیسے ناہید کا بھائی سلیم۔
۱۰۔ اشارہ و مشارٌ الیہ :۔ جیسے یہ کرسی۔ وُہ قلم (کرسی اور قلم مشارٌ الیہ ہیں)
۱۱۔ مستثنیٰ منہٗ :۔ جیسے اسلم کے سوا۔
۱۲۔ عطف و بیان :۔ جیسے اسد اللہ خان غالب۔ محمد حسین آزاد۔

باب ۱۲

کچھ جملوں کے بارے میں

اسناد:۔ ہر جملے کے دو بڑے جزو ہوتے ہیں اور ان میں ایک خاص نسبت یا تعلق ہوتا ہے جس سے سننے والے کو پورا مطلب حاصل ہوتا ہے. اس نسبت یا تعلق کو اسناد کہتے ہیں۔

مسند:۔ جس چیز کی نسبت یا تعلق ہو (یا جو کچھ کسی چیز کے متعلق کیا جائے)، اسے مسند کہتے ہیں۔ مثلاً اسلم نیک ہے۔ احمد دوڑا۔ اس میں نیک اور دوڑا مسند ہیں۔ مسند کبھی اسم ہوتا ہے۔ جیسے نیک اور کبھی فعل جیسے دوڑا۔

مسند الیہ:۔ جس چیز کے ساتھ نسبت یا تعلق ہو (یا جس کے متعلق کچھ کہا جائے)، اُسے مسند الیہ کہتے ہیں۔ مثلاً اُوپر کے فقروں میں اسلم اور احمد مسند الیہ ہیں۔ کیونکہ ان کے متعلق کچھ کہا گیا ہے۔ مسند الیہ ہمیشہ اسم ہوتا ہے۔

مفرد جملہ:۔ مفرد جملہ میں صرف ایک فعل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی اور جملہ نہیں آتا جیسے ناصرہ نے خط لکھا۔ وہ گیا۔

مرکب جملہ:۔ مرکب جملہ دو یا دو سے زیادہ جملوں سے مل کر بنتا ہے. جیسے اسلم نے کھانا نہیں کھایا۔ کیونکہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔

جملے کی قسمیں بلحاظ مسند الیہ

۱۔ جملہ اسمیہ ۲۔ جملہ فعلیہ

۱۔ جملہ اسمیہ | جملہ اسمیہ وہ جملہ ہے جس میں مسند اور مسندالیہ دونوں اسم ہوں۔ مثلاً طلعت ذہین ہے جاوید سخی ہے

اس میں مسندالیہ طلعت اور جاوید ہیں اور ذہین اور سخی مسند ہیں۔

اور ٭ ہے، فعل ناقص ۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس جملے میں فعل ناقص ہو اسے جملہ اسمیہ کہتے ہیں۔

افعال ناقص یہ ہیں :۔

ہو ۔ ہیں ۔ ہوں ۔ تھا ۔ تھے ۔ تھی ۔ تھیں ۔ ہوا ہوگا ۔ ہوگیا ۔ بن گیا ۔ نکلا وغیرہ۔

۲۔ جملہ فعلیہ | جملہ فعلیہ وہ جملہ ہے جس میں مسندالیہ اسم اور مسند فعل ہو جیسے اکرم دوڑا ۔ اس نے کتاب پڑھی ۔

اس میں مسند (دوڑا اور پڑھی) فعل ہیں یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں ۔ جس جملے میں فعل تام ہو اُسے جملہ فعلیہ کہتے ہیں۔

جملہ اسمیہ کے اجزا

(۱) مبتدا (۲) خبر (۳) فعل ناقص

جملہ اسمیہ کے مسندالیہ کو مبتدا اور مسند کو خبر کہتے ہیں۔ جملہ اسمیہ میں مبتدا اور خبر کے علاوہ ایک فعل ناقص ضرور آتا ہے۔ مثلاً طلعت ذہین ہے۔

طلعت	مبتدا یا اسم	جملہ اسمیہ ہوا
ذہین	خبر	
ہے	فعل ناقص	

مبتدا اور خبر کی پہچان | فعل ناقص کے ساتھ 'کیا'، 'کون' لگا کر پوچھیں تو جواب میں مبتدا یا اسم آئے گا ۔ اور کیسا یا کیا کے جواب میں خبر آئے گی ۔ جیسے اسلم سخی ہے۔

کون سخی ہے (جواب) اسلم ــــ بتدا
اسلم کیا ہے (جواب) سخی ــــ خبر

اسم اور خبر

۱۔ اسم عموماً پہلے آتا ہے اور خبر بعد میں جیسے اشرف جھوٹا ہے
۲۔ بتدا اسم بھی ہو سکتا ہے اور ضمیر مصدر اور صفت بھی۔
جیسے وہ بیمار ہے۔ (وہ۔ضمیر) رونا اچھا نہیں (رونا ــــ مصدر)
بوڑھا جوان ہو گیا (بوڑھا ــــ صفت)

۳۔ اگر ایک اسم معرفہ ہو اور دوسرا اسم نکرہ تو معرفہ اسم ہوگا اور نکرہ خبر جیسے راوی دریا ہے۔

۴۔ اگر دونوں اسم معرفہ ہوں تو پہلا اسم اور دوسرا خبر۔ طہران ایران کا دارالخلافہ ہے۔

۵۔ اگر دونوں اسم نکرہ ہوں تو جو زیادہ خاص ہوگا۔ اسم ہوگا۔ جیسے:۔ کبوتر پرندہ ہے۔

۶۔ بعض اوقات اسم یا خبر یا فعل ناقص محذوف ہوتے ہیں۔ جیسے مظلوم ہوں (میں محذوف) یا کوئی پوچھے یہاں کوئی دکان ہے اور جواب ہو "ہے"

۷۔ اگر کوئی اسم دوبار آئے تو پہلے کو اسم اور دوسرے کو خبر کہتے ہیں۔

آدمی آدمی ہے اور ہے حیوان
تیری رفتار جدا کبک کی رفتار جدا

۸۔ کبھی اِسم کی کئی خبریں ہوتی ہیں۔ جیسے خدا علیم و کریم ہے۔
۹۔ کبھی کئی اسموں کی خبر ہوتی ہے۔ احمد اور محمود نیک ہیں۔
۱۰۔ فعل ناقص عموماً خبر کے بعد آتا ہے لیکن نظم میں پہلے بھی آتا ہے۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

۱۱۔ خبر کبھی مفرد ہوتی ہے۔ اور کبھی مرکب۔ جیسے اسلم محمود کا بھائی ہے۔

۱۲- مبتدا یا اسم کی توسیع بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے دہلی شہر بہت قدیم ہے۔ مجھے دو جوڑے کپڑے درکار ہیں۔ اس کی حالت خراب ہے۔

۱۳- اسم واحد ہو تو خبر بھی واحد آتی ہے۔ اسم جمع ہو تو خبر بھی جمع ہوگی۔

۱۴- جب دو یا نہ یادہ اسم یا ضمیریں ہوں تو خبر قریب کے لفظ کے مطابق آتی ہے۔ جیسے :-

میرے کمرے میں چار کرسیاں اور ایک میز ہے

میرے کمرے میں ایک میز اور چار کرسیاں ہیں

جملہ فعلیہ کے اجزا

(۱) فاعل (۲) فعل (۳) مفعول

۱- جملہ فعلیہ میں فعل تام ہوتا ہے اور اس کے مسندالیہ کو فاعل اور مسند کو مفعول کہتے ہیں۔ جیسے اسلم آیا

اسلم	فاعل	جملہ فعلیہ ہوا
آیا	فعل	

۲- فعل متعدی کی صورت میں فاعل کے علاوہ مفعول کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً اسلم نے کتاب پڑھی۔

اسلم	فاعل	
نے	علامت فاعل	
کتاب	مفعول	جملہ فعلیہ ہوا
پڑھی	فعل متعدی	

۳- اگر فعل مجہول ہو تو دو اجزا (فعل اور مفعول قائم مقام فاعل) ہوتے ہیں مثلاً ارشد پیٹا گیا۔ "ارشد" قائم مقام فاعل اور پیٹا گیا فعل مجہول ہے۔

۴۔ فاعل اور مفعول معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ فعل کے ساتھ 'کون' یا 'کس نے' لگا کر پوچھیں تو جواب میں فاعل آئے گا۔ اور فعل کے ساتھ 'کس کو' یا 'کیا' لگا کر سوال کریں تو جواب میں مفعول آئے گا۔ جیسے اسلم نے قلم خریدا۔

کس نے خریدا؟	(جواب)	اسلم نے	فاعل
کیا خریدا	(جواب)	قلم	مفعول

۵۔ بخدا۔ واللہ (مقسم مقسم بہ) ہمیشہ جملہ فعلیہ ہوتا ہے۔ بخدا سے مراد ہے میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔ اسی طرح اے خدا کا مطلب ہے میں خدا کو پکارتا ہوں۔ میں فاعل خدا مفعول اور پکارتا ہوں فعل ہوا۔

۶۔ اظہار تاسف کے لیے وائے قسمت کے معنی ہیں "میں قسمت کا افسوس کرتا ہوں"۔

متعلقات فعل

متعلقات فعل وہ اسم ہیں جو فعل یا صفت کے ساتھ مل کر اس کے معنوں میں خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ظرف زماں:۔ جیسے اب، جب، پہلے، پیچھے، پرسوں، صبح شام، عنقریب سالانہ وغیرہ۔

۲۔ظرف مکان:۔ جیسے اندر۔ باہر۔ کدھر۔ وہاں۔ کہاں وغیرہ۔

۳۔صفت:۔ جیسے فوراً، دلیرانہ، لگاتار، خوب وغیرہ۔

۴۔ تعداد و مقدار:۔ جیسے دوبار۔ اکثر۔ اتنا۔ بہت کچھ وغیرہ۔

۵۔ ایجاب و انکار۔ شک و یقین:۔ جیسے ہاں۔ جی ہاں۔ شاید۔ ہرگز۔ بیشک وغیرہ۔

۶۔ جار مجرور:۔ جملہ فعلیہ میں متعلق فعل اور جملہ اسمیہ میں متعلق خبر ہوتے ہیں۔

۷۔ تشبیہ و مقابلہ :۔ مانند۔ جیسا۔ بعینہٖ وغیرہ۔
۸۔ استفہامیہ :۔ جیسے کیونکر۔ کیسے۔ کب۔ کس طرح وغیرہ۔

جملہ خبریہ

جس جملے میں کسی قسم کی خبر پائی جائے اُسے جملہ خبریہ کہتے ہیں۔ مثلاً قافلہ آیا۔ انور کراچی گیا۔ جملہ فعلیہ اور اسمیہ اس کی قسمیں ہیں۔

جملہ انشائیہ

جس جملے میں کسی قسم کی خبر نہ پائی جائے بلکہ حکم۔ دعا۔ تعجب یا استفہام پایا جائے اُسے جملہ انشائیہ کہتے ہیں۔ مثلاً یہ کتاب کون لایا۔ قلم لاؤ۔ خدا اس کو صحت دے۔ آہا کیسا اچھا موسم ہے۔

جملہ انشائیہ کی قسمیں

جملہ انشائیہ کی کئی قسمیں ہیں :۔
۱۔ دعائیہ :۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔
۲۔ استفہامیہ :۔ یہ قلم کس کا ہے
۳۔ تعجبیہ :۔ آہا کیسا اچھا موسم ہے۔
۴۔ تمنائیہ : کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے۔
۵۔ ندائیہ :۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔
۶۔ تاسف :۔ مٹی میں مل گیا یہ حسن دلفریب۔
۷۔ انبساط :۔ واہ کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا۔
۸۔ تنبیہ :۔ خبردار آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔
۹۔ نہی :۔ مت آؤ۔
۱۰۔ امر :۔ آؤ۔
۱۱۔ قسم :۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔

۱۲- تحسین :- لڑکوں کی محنت پر صد آفریں ہے۔

نوٹ ۱:- یہ یاد رہے کہ خواہ جملہ اسمیہ ہو یا فعلیہ ہر ایک جملہ یا تو خبریہ ہوتا ہے یا انشائیہ۔

ترکیب نحوی

کسی جملے کے تمام الفاظ کو علیحدہ علیحدہ کر کے ان کے باہمی تعلقات کو ظاہر کرنے کا نام ترکیب نحوی ہے۔

ترکیب نحوی کے لیے ہدایات

۱- اگر کسی مصرع یا شعر کی ترکیب نحوی کرنا مطلوب ہو تو پہلے اس کی نثر بنائی جائے۔

۲- جملہ میں اگر کوئی لفظ محذوف ہو تو اسے پورا کر لیا جائے۔

۳- معلوم کیجئے کہ جملہ فعلیہ ہے یا اسمیہ پھر اس کے مطابق اس کے اجزا درج کیجئے۔

۴- جملہ اسمیہ کے اجزا یہ ہیں۔

فعل ناقص - مبتدا - خبر - متعلقات فعل۔

مثال آدمی بلبلا ہے پانی کا

نثر :- آدمی پانی کا بلبلا ہے۔

ہے	فعل ناقص		جملہ اسمیہ ہوا
آدمی	مبتدا		
پانی	مضاف الیہ	خبر	
کا	حرف اضافت		
بلبلا	مضاف		

۵- جملہ فعلیہ کے اجزا یہ ہیں۔

فعل - فاعل - مفعول (اگر ہو) متعلقات فعل

مثال :- آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور

نثر :- جانور آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے

نہ اٹھاتے تھے	فعل		جملہ فعلیہ ہوا
جانور	فاعل		
منہ	مفعول		
آب	موصوف	مجرور متعلق فعل	
رواں	صفت		
سے	جار		

تمام مرکبات ناقصہ جملہ فعلیہ میں فاعل یا مفعول قائم مقام فاعل اور جملہ اسمیہ میں مبتدا یا خبر ہوتے ہیں ۔

جُزو دوم

محاورات

باب ۱۱

محاورہ

محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ لیکن گرامر کی اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے کہ جب کوئی ایک یا کئی الفاظ مصدر کے ساتھ آکر حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوں اور اہل زبان کی بول چال کے مطابق ہوں تو اسے محاورہ کہیں گے۔ مثلاً آسمان سے باتیں کرنا (بہت اونچا ہونا) زبان دینا (وعدہ کرنا) اُلّو بولنا (اجاڑ سنسان ہونا)، دوچار ہونا (سامنے آنا۔ ملنا جال بچھانا (دھوکہ دینا) محاورات ہیں۔ کیوں کہ ان میں الفاظ اصل معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح قسم کھانا، دھوکہ کھانا، ٹھوکر کھانا محاورے ہیں۔ لیکن روٹی کھانا، دوا کھانا، میوہ کھانا محاورے نہیں ہیں کیونکہ ان میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

محاورہ کے لیے ضروری شرائط

۱- اہل زبان کی بول چال کے مطابق ہونا چاہیے۔ مثلاً تین پانچ کرنا، (جھگڑا کرنا) محاورہ ہے۔ لیکن ہم اس کی بجائے تین چار کرنا نہیں کہہ سکتے۔

۲- دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مرکب ہو۔

۳- قواعد کے خلاف نہ ہو۔

۴- محاورہ میں مصدر کے جملہ مشتقات استعمال ہو سکتے ہیں۔ لیکن اصل محاورہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً ہم تو تم سے ہاتھ دھو بیٹھے، میں ہاتھ دھو بیٹھنا محاورہ ہے۔ اگر کوئی بیان کو زوردار بنانے کے لیے دونوں ہاتھ دھو بیٹھے، لکھ دے تو غلط ہوگا۔

اس کا خط دیکھتے ہی صیّاد
طوطے ہاتھوں کے اڑا کرتے ہیں

اس میں محاورہ اہل زباں کی بول چال کے موافق نہیں ہے۔ طوطے اڑ جانا محاورہ ہے۔

محاورہ زباں کا اور خصوصاً شعر کا زیور ہے۔ اگر سلیقے سے باندھا جائے تو نظم و نثر کا درجہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان اشعار میں محاورات کا استعمال کتنا حسن پیدا کر رہا ہے ؎

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

؎ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

؎ اب کے کچھ اور ڈھب سے آنکھ لگی
نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی

ع خاک ہو جائیں گے ہم تو کو خبر ہونے تک

ع چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں!

ع ہے خبر گرم ان کے آنے کی!

ع کیا لطف انجمن کا جب دِل ہی بجھ گیا ہو

؎ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

ع سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

؎ نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

روزمرّہ

روزمرّہ اس کلام کو کہتے ہیں جو فصاحت اور روزمرّہ کی بول چال کے مطابق ہو اور یقین ہو کہ اہل زبان بالکل اسی طرح بولتے ہیں۔ اس میں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً پانچ سات، دس بارہ، آٹھے دِن، روز بروز وغیرہ۔ اب دس بارہ کی بجائے دس گیارہ یا آٹھے دِن کی بجائے آٹے روز نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ اہل زبان اس طرح نہیں بولتے۔ اسی طرح گوارا کی ضد ناگوار الانا غلط ہے کیوں کہ روزمرہ ناگوار ہے یا "کون کتاب چاہیے" روزمرّہ نہیں" کون سی کتاب چاہیئے" ہونا چاہیے۔

بعض اوقات کلام قواعد گرامر کی رو سے بالکل صحیح ہوتا ہے مگر روزمرّہ کی رو سے غلط۔ مثلاً اس کی چشم میں درد ہے، قواعد کی رو سے درست ہے لیکن روزمرّہ کے مطابق چشم کی بجائے آنکھ چاہیے۔

- دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا" اس میں" کیا ہوگیا" ہونا چاہیے۔

محاورہ اور روزمرّہ میں فرق

۱۔ محاورہ حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن روزمرّہ حقیقی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ روزمرّہ محاورے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ محاورے میں قواعد کی پابندی ہے لیکن روزمرّہ قواعد کی رو سے ہٹ کر چلتا ہے اور اس میں اہل زبان کی بول چال کی تقلید کی جاتی ہے

۳۔ محاورہ اپنے معنی میں مکمل ہوتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی مداخلت ناجائز ہے

۴۔ کلام نظم ونثر میں روزمرّہ کی پابندی ضروری ہے جس قدر پابندی کم ہو گی کلام فصاحت کے درجہ سے گرا ہوا سمجھا جائے گا۔ مگر محاورہ کا ایسا حال نہیں ہے محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر

کر دیتا ہے لیکن ہر شعر میں محاورہ باندھنا ضروری نہیں۔

نصابی محاورات کا استعمال

۱۔ بر آنا (پوری ہونا) مسلسل کوشش کے بعد آخرکار اس کی امید بر آئی

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

۲۔ عازم اقلیم عدم ہونا (مر جانا) جہانگیر کے عازم اقلیم عدم ہوتے ہی اس کے دو بیٹوں میں تخت نشینی کے جنگ چھڑ گئی۔

۳۔ ماہی بے آب (سخت بیقرار) شاعر اپنی فرضی محبوبہ کے فراق میں بھی ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں۔

۴۔ جو فروش گندم نما (ریاکار، دھوکا باز، منافق، ظاہر میں کچھ باطن میں کچھ) موجودہ دور میں جو فروش گندم نما رہنما عوام کو بے وقوف بنا کر ذاتی شہرت اور عہدے حاصل کر رہے ہیں۔ ان سے خبردار رہنا چاہیئے۔

۵۔ دم میں آنا (باتوں میں آنا) میں نے احمد کو بہت سمجھایا لیکن وہ بشیر کے دم میں آ ہی گیا اور اپنے باپ سے علیحدہ ہو گیا۔

۶۔ تناول کرنا (کھانا) آج سب دوستوں نے نعمت کدہ میں کھانا تناول کیا

۷۔ زہر مار کرنا (رغبت کے بغیر کھانا) اس حادثہ کی خبر سنتے ہی میں نے کھانا زہر مار کیا اور گھر سے نکل آیا۔

۸۔ بلائیں لینا۔ (قربان ہونا) مرزا پھویا جب علی گڑھ جانے لگے تو ان کی ماں اور بہنوں نے ان کی بلائیں لیں۔

ع بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

۹۔ مشکیں کسنا (ہاتھ پاؤں باندھنا) ڈاکوؤں نے مالکِ مکان کی مشکیں کس کر ایک کمرے میں ڈال دیا۔ اور گھر کا سب سامان لوٹ کر لے گئے۔

۱۰۔ شہر بدر کرنا (شہر سے نکال دینا) بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں مجرم کو شہر بدر کر دیا گیا۔

۱۱۔ ڈھارس بندھانا (تسلی دینا) احمد بھائی کی بیماری کا حال سن کر رونے لگا لیکن بشیر نے اُس کی ڈھارس بندھائی کہ جلد ہی تندرست ہو جائے گا۔

۱۲۔ آنکھیں چار ہونا۔ (ملاقات ہونا) ندیم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو قاسم کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ گذشتہ کوتاہیوں کے باعث وہ اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی شرمندگی محسوس کرنے لگا۔

ع جب آنکھیں چار ہوتی ہیں محبت آہی جاتی ہے

۱۳۔ اٹکھیلیاں کرنا (ناز و ادا سے چلنا) جب محبوب اٹکھیلیاں کرتا ہوا چلتا ہے۔ تو شاعر کے دل میں قیامت برپا ہو جاتی ہے

۱۴۔ چھکے چھوٹ جانا (ہمت ہار جانا) شیر کی آواز سنتے ہی مسافر کے چھکے چھوٹ گئے۔

۱۵۔ دقیقہ اُٹھا نہ رکھنا (پوری کوشش کرنا) اُس نے امتحان میں اوّل آنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ لیکن افسوس ایک نمبر کی کمی سے ناکام ہو گیا۔

۱۶۔ دق ہونا (تنگ ہونا) میں تمہاری روز روز کی حرکتوں سے بہت دِق ہو گیا ہوں۔ اس لیے میں نے تم سے قطع تعلق کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

۱۷۔ گاڑھی چھننا (گہری دوستی ہونا) نہ جانے احمد اور بشیر میں کیوں اختلاف ہو گیا ہے اس سے تو قبل ان دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔

۱۸۔ استراحت کرنا (آرام کرنا) میں نصیر کو ملنے اُس کے گھر گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ سفر کی تھکان کے باعث استراحت کر رہا ہے اس لیے واپس چلا آیا۔

۱۹۔ انتڑیوں کا قل ہو اللہ پڑھنا (بھوک سے بے چین ہونا) بے حد مصروفیت کے باعث میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ اب تو میری انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھنے لگی ہیں۔

۲۰۔ چشم زدن میں (فوراً) بھائی ذرا جلد جاؤ لیکن چشم زدن میں واپس بھی آؤ۔
۲۱۔ ڈینگ مارنا۔ (شیخی دکھانا) خواہ مخواہ ڈینگ مارنے والوں کو آخر کار شرمندگی اُٹھانی پڑتی ہے۔
۲۲۔ کج ادائی کرنا (بے رُخی سے پیش آنا) یکایک دولت ملتے ہی دوستوں سے کج ادائی کر رہے ہو۔ افسوس ہے ایسی ذہنیت پر۔
۲۳۔ تاڑ جانا (سمجھ جانا) تم لاکھ چھپانے کی کوشش کرو۔ وہ تاڑ گیا ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔
۲۴۔ نیچا دکھانا (شکست دینا) بابر نے ابراہیم لودھی کو نیچا دکھا کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔
۲۵۔ بارِ ہستی سے سبکدوش کرنا (قتل کرنا) جلاد نے تلوار کے ایک ہی وار سے مُجرم کو بارِ ہستی سے سبکدوش کر دیا۔
۲۶۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال (کسی کے ساتھ بھلائی کر اور بھول جا) میں یہ مانتا ہوں کہ بشیر کو تم نے تعلیم دلائی ہے، اُس کے اخراجات برداشت کیے ہیں۔ لیکن اب جتانے کی کیا ضرورت۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔
۲۷۔ کنارہ کش ہونا (کسی سے علیحدہ ہو جانا) احمد اور بشیر دونوں لاہور کے لیے روانہ ہوئے لیکن بشیر کی نازیبا حرکات کی وجہ سے احمد راستہ ہی میں اُس سے کنارہ کش ہو گیا۔
۲۸۔ لمبی تان کر سونا (گہری نیند سونا) سُورج نکل آیا ہے لیکن نصیر جیسے بے فکرے ابھی تک لمبی تان کر سوئے ہوئے ہیں۔
۲۹۔ منہ نہ لگانا (پروا نہ کرنا) تم آج بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہو۔ وہ دن بھول گئے۔ جب تمہیں کوئی منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔
۳۰۔ چمپت ہونا (فرار ہونا۔ بھاگ جانا) رات کی تاریکی میں چور گھر کا سارا سامان لے کر چمپت ہو گئے۔

۳۱۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر (زبردست غالب آ ہی جاتا ہے)۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اُس سے اُلجھنے کی کوشش مت کرو اور اُس کی بات مان لو۔

۳۲۔ باور کرنا (یقین کرنا)۔ تمہیں اس پر باور کرنا چاہیئے میں غلط بیانی سے کام ہرگز نہیں لے رہا۔

۳۳۔ کتر بیونت کرنا (کم چیز لینا) گھریلو ملازم عام طور پر سودے میں کتر بیونت کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

۳۴۔ تو ائی میں ڈالنا (مصیبت میں ڈالنا)۔ اماں مجھے کس توائی میں ڈال دیا۔ ایک ہی بار پہاڑ کا پہاڑ میرے سر پر رکھ دیا۔

۳۵۔ کھسر پھسر کرنا (آہستہ آہستہ باتیں کرنا)۔ یہ کیا کھسر پھسر کر رہے ہو۔ میری بات کا جواب دو۔

۳۶۔ گتھم گتھا (لڑائی جھگڑا)۔ ان بچوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے ہر وقت گتھم گتھا میں مصروف رہتے ہیں۔ اتفاق تو ان میں نام کو نہیں۔

۳۷۔ عرضی پرزہ کرنا (درخواست دینا)۔ بڑی مشکل سے عرضی پرزہ کر کے بشیر دفتر میں کلرک ہو گیا۔

۳۸۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب (بہت خوبصورت)۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب بیوی کی قدر نہ کی اور ناصر نے ایک اور عورت سے شادی کر لی۔

۳۹۔ ٹسوے بہانا (جھوٹ موٹ آنسو بہانا)۔ نسیمہ نے خود ہی خاوند سے لڑائی کی اور باپ کے سامنے جا کر ٹسوے بہانا شروع کر دیا۔ عجیب عورت ہے

۴۰۔ لگائی بجھائی کرنا (خلاف بھڑکانا) لگائی بجھائی کرنے والے دوستوں میں نفرت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان سے ہر حال میں بچنا چاہیئے۔

۴۱۔ بھا دیں ہی نہ آنا (اچھا نہ لگنا، نہ بھانا)۔ میں نے تمہارے لیے کتنی چیزیں لے رکھی ہیں، لیکن تمہیں تو کوئی چیز بھا دیں ہی نہیں آتی۔

۴۲۔ نوج دور پار (خدانخواستہ) نوج دور پار شریفوں میں کبھی طلاق کی نوبت آتی ہے۔

۴۳۔ ہلدی چُونا لگانا۔ (مرہم پٹی کرنا) خوب پہلے خود ہی اس غریب کو مارا اور اب ہلدی چونا لگا رہے ہو۔

۴۴۔ نہال ہونا (خوش ہونا) اس خبر کو سنتے ہی تمہیں نہال ہو جانا چاہیئے تھا۔ یہ مُنہ کیوں بنا لیا ہے۔

۴۵۔ آفت کی پڑیا (فتنہ کی جڑ) یہ بڑھیا ہے کہ آفت کی پڑیا اسے مت چھیڑو۔

۴۶۔ بے نُقط سنانا (گالیاں دینا) بھئی میں تو اُس کے پاس جاتا نہیں وہ تو ہر ایک کو بے نقط سُنانے لگتا ہے۔

۴۷۔ خاک ہو جانا (تباہ ہو جانا) فسادات میں بشیر غریب کا سارا خاندان خاک ہو گیا ہے۔ ؎ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

۴۸۔ کل کل جھک جھک (جھگڑا تکرار) تم اپنا راستہ لو۔ مجھے یہ روز روز کی کل کل جھک جھک بالکل پسند نہیں۔

۴۹۔ کانا پھُوسی کرنا (آہستہ آہستہ باتیں کرنا) محفل میں ایک دوسرے سے کانا پھُوسی کرنا بدتہذیبی سمجھا جاتا ہے۔

۵۰۔ جی چھوٹ جانا (حوصلہ ہارنا) جوان بیٹے کی وفات سے تو اُس کا جی چھُوٹ گیا ہے۔ اب وُہ کاروبار کی طرف بالکل توجہ نہیں دے سکتا۔

۵۱۔ زبان سے ہاتھ پر اُتر آنا (گالی گلوچ سے ہاتھا پائی تک آپہنچنا) میں نے تو اصول کی بات بتائی۔ لیکن وہ ذات شریف زبان سے ہاتھ پر اُتر آیا۔ عجیب مردک ہے۔

۵۲۔ تھر تھری چھوٹ جانا (کانپنے لگنا) سردی کی وجہ سے غریب بڑھیا کی تھر تھری چھوٹ گئی۔

۵۳۔ پھُولے نہ سمانا (بہت خوش ہونا) پہلی نظم رسالہ میں شائع ہونے پر حمید

پھوٹے نہیں سمارہے۔

۵۴۔ مُنہ میں پانی بھر آنا (جی للچانا) سیٹھ کی تجوری میں نوٹوں کے بنڈل دیکھ کر منشی کے مُنہ میں پانی بھر آیا اور ایک بنڈل اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

۵۵۔ کُندی کرانا (سزا دلوانا) بدمزاج ساس نے بیٹے سے شکایت کر کے بہو کی خُوب کُندی کرائی۔

۵۶۔ مٹی میں ملنا (تباہ و برباد ہونا) پردیس میں آکر پھُول جیسی صورتیں مٹی میں رل گئی ہیں۔ اِسے گردشِ روزگار ہی کہہ سکتے ہیں۔

۵۷۔ کِھسیانی بلی کھمبا نوچے (شرم کے مارے جب کچھ نہ ہو سکے تو بے تکی باتیں کی جاتی ہیں) تم نے اتنا سرمایہ برباد کر دیا۔ اپنی ناتجربہ کاری کو چھپانے کے لیے قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کا حوالہ دے رہے ہو۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔

۵۸۔ دل بھاری ہونا (غمگین ہونا) یہ جانکاہ خبر سُن کر بیچاری ماں کا دل بھاری ہوا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

۵۹۔ خیر باد کہنا (چھوڑ دینا) اُس نے دلّی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔

۶۰۔ جان جوکھوں کا کام (سخت مُشکل کام) فوج کا ہر کام جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔

۶۱۔ خراجِ تحسین حاصل کرنا (داد حاصل کرنا) مقرر نے ایک شاندار تقریر کی اور ہر کہ و مہ سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

۶۲۔ اینٹھ کر رہ جانا (پیچ و تاب کھا کر رہ جانا) غریب کسان ظالم آقا سے کہاں انتقام لے سکتا تھا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات بیچارہ دل میں اینٹھ کے رہ گیا۔

۶۳۔ بھانڈا پھوٹنا (قلعی کُھل جانا) ذرا احتیاط سے کام لینا اگر کہیں بھانڈا پھوٹ گیا تو تمام مزا کِرکرا ہو جائے گا۔

۶۴۔ کھلے خزانے کہنا (کھلم کھلا)، میں کھلے خزانے کہہ رہا ہوں کہ اس سازش میں اسلم کا بھی ہاتھ ہے۔

۶۵۔ سدِّ راہ ہونا (رکاوٹ پیدا کرنا)، یاد رکھیئے آپ کی یہ غفلت کامیابی کے حصول میں سدِ راہ ثابت ہوگی۔

۶۶۔ ہمسری کرنا (برابری کرنا)، مولانا صاحب کا قبہ شکم گنبدِ فلک سے ہمسری کرتا ہے۔

۶۷۔ آن کی آن میں (تھوڑی سی دیر میں)، اس کام میں کونسی دیر لگے گی۔ بس آن کی آن میں ختم ہو جائے گا۔

۶۸۔ ہوا پر گرہ لگانا (عجیب وغریب کام کرنا)، زبان ایک چالاک عیار ہے جو ہوا پر گرہ لگاتا اور دل کے قفل کھولتا ہے۔

۶۹۔ جان کے برابر رکھنا (نہایت عزیز رکھنا)، فکر نہ کریں میں آپ کی امانت کو جان کے برابر رکھوں گا۔

۷۰۔ قیامت برپا ہونا (ہنگامہ ہونا)، وہ تو اچھا ہوا کہ زخمی لڑکے کے والد کو پتہ نہ چلا ورنہ قیامت برپا ہو جاتی۔

۷۱۔ خاک میں ملانا (تباہ وبرباد کرنا)، نالائق بیٹے نے باپ کی تمام اُمیدیں خاک میں ملا دیں ؎

دل مجھے اُس گلی میں لے جا کر اور بھی خاک میں ملا لایا

۷۲۔ دِل شکستہ ہونا (بددل ہونا)، حوصلہ مند مشکلات سے دل شکستہ نہیں ہوتے بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔

۷۳۔ ناک پر ٹکا رکھنا (نقد پیسے دینا)، آج تو یہ زمانہ ہے کہ جس سے کوئی چیز خریدو اُس کی ناک پر ٹکا رکھ دو۔ ورنہ کل کو جھگڑا ہوگا۔

۷۴۔ پاؤ بارہ ہونا (خوب فائدہ ہونا)، اگر آج ہی سودا ہو گیا تو پاؤ بارہ ورنہ تین کانے۔

۷۵۔ احتراز کرنا (پرہیز کرنا) برے آدمیوں کی صحبت سے احتراز کرنے میں بھلائی ہے۔

۷۶۔ معتد بہ اضافہ ہونا (کافی اضافہ ہونا) دُنیا کی آبادی میں روز بروز معتد بہ اضافہ ہو رہا ہے

۷۷۔ نظر انداز کرنا (چھوڑ دینا) معمولی فروگذاشتوں کو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

۷۸۔ حقِ رفاقت ادا کرنا (کسی کا ساتھ دینا) اکبر نے اپنے دوست کی خاطر قربانی دے کر حقِ رفاقت ادا کر دیا۔

۷۹۔ سرخاب کا پر لگنا (کوئی امتیازی خصوصیت ہونا) نہ جانے مقصود میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے کہ ہر وقت اسی کا دم بھرتے رہتے ہو۔

۸۰۔ دار و گیر میں مبتلا ہونا (پکڑ دھکڑ کی مصیبت میں پھنسنا) بدامنی کے زمانہ میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ شریف بھی دار و گیر میں مبتلا ہو جاتے ہیں

۸۱۔ لکیر کے فقیر رہنا (پرانی روش پر قائم رہنا) ترقی کے زمانہ میں جو لوگ لکیر کے فقیر رہیں گے ان کے لیے کامرانی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔

۸۲۔ مجذوب کی بڑ (بے معنی بات) اس کی باتوں کو میں تو مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

۸۳۔ خاطر جمع رکھنا (اطمینان رکھنا) خاطر جمع رکھیے میں بہت جلد حاضر خدمت ہو کر آپ کی شکایت دُور کر دُوں گا۔

۸۴۔ نو دو گیارہ ہونا (بھاگ جانا) خود غرض دوست دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں۔

۸۵۔ کافور ہونا (زائل ہونا) چڑھے ہوئے نشے تھے جو کافور ہو گئے۔

۸۶۔ پگڑی اُتارنا (بے عزتی کرنا) بزرگوں کی پگڑی اُتارنا نیک لڑکوں کا شیوہ نہیں ان کا ہمیشہ احترام کرنا چاہیے۔

ع پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی

۸۷۔ دھول دھپّا (مارپیٹ۔ چھیڑ چھاڑ):۔ یہ دھول دھپا مجھے پسند نہیں باز آجاؤ۔

ے دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

۸۸۔ دل لگانا (پیار ہونا)۔ دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز ے
نہیں دسواس جی گنوانے کے
ہائے رے ذوق دِل لگانے کے

۸۹۔ کسی کے پلّے باندھنا (شادی ہونا)۔ شادی کے معاملے میں عورتوں کو آزادی حاصل نہیں ہے۔ والدین کی مرضی ہے چاہے جس کے پلّے باندھ دیں۔

۹۰۔ بلائے جان ہونا (مصیبت کا باعث، دلکش)۔ ے
بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۹۱۔ از خود رفتہ ہونا (فریفتہ ہونا)۔ سوداگر کی جو آنکھ شہزادی پر پڑی۔ یک نگاہ از خود رفتہ ہُوا۔

۹۲۔ الم سے دِل کباب ہونا۔ (غم سے بے حال ہونا)۔ جنگ میں دونوں بیٹے مارے گئے۔ بیچارے کا الم سے دِل کباب ہوگیا۔

۹۳۔ بارِ ہستی سے سبکدوش کرنا (مار دینا)۔ سوداگر کو کاروانِ عدم کا ہم سفر کر بارِ ہستی سے سبکدوش کیا۔

۹۴۔ شیر اور بکری کا ایک گھاٹ پانی پینا (عدل و انصاف ہونا)۔ نوشیرواں کے زمانے میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ کسی کو کسی پر ظلم کرنے کی جرأت نہ تھی۔

۹۵۔ نیکی کر دریا میں ڈال (احسان کر کے بھول جانا)۔ کسی پر احسان کر کے معاوضہ کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ سچ ہے نیکی کر دریا میں ڈال۔

۹۶۔ آنکھوں سُکھ کلیجے ٹھنڈک (چشم ماروشن دل ماشاد) یہ کام مبارک ہے۔
اسے بے دھڑک کر۔ مثل مشہور ہے۔ آنکھوں سُکھ کلیجے ٹھنڈک

۹۷۔ منہ کالا کرنا (بدنام اور ذلیل ہونا) خدا اس ظالم کا مُنہ کالا کرے جس نے
عاجز پر ظلم ستم کیا۔

ط اللہ نے کالا کیا مُنہ اہل دغل کا

۹۸۔ تل دھرنے کی جگہ نہ ہونا (ذرا جگہ باقی نہ رہنا) صدر ایوب گاڑی سے اُترے
تو لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ پلیٹ فارم پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔

۹۹۔ تاؤ پیچ کھانا (غصہ آنا) ملعون تاؤ پیچ کھا کر کہنے لگا۔ ارے کوئی ہے جو اس
بدبخت لڑکی کو سنگسار کرے۔

۱۰۰۔ پُشت دکھانا (بھاگ نکلنا) چاہے دو دن تک کھانا نہ ملے مگر غنیم کو پُشت
نہ دکھائیں۔

۱۰۱۔ خوشی کے ڈنکے بجانا (خوشی کا اظہار کرنا) ایک عظیم لشکر خوشی کے ڈنکے
بجاتا ہُوا دُشمن پر ٹوٹ پڑا۔

۱۰۲۔ درگزرنا (ترک کر دینا) اس خیال سے درگزرو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

۱۰۳۔ گھن آنا (نفرت ہونا) ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا ہے اور باورچی خانہ کی
حالت دیکھ کر تو گھن آتی ہے۔

۱۰۴۔ راگ لانا (جوش میں آنا، جھگڑا نکالنا) راگ لانا نہ کہیں بُلبُل نالاں ہم سے۔

۱۰۵۔ اُڑان گھائیاں بتانا (دھوکا دینا، چُغلی کھانا) تم نے مجھے کوئی دیوانہ سمجھا ہُوا
ہے۔ جو ایسی اُڑان گھائیاں بتاتی ہو بتاتی۔ بتاؤ۔ نہیں بتاتی نہ بتاؤ۔

۱۰۶۔ کھایا پیا انگ لگنا (کھانا جزوِ بدن بننا) چلنے پھرنے محنت کرنے سے کھایا
پیا انگ لگتا ہے۔

۱۰۷۔ دگلہ سب سے اگلا (روئی والا انگرکھا اچھا ہوتا ہے) دگلہ سب سے اگلا پہنو
تو گرم، بچھاؤ تو نرم۔ باندھو تو بقچی کا بھرم۔

۱۰۸۔ منصوبے دھرے کے دھرے رہ جانا (آرزوئیں پوری نہ ہونا) نسیم کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی اُمید تھی، مگر وہ سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

۱۰۹۔ آنکھیں بھر آنا (آنکھوں میں آنسو آجانا)، دردناک داستان سُن کر بڑھیا کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ زار زار رونے لگی۔

۱۱۰۔ محنت پر پانی پھیر دینا (محنت ضائع ہونا) چور مونڈی کاٹے نے ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔

۱۱۱۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جانا (شرمندہ ہونا) جب سب کے سامنے راز افشا ہو گیا تو جاوید اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

۱۱۲۔ چھوئی موئی بنے ہونا (چڑچڑا ہونا) وہ آج کل چھوئی موئی بنے ہوئے ہیں اس بات کا خیال رہے۔ ان سے اس طرح پیش آئیں گویا وہ بیمار ہیں۔

۱۱۳۔ چاند کا ٹکڑا ہونا (خوبصورت ہونا) کاش ہماری بیوی بھی ایسا ہی چاند کا ٹکڑا ہوتی

۱۱۴۔ آئیں بائیں شائیں کرنا (ٹالنا۔ بہانے بنانا)، دیکھو آئیں بائیں شائیں نہ کرو۔ صاف صاف جواب دو۔

۱۱۵۔ تو ائی ڈالنا (جلد بازی سے کام لینا) توائی نہ ڈالنا کہیں۔ جہاں دس سال صبر سے کام لیتے رہے ہو وہاں پانچ منٹ اور صبر کر لو۔

۱۱۶۔ کفِ افسوس ملنا (پچھتانا)، جب موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو انسان کفِ افسوس ملتا ہے۔

۱۱۷۔ دلدر دُھل جانا (مصیبت ٹل جانا)، کچھ مل جائے تو بات ہے۔ تمام دُکھ دلدر دُھل جائیں۔

۱۱۸۔ دماغ چل جانا (پاگل ہونا)، تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کُریدا کر دو۔ ؎

دشت گردی کا نتیجہ تو نے دیکھا اے مجنوں
پاؤں کے ہاتھوں دماغ قیس چل کر رہ گیا

۱۱۹۔ سیاست پانا (سزا پانا)، جنگ ختم ہوئی ملک میں امن ہوا اور مجرم سیاست پانے لگے۔

۱۲۰۔ آنکھ لگ جانا (نیند آ جانا)، گاڑی کے چکروں میں کچھ ایسا مزا آیا کہ آنکھ لگ گئی۔

ع آنکھ لگتی نہ اگر آنکھ لگائی ہوتی

۱۲۱۔ غائب غلہ ہونا (بالکل غائب ہونا)، انہیں نت نئی تجویزیں سوجھتی رہتی ہیں جو دو تین دن میں غلہ غائب ہو جاتا ہے۔

۱۲۲۔ دم دے جانا (فریب دینا)، زندگی کا کیا اعتبار کس وقت دم دے جائے۔

ع دم دے نہ جائے ہستی ناپائدار دیکھ

۱۲۳۔ آنکھیں چرانا (کترانا)، ذرا سامنے آکر بات تو کرو۔ آنکھیں کیوں چراتے ہو۔ ؎

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی

وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا (امیرؔ)

۱۲۴۔ آنکھ لڑنا (نگاہیں دوچار ہونا)، جب سے کسی کافر سے آنکھ لڑی ہے قرار نہیں

؎ اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو

آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

؎ جب آنکھ سے اس ترک ستمگر کی لڑی آنکھ نرگس پہ پڑی آنکھ نہ آہو پہ پڑی آنکھ

۱۲۵۔ گل کھلانا (عجیب کام کرنا، فساد کرنا)، ذرا خبر تو لو صاحبزادے نے کیا گل کھلایا ہے

؎ زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

چند اہم محاورات

محاورات	معنی	استعمال
آڑے آنا	مصیبت میں کام آنا	ایسے دوست اب کہاں ملتے ہیں جو آڑے آئیں
اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا	اپنا نقصان خود کرنا	ہم ان کے فریب میں آکر اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار بیٹھے۔ اب اس کا کیا علاج۔
اپنا اُلّو سیدھا کرنا	اپنا ہی فائدہ دیکھنا	یہ خود غرضوں کی دُنیا ہے ہر ایک اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔
آٹے میں نمک ہونا	بہت تھوڑا ہونا	مغربی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔
آڑے ہاتھوں لینا	ذلیل و رسوا کرنا	بڑا چالاک بنتا تھا۔ ہم نے ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ کوئی پیش نہ گئی۔
آگ بگولا ہونا	غضبناک ہونا	بتائیے میں نے کونسی غلطی کی کہ آپ آگ بگولا ہوگئے۔
آسمان سے باتیں کرنا	بہت بلند ہونا	کوہ ہمالیہ کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔
آسمان سر پر اُٹھانا	شور مچانا	پروفیسر صاحب کا کمرے سے باہر نکلنا تھا کہ لڑکوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔
اُلٹی گنگا بہانا	دستور کے خلاف کام کرنا۔	تم نے تو دسمبر میں ململ کا کُرتہ پہن کر اُلٹی گنگا بہائی ہے۔
آنکھیں بچھانا	عزت کرنا	نیک آدمی کی راہ میں ہر شخص آنکھیں بچھاتا ہے آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں
آنکھ کا کاجل چرانا	چوری میں ماہر ہونا	ہائے موئے یہ چور ایسے جو آنکھ کا کاجل چُراتے ہیں۔

محاورات	معنی	استعمال
آنکھوں میں رات کاٹنا	رات جاگ کر گزارنا	عید کی خوشی میں آنکھوں میں رات کاٹ دی ع۔ آنکھوں میں کاٹ دی تیرے اختر شمار نے
آنکھوں میں خاک ڈالنا	فریب دینا	تم میری آنکھوں میں خاک ڈالنا چاہتے ہو۔ میں اتنا بیوقوف نہیں۔
آگ میں کودنا	دانستہ مصیبت میں پھنسنا	میاں جان بوجھ کر کیوں آگ میں کودتے ہو
آسمان کے تارے توڑنا	حیرت انگیز کام کرنا	انسان اپنی سعی مسلسل کی بدولت، آسمان کے تارے توڑ رہا ہے۔
انگاروں پر لوٹنا	بے قرار ہونا	جب گزرا ہوا زمانہ یاد آتا ہے تو ساری رات انگاروں پر لوٹتے گزر جاتی ہے۔
ایک لاٹھی سے سب کو ہانکنا	سب کے ساتھ برابر سلوک کرنا۔	میاں دیکھ کر بات کیا کرو۔ سب کو ایک۔ لاٹھی سے نہیں ہانکا کرتے۔
اینٹ سے اینٹ بجانا	تباہ کرنا	حملہ آور نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔
آگ برسنا	سخت گرمی ہونا	ع برسے گی یونہی آگ تو جینے کے نہیں ہم
آب آب ہونا	شرمندہ ہونا	ع ہم آب آب ہو گئے غیروں کے سامنے ع تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب
اپنے منہ میاں مٹھو بننا	اپنی تعریف آپ کرنا	دانا لوگ کبھی اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنتے۔ مزہ تو جب ہے کہ دوسرے لوگ بھی تعریف کریں
آستیں چڑھانا	لڑنے کے لئے تیار ہونا	سہ وہ آئے ذبح کرنے کو ہمارے ہم نے یہ جانا! انہیں خنجر بکف جس دم چڑھائے آستیں دیکھا
آنکھوں میں سرسوں پھولنا۔	ہر چیز بھلی معلوم ہونا	سہ دیکھتے ہی بہار گلشن پھولی آنکھوں میں زر سرسوں
آگ لگے پر کنواں کھودنا	بے وقت کوشش کرنا	پہلے ہی سوچ سمجھ کر کام کرنا تھا اب آگ لگنے پر کنواں کھودنا بیکار ہے۔

محاورات	معنی	استعمال
آنکھیں پھیر لینا	بے مروّتی کرنا	ع کیسی آنکھیں پھیر لیں مطلب نکل جانے کے بعد
اللّے تللّے کرنا	خوب مزے اڑانا فضول خرچی	اگر یونہی اللّے تللّے کرتے رہے تو کاروبار تباہ ہو جائے گا۔
آسمان میں تھگلی لگانا	ناممکن کام کرنا چالاکی کرنا	وہ تو اس قدر عیار عورت ہے کہ آسمان میں تھگلی لگاتی ہے
انگشت بدنداں ہونا	حیران ہونا	خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
باتیں بنانا	حیلے بہانے کرنا	باتیں بنانے سے کیا حاصل جو کام تمہارے سپرد ہے اُسے دل لگا کر کرو۔
بال بیکا ہونا	تکلیف ہونا۔ نقصان ہونا۔	آپ بے فکر رہیں کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا ؎ شانہ اغیار تو کرتے ہیں تیری زلفوں میں ہاتھ کاٹوں جو کوئی بال ہو بیکا تیرا
بال کی کھال اتارنا	باریکیاں نکالنا	وہ تو ہر لفظ میں بال کی کھال نکالتے ہیں، نکتہ چینی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔
باتوں میں آنا	فریب کھانا	نسیر بھولا آدمی تھا۔ جھٹ ان کی باتوں میں آگیا۔
باغ باغ ہونا	خوش ہونا	بچے کو خوش دیکھ کر ماں کا دل باغ باغ ہوگیا۔
بغلیں جھانکنا	لاجواب ہونا	وہ اپنے آپ کو ارسطو سمجھتا تھا میں نے ایک ہی سوال پوچھا تو بغلیں جھانکنے لگا۔
بیڑا اٹھانا	مشکل کام اپنے ذمہ لینا۔	طارق نے ہسپانیہ فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا اور خدا نے کامیابی عطا فرمائی۔ ع غضب کرتے ہیں بیڑا قتل عاشق کا اٹھاتے ہیں
بیڑا پار ہونا	انجام بخیر ہونا۔ کام پورا ہونا	اگر محنت کروگے تو بیڑا پار ہے۔

محاورات	معنی	استعمال
بے پر کی اُڑانا	گپ مارنا	عراق میں انقلاب آ گیا ؟ کسی نے بے پر کی تو نہیں اُڑائی ؟ ع ایسی بے پر کی اُڑاتا نہ تھا صیاد کبھی
بڑا بول بولنا	غرور کرنا	آدمی کو کبھی بڑا بول نہ بولنا چاہیئے
بول بالا ہونا	شہرت ہونا	ع بول بالا ہے زمانے میں ترا اے انصاف حالیؔ
بھیگی بلّی بتانا	فضول بہانے کرنا	سارا حال خود دیکھ کر آؤ بھیگی بلّی بتانے کی کوشش نہ کرو
پاپڑ بیلنا	مشکلات برداشت کرنا	تمہیں کیا معلوم تمہارے باپ نے تمہاری تعلیم کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔
پالا پڑنا	تعلق ہونا	کس احمق سے پالا پڑا ہے خدا خیر کرے۔
پانی بھرنا	تابعداری کرنا	بڑے بڑے سیاست داں صدر کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔
پانی پھیر دینا	ضائع کر دینا	اس نے تو میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔
پاؤں پھیلنا	لالچ کرنا	حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت تنگ ہی رہتے ہیں دُنیا میں فراغت والے
پانچوں انگلیاں گھی میں ہونا۔	خوشی حاصل ہونا	کاروبار ترقی پر ہے بچے بڑے عہدوں پر ہیں۔ آج کل پانچوں گھی میں ہیں۔
پاؤں اُکھڑنا	بھاگ کھڑے ہونا	جانباز مجاہد ایسی بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔
پاؤں توڑ کر بیٹھنا	کوشش ترک کر دینا	پاؤں توڑ کر نہ بیٹھو کچھ تو تدبیر کرو۔
پیٹ میں انگارے بھرنا	حرام مال کھانا	جو لوگ یتیموں کا مال خورد بُرد کرتے ہیں وہ پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں۔
پیٹ پر پتھر باندھنا	صبر کرنا۔ فاقہ کشی کرنا۔	غریب والدین نے پیٹ پر پتھر باندھ کر سلیم کو پڑھایا۔ اور اب وہ پروا ہی نہیں کرتا۔

محاورات	معنی	استعمال
پیٹ کا ہلکا ہونا	کم ظرف ہونا۔ راز نہ چھپا سکنا۔	ایسے بازاری لوگ پیٹ کے ذرا ہلکے ہوتے ہیں کوئی راز کی بات نہ کہہ بیٹھنا۔
پیٹ میں داڑھی ہونا	چھوٹی عمر میں عقلمند ہونا	حامد دس سال کی عمر میں دانائی کی باتیں کرتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیٹ میں داڑھی ہے۔
پھونک پھونک کر قدم رکھنا	بہت احتیاط کرنا	زمانہ بڑا نازک ہے پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔
پیٹھ ٹھونکنا	حوصلہ بڑھانا	اگر امریکہ ہندوستان کی پیٹھ نہ ٹھونکتا تو ہندوستان حملہ کرنے کی جرأت نہ کرتا۔
پہاڑ ٹوٹ پڑنا	سخت مصیبت آنا	اس کی بے وقت موت سے سارے گھر پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
تین پانچ کرنا	تکرار کرنا۔ جھگڑا کرنا	تین پانچ کرنے سے کیا حاصل یہ رقم تو تمہیں ادا کرنی پڑے گی۔
تارے گننا	رات جاگتے گزارنا	؎ دن گزرتا ہے تنکے چننے میں شب کو رہتے ہیں تارے گنتے ہم
تر دامن ہونا	گنہگار ہونا	؎ تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
تلوار کے گھاٹ اتارنا	قتل کرنا	غدر میں بیشمار بے گناہ مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔
تیوری چڑھانا	غصے میں آنا	پروفیسر صاحب تیوری چڑھائے داخل ہوئے اور تمام لڑکے خاموش ہو گئے۔
تختہ الٹنا	برباد کرنا	؎ تختہ دیتے ہیں الٹ سالسے وفاداروں کا
ترکی تمام ہونا	غرور جاتے رہنا	بہت ڈینگ مارتا تھا پہلے ہی دن ترکی تمام ہو گئی ؎ آیا وہ جھومتا جو صف کارزار میں ترکی تمام ہو گئی پہلے ہی وار میں

محاورات	معنی	استعمال
ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنا	چھپ کر بُرائی کرنا	اس سفید ریش کی باتوں میں نہ آنا۔ وہ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔
ٹس سے مس نہ ہونا	ذرا اثر نہ ہونا	میں نے بہتیرا سمجھایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہُوا۔
ٹسوے بہانا	جھوٹ موٹ آنسو بہانا	آپ ہی بڑھیا کو مارتی آپ ہی ٹسوے بہاتی
ٹھیس لگنا	صدمہ پہنچنا	؎ خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
جان کے لالے پڑنا	جان خطرے میں پڑنا	ع عشق میں اس گل کے اپنی جان کے لالے پڑ گئے
جلتی پر تیل ڈالنا	فساد بڑھانا	اس کی باتوں میں نہ آنا۔ اس کا کام تو جلتی پر تیل ڈالنا ہے۔
جوتیوں میں دال بٹنا	لڑائی جھگڑا کرنا	نا اتفاقی کی وجہ سے دونوں سگے بھائیوں کی بھی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔
جامے میں پھولا نہ سمانا	بہت خوش ہونا	اپنی کامیابی پر وہ جامے میں پھُولے نہ سماتے تھے
جی پہ کھیلنا۔	قربانی دینا	؎ یہ کہہ کے وہ ہوگیا روانہ دشوار ہے جی پہ کھیل جانا
جوئے شیر لانا	مشکل کام کرنا	انگریزی میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنا جوئے شیر لانا ہے۔
جان پر کھیلنا	جان خطرے میں ڈالنا	؎ جان دیتے ہیں آن پر عاشق کھیل جاتے ہیں جان پہ عاشق
جی چُرانا	ہمّت ہارنا	ع چراؤ نہ محنت سے جی زینہار
جوکھوں میں پڑنا	خطرے میں ہونا	میری جان جوکھوں میں پڑی ہے اور آپ کو مذاق کی سوجھی ہے۔
چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا	رکاوٹ پیدا کرنا	کسی کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے سے کیا فائدہ اگر کسی کا کام ہو رہا ہو تو ہونے دو۔

محاورات	معنی	استعمال
چار چاند لگنا	عزت بڑھنا	لڑکا مقابلے کے امتحان میں اوّل آگیا تو خاندان کی عزت میں چار چاند لگ جائیں گے۔
چراغ سحری ہونا چراغ سحر ہونا	مرنے کے قریب ہونا	؎ ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا ع چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
چاندی ہونا	ہر طرح فائدہ ہونا	ان کی تو آجکل ہر طرح سے چاندی ہے
چراغ لے کر ڈھونڈنا	کمال جستجو کرنا	؎ ہم سا جانباز زمانے میں نہ پاؤ گے کہیں لاکھ ڈھونڈو گے چراغ رُخ زیبا لے کر (داغ)۔
چھاتی پر مونگ دلنا	کسی کے سامنے ایسا کام کرنا جو اسے ناگوار ہو	تم میرے دشمنوں سے میل ملاپ کرکے میری چھاتی پر مونگ دلتے ہو۔
چھٹی کا دودھ یاد آنا	مصیبت کے وقت آرام کا وقت یاد آنا	تمہارے کرتوت اچھے نہیں۔ باز آجاؤ۔ ورنہ ایسی سزا ملے گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔
چھاتی پر سانپ لوٹنا	حسد میں جلنا	مجھے فارغ البال دیکھ کر اس کی چھاتی پر سانپ لوٹتا ہے۔
چولی دامن کا ساتھ ہونا	گہرا تعلق ہونا	ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔
چھکے چھوٹ جانا	حوصلہ ہار دینا	چینیوں کے حملے سے بھارتیوں کے چھکے چھوٹ گئے
حاتم کی قبر پر لات مارنا۔	حاتم سے زیادہ سخاوت کرنا (طنزیہ)	اس نے چار روپیہ چندہ دے کر اپنے خیال میں حاتم کی قبر پر لات ماری ہے۔
حلیہ بگاڑنا	شکل بگاڑنا	ڈاکوؤں نے مار مار کر مسافر کا حلیہ بگاڑ دیا۔
حرف آنا	بدنامی ہونا	؎ عزت پہ کچھ حرف نہ آئے جان تو جائے بات نہ جائے
خاک کرنا	برباد کرنا	؎ پڑا ننگ کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

محاورات	معنی	استعمال
خاک اُڑانا	بے فائدہ کوشش کرنا	اس طرح خاک اُڑانے سے کیا حاصل ہوگا۔
	آوارہ پھرنا	ع اُڑائی خاک تیری جستجو میں ہر کہیں برسوں
خاک میں ملانا	تباہ کرنا	لکھ لکھ کے مرا نام زمیں پر مٹا دیا اُن کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
خون پسینہ ایک کرنا	سخت محنت کرنا	اکبر نے امتحان کی تیاری میں خون پسینہ ایک کر دیا۔
خون سفید ہونا	محبت نہ رہنا	آج کل ایسا خون سفید ہوگیا ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ ؎ خون اپنوں کا ہوگیا ہے سفید یہ زمانے میں انقلاب ہوا
خیالی پلاؤ پکانا	یونہی منصوبے باندھنا	محنت سے کامیابی ہوتی ہے۔ یونہی خیالی پلاؤ پکانے سے کچھ نہ ہوگا۔
خونِ جگر پینا	رنج اُٹھانا	؎ خونِ جگر پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو یہ غذا ملتی ہے لیلیٰ تیرے دیوانے کو
داغ دینا	صدمہ پہنچانا	؎ داغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو وہ چراغِ شبِ تنہائی ہے (جلیل)
دال میں کالا ہونا	شبہ والی بات ہونا	تمہاری گھبراہٹ بتاتی ہے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے ؎ مُنہ پہ بکھرے بال ہیں اور کان کا ٹوٹا بالا ہے جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا ہے
دِل بُجھ جانا	مایوس ہوجانا کوئی آرزو نہ رہنا	ع کیا لُطفِ انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
دانت کھٹے کرنا	حریف کو شکست دینا	پاکستانی مجاہدوں نے بھارتی فوج کے دانت کھٹے کر دیئے
دِل کی کلی کھلنا	آرزو پوری ہونا	ع یارب کھلے گی دل کی کلی کس بہار میں
دال نہ گلنا	کامیابی نہ ہونا	اکبر نے بہت کوشش کی مگر بشیر کے مقابلے میں اس کی دال نہ گلی الیکشن بشیر کے ہاتھ رہا۔

محاورات	معنی	استعمال
دامن پھیلانا	التجا کرنا	میں اور کس کے آگے جا کر دامن پھیلاؤں۔
ڈنکا بجنا	شہرت ہونا	اقتصادی دُنیا میں آجکل امریکہ کا ڈنکا بج رہا ہے۔
ڈنکے کی چوٹ کہنا	اعلانیہ کہنا	میں یہ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ اب بھارت پاکستان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔
رال ٹپکنا	لالچ کرنا	پکے ہوئے آم دیکھ کر اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔
راس آنا	موافق آنا	مجھے یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی۔
راہ نکالنا	تدبیر نکالنا	بھائی اُن سے ملنے کی کوئی راہ نکالو۔ ورنہ کام ہوتا نظر نہیں آتا۔
رائی کا پہاڑ بنانا	مبالغہ کرنا	تمہاری تو یہ عادت ہے کہ بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہو۔
رنگ رلیاں منانا	عیش و عشرت کرنا	عیاش لوگ رنگ رلیاں مناتے رہتے ہیں
رونگٹے کھڑے ہونا	خوفزدہ ہونا	آتشزدگی کی خبر سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے
رال ٹپکنا	لالچ ہونا	؎ زاہد کی جس پہ رال ٹپکتی ہے وہ شراب وہ ایماندار شخص تھا لیکن سونے کا ڈھیر دیکھ کر اُس کی بھی رال ٹپکنے لگی۔
زخم بھرنا	زخم اچھا ہونا	؎ تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
زخم پر نمک چھڑکنا	دُکھ کو بڑھانا	میرے زخموں پر نمک چھڑک کر تمہارا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔
زمین آسمان کے قلابے ملانا	مبالغہ کرنا	اُس نے مہمان خصوصی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔
زندہ در گور ہونا	تکلیف میں ہونا	وہ اکلوتے بیٹے کی موت سے زندہ در گور ہے۔

محاورات	معنی	استعمال
زہر اُگلنا	خلاف کہنا	وہ ہر جگہ میرے خلاف زہر اُگلتا پھرتا ہے
زہر کے گھونٹ پینا	صبر کرنا	دشمنوں کے طعنے سُن کر زہر کے گھونٹ پی کے رہ جاتا ہوں۔
زمین میں گڑ جانا	شرمندہ ہونا	؎ بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
سانپ کے منہ میں اُنگلی دینا	عمداً خطرے میں پڑنا	اس نے پولیس والوں کے خلاف شہادت دے کر سانپ کے مُنہ میں اُنگلی دی ہے۔
سبز باغ دکھانا	دھوکا دینا	تسلیم نے اقبال کو سبز باغ دکھا کر گھر سے فرار ہونے پر آمادہ کرلیا۔
سکہ بیٹھنا	رعب جمنا	ع سکہ بیٹھا ہے زمانے پر مسلمانوں کا
سنبھالا لینا	افاقہ ہونا	ع لے رہا ہے تیرا بیمار سنبھالا آجا
سورج کو چراغ دکھانا	عقلمند کو سمجھانا	اس جیسے شائستہ انسان کو آداب سکھلانا سُورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔
سر تسلیم خم کرنا	مان لینا	ع سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے
سینگ سمانا	پناہ ملنا	پھر ایسی بھگڈر پڑی جس کے جدھر سینگ سمائے نکل گیا۔
سانپ سونگھ جانا	خاموش ہو جانا	بولتے کیوں نہیں کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔
شامت آنا	بُرے دن آنا	؎ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
شانہ سے شانہ چھلنا	بہت بھیڑ ہونا	شالامار باغ کے میلے پر اتنا ہجوم تھا کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا
ششش و پنج میں ہونا	اُلجھن میں رہنا	تمام رات اسی شش و پنج میں رہا کہ آخر مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

محاورات	معنی	استعمال
شگوفہ چھوڑنا	افواہ اڑانا	نہ جانے کس نے شگوفہ چھوڑا کہ حامد اور میرے درمیان لڑائی ہو گئی ہے۔
شیخی کرکری ہونا	غرور جاتا رہنا	بڑا لائق بنا پھرتا تھا۔ امتحان میں فیل ہو گیا اور تمام شیخی کرکری ہو گئی۔
شیر و شکر ہونا	مکمل اتحاد ہونا	اکرم اور طاہر دونوں باہم شیر و شکر تھے۔ مگر آج کل تو جانی دشمن ہیں۔
شیطان کی آنت	بہت لمبی	یہ کہانی ہے یا شیطان کی آنت۔ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔
شیطان کی خالہ	مکار عورت	اس بڑھیا کی باتوں میں نہ آنا۔ وہ شیطان کی خالہ ہے
شیشہ میں اتارنا	موہ لینا	مظہر صاحب بھی کمال کے آدمی ہیں۔ کوئی کیسا ہی آدمی ہو اسے شیشے میں اُتار لینا، ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔
صلواتیں سُنانا	بُرا بھلا کہنا	بعض آدمیوں کو خواہ مخواہ صلواتیں سُنانے کی عادت ہوتی ہے۔
طاق ہونا	ماہر ہونا	؏ ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا
طشت از بام کرنا	راز ظاہر کرنا	اس نے واقعہ قتل کا تمام راز طشت از بام کر دیا۔
طور بے طور ہونا	حالت بگڑنا	؎ طور بے طور ہوئے جاتے ہیں آپ کچھ اُور ہوئے جاتے ہیں
طوطی بولنا	رعب ہونا	اس وقت دُنیا میں امریکہ کا طوطی بول رہا ہے ؏ خُوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا
طبیعت آنا	عاشق ہونا	؏ کیا بھلے دن تھے طبیعت جب کہیں آئی بھی
طرح ڈالنا	بُنیاد رکھنا	میر اُنیس نے اُردو شاعری میں مرثیہ گوئی کی طرح ڈالی ؎ طرح ڈالو نئے زمانے کی۔ یاد کیا پچھلے آشیانے کی

محاورات	معنی	استعمال
طوطے کی طرح آنکھیں بدلنا۔	بے حیائی کرنا	میں نے نظیر پر بہت احسان کئے لیکن اب وہ طوطے کی طرح آنکھیں بدل گیا ہے۔
طوطا چشمی کرنا	بے وفائی کرنا	مطلب پرست لوگ مطلب نکل جانے کے بعد طوطا چشمی کرنے لگتے ہیں۔
عرق عرق ہونا	شرمندہ ہونا	جاوید چوری کرتے پکڑا گیا اور مارے شرم کے عرق عرق ہو گیا۔
عش عش کرنا	بہت تعریف کرنا	سرکس میں موٹر سائیکل کے کرتب دیکھ کر سب عش عش کرنے لگے۔
عقدہ وا ہونا	مشکل حل ہونا	؎ وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا
عنقا ہونا	کسی چیز کا نہ ملنا	خالص گھی تو آج کل عنقا ہو گیا ہے۔ ڈھونڈے نہیں ملتا
عید کا چاند ہونا	کبھی کبھی نظر آنا	آپ تو عید کا چاند ہو گئے ہیں، کبھی نظر ہی نہیں آتے
عقل کے ناخن لینا	ہوش کی بات کرنا	میاں کیسی بے تکی باتیں کر رہے ہو ذرا عقل کے ناخن لو
قافیہ تنگ کرنا	دق کرنا	غنڈہ ایکٹ نے بدمعاشوں کا قافیہ تنگ کر دیا ہے۔
قلعی کھل جانا	حقیقت ظاہر ہونا	سچائی کبھی چھپ نہیں سکتی۔ لاکھ چھپاؤ مگر آخر قلعی کھل ہی جائے گی۔
قیامت برپا کرنا	ہل چل مچا دینا	؎ محشر کے روز تجھ کو نہ دے گا اگر خدا کرنی پڑے گی اور قیامت بپا مجھے
قدم لینا	استقبال کرنا، پاؤں چومنا	؏ کانٹوں نے آج شوق سے میرے قدم لیئے
قسمت کا ہیٹا ہونا	بدقسمت ہونا	ہم ہی قسمت کے ہیٹے نکلے جنہیں کبھی کامیابی نصیب نہ ہوئی
کالا منہ کرنا	بدنام ہونا، برائی کرنا	؎ باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی کالا کرے گا منہ بھی جو داڑھی سیاہ کی

محاورات	معنی	استعمال
کام تمام کرنا	خاتمہ ہونا	ظالم جلاد نے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ ؎ دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
کالے کوسوں دُور	بہت دُور	پرانے ڈھنگ کی عورت ہے بیٹے کا کالے کوسوں دُور جانا پسند نہیں کرتی۔
کان بھرنا	چُغلی کھانا	دُشمن نے ان کے اتنے کان بھرے کہ اب وہ میری صورت سے بھی بیزار ہیں۔
کان پکڑنا	توبہ کرنا	؎ پہلوان اپنے مقاموں پہ اکڑ لیتے ہیں جب لیا نام علیؑ کان پکڑ لیتے ہیں۔
کان پر جوں نہ رینگنا	بالکل اثر نہ ہونا	میں نے اسے بہترا سمجھایا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔
کاٹھ کا اُلو	بیوقوف	وہ تو کاٹھ کا اُلو ہے۔ آپ اُسے بڑا عقلمند سمجھتے ہیں۔
کان ہونا	خبردار ہونا	اچھا صاحب! کان ہوئے آیندہ ہم کسی کام میں دخل نہ دیں گے۔
کانوں میں انگلیاں دینا	توجہ نہ کرنا۔	اگر تمہیں میری بات ناگوار گزرتی ہے تو کانوں میں اُنگلیاں دے لو۔
کان کترنا	بہت عیار ہونا	اس کو بھولا بھالا نہ سمجھو۔ وہ تو بڑوں بڑوں کے کان کترتا ہے۔
کلیجہ مُنہ کو آنا	سخت صدمہ پہنچنا بہت پریشان ہونا	سنہ ۱۹۴۷ء کے واقعات سُن کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے ؎ کلیجہ مُنہ کو آتا ہے تمہاری آہ وزاری سے
کلنک کا ٹیکہ	بدنامی	یہ کلنک کا ٹیکہ تمہارے ماتھے پر ہمیشہ رہے گا۔
کندھا دینا	سہارا دینا	کسی غریب کو مصیبت میں کندھا دینا نیکی کا کام ہے
کچی گولیاں کھیلنا	ناتجربہ کار ہونا	میں نے کوئی کچی گولیاں کھیلی ہیں جو اس کے جھانسے میں آجاؤں

محاورات	معنی	استعمال
گردن مارنا	قتل کرنا	؎ قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے اس کی خطا نہیں یہ میرا قصور تھا
گلے کا ہار ہونا	تکلیف کا باعث ہونا کسی کے پیچھے پڑ جانا	میں ذرا مہربانی سے پیش آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نواب گلے کا ہار ہی بن گیا۔
گردن جھکانا	اطاعت کرنا	خوددار آدمی کسی ظالم حاکم کے سامنے گردن نہیں جھکاتا۔
گونگے کا خواب	مبہم بات	؎ تعبیر کیا کہے کوئی گونگے کے خواب کی
گُن گانا	تعریف کرنا	میں تو ہمیشہ آپ کی نوازشوں کے گُن گاتا رہتا ہوں۔
گھوڑے بیچ کر سونا	بے فکری کی نیند سونا	امتحان کے بعد تم ایسے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ پڑھنے لکھنے کی پروا نہیں۔ سورج نکل آیا ہے مگر اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ کیا گھوڑے بیچ کر سوئے ہو۔
گھی کے چراغ جلانا	خوشی منانا	ایک ہی بانڈ خریدا تھا۔ بیس ہزار کا انعام نکلا ہے گھی کے چراغ نہ جلائے تو کیا کرے۔
لات مارنا	ٹھکرا دینا	وہ دُنیا کی خوشیوں پر لات مار کر فقیر ہو گیا ہے۔
لال پیلا ہونا	بہت ناراض ہونا	خواہ مخواہ لال پیلے کیوں ہو رہے ہو۔ عقل کی بات کرو
لکیر کا فقیر ہونا	پُرانی رسموں کا پابند ہونا	سائنس کے آلات کی ترقی کے باوجود ہمارا کسان لکیر کا فقیر ہے۔
لہو سفید ہونا	محبت جاتے رہنا	میاں آجکل محبت اور مروت کہاں ہے لہو سفید ہو گیا
لوہا ماننا	کسی کی طاقت کا قائل ہونا	پاک بھارت جنگ میں دُنیا نے پاکستان کا لوہا مان لیا۔
لہو لگا کر شہیدوں میں ملنا	معمولی کام کر کے زیادہ نام چاہنا۔	؎ ناخن سے بوالہوس کا گلا یوں ہی چھل گیا وہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

استعمال	معنی	محاورات
؎ ہم نے سودا کیا کیا لینے کے دینے پڑ گئے	فائدہ کی بجائے نقصان ہونا	لینے کے دینے پڑنا
وہ ملازمت کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر بے سُود	آوارہ پھرنا	مارا مارا پھرنا
جب تک مٹھی گرم نہ کرو کوئی اہلکار تمہارا کام نہیں کریگا۔	رشوت دینا	مٹھی گرم کرنا
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا	حاجت پوری کرنا	مراد بر لانا
جب میں نے اصل واقعہ دریافت کیا تو اس کے مُنہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔	رنگ فق ہونا	مُنہ پر ہوائیاں اُڑنا
صاحب تو موم کی ناک ہیں جو جس طرح چاہتا ہے کام کروا لیتا ہے۔	ہر ایک بات مان لینا	موم کی ناک
پکے پکے پھلوں کے ڈھیر دیکھ کر مجید کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔	جی للچانا	مُنہ میں پانی بھر آنا
؎ ہو گیا خاموش جب مُنہ کی اسے کھانی پڑی	شکست فاش ہونا	مُنہ کی کھانا
آج بڑے خوش نظر آتے ہو شاید کوئی میدان مارا ہے۔	لڑائی جیتنا۔ کامیاب ہونا	میدان مارنا
یہ پٹواری تو تحصیلدار صاحب کی ناک کا بال ہے خیال رکھیئے گا۔	عزیز ہونا	ناک کا بال ہونا
تم ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہو۔ سید سے مُنہ بات نہیں کرتے۔	غصہ میں آنا۔ نفرت کرنا۔	ناک بھوں چڑھانا
چھوکرے نے وہ کام کیا کہ تمام خاندان کی ناک کٹوا دی۔	رسوا کرنا	ناک کٹوانا
جنگِ آزادی میں کشمیریوں نے بھارتی فوج کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔	بہت تنگ کرنا	ناکوں چنے چبانا
پولیس کے پہنچتے ہی ڈاکو نو دو گیارہ ہو گئے۔	بھاگ جانا	نو دو گیارہ ہونا

محاورات	معنی	استعمال
نکو بنا	رسوا ہونا	کیا بتاؤں ان بدبختوں نے مجھے نکو بنا رکھا ہے۔
نگاہ چُرانا	احتراز کرنا	لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
ہاتھوں ہاتھ لینا	خوب بِکری ہونا	نیا ڈیزائن بڑا مقبول ہُوا ہے۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں۔
ہوا اکھڑ جانا	اعتبار جاتا رہنا	کیا کروں ایسی ہوا اکھڑی ہے کہ کوئی دمڑی کا بھی ادھار نہیں دیتا۔
ہاتھ پاؤں مارنا	کوشش کرنا	دسترس جب دامن قاتل تلک ممکن نہیں ہاتھ پاؤں مارتا ہے خون میں اے بسمل عبث
ہاتھ بٹانا	مدد کرنا	بچوں کو گھر کے کام کاج میں ماں باپ کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔
ہوائی اُڑانا	بات مشہور کرنا	؎ کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جُدائی ہوگی یہ ہوائی کسی دُشمن نے اُڑائی ہوگی
ہاتھ ملنا	افسوس کرنا	ع ہاتھ ملتے ملتے سب رنگ حنا جاتا رہا
ہاتھ صاف کرنا	لوٹ لینا	آج رات چوروں نے تین گھروں پر ہاتھ صاف کئے۔
ہاں میں ہاں ملانا	اتفاق رائے کرنا	لوگ ہاں میں ہاں ملا کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیتے ہیں۔
ہاتھوں کے طوطے اُڑ جانا	حیران رہ جانا بدحواس ہونا	ایسی خوفناک خبر کے سُنتے ہی اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔
ہتھیلی پر سرسوں جمانا	بہت جلد کام کرنا عجیب کام کرنا	اتنے تھوڑے وقت میں آپ نے اتنی عمدہ اور طویل نظم لکھ کر ہتھیلی پر سرسوں جما کے رکھ دی۔
ید طولیٰ ہونا	حاضر ہونا	ع سر اُڑانے میں ہے ظالم ید طولیٰ ہم کو

ضرب الامثال

ضرب الامثال	معنی
ایک انار سو بیمار	ایک چیز کے بہت سے طلب گار
آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا	ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں پھنس جانا۔
ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے	ایک ہی مزاج کے آدمی
اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت	بے وقت پچھتانے سے کچھ فائدہ نہیں
آسمان کا تھوکا منہ پر	اچھوں کو بُرا کہنے سے اپنی ہی ذلت ہوتی ہے
آم کے آم گٹھلیوں کے دام	دوہرا نفع
اندھے کے آگے روئیے اپنے نین کھوئیے	بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے بے فائدہ کوشش
اُونچی دُکان پھیکا پکوان	نام بڑا اور درشن چھوٹے۔
ایک کریلا اور دوسرا نیم چڑھا	پہلے ہی خراب ہونا اور پھر مزید خرابی کے اسباب پیدا ہونا۔
آپ کاج مہا کاج	کام وہی بہتر ہے جو خود کیا جائے۔
اشرفیاں لٹیں کوئلوں پر مہر	فضول کام پر زیادہ خرچ لیکن ضروری کام میں کنجوسی
اُلٹے بانس بریلی کو	جہاں کسی چیز کی کثرت ہو وہاں اُس چیز کو لے جانا۔
اُونٹ کے مُنہ میں زیرا	ضرورت کے لحاظ سے بہت کم چیز
بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔	مجرم ایک دن پکڑا جائے گا۔
بغل میں چھری مُنہ میں رام رام	ظاہر اور باطن میں فرق ہونا۔
بوڑھی گھوڑی لال لگام	وقت پیری شباب کی باتیں۔

ضرب الامثال	معنی
بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی	جو کچھ مل جائے بہتر ہے۔
بہتی گنگا میں ہاتھ دھولو	موقعہ سے فائدہ اُٹھانا۔
پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں	سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔
پتھر کو جونک نہیں لگتی	بدفطرت پر نصیحت کا اثر نہیں ہوتا۔
تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو	سوچ سمجھ کر کام کرو نتیجہ کا انتظار کرو۔
تھوتھا چنا باجے گھنا	جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے۔
جب تک سانس تب تک آس	دُنیا بہ اُمید قائم ہے۔
جتنی چادر دیکھئے اُتنے پاؤں پھیلایئے	آمدنی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے۔
جیسا دیس ویسا بھیس	ماحول کے مطابق ہونا۔
جس کا کام اُسی کو ساجے	ہر آدمی ہر کام کا اہل نہیں ہوتا۔
جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے	خُدا مہربان ہو تو کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔
چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے	بے حد کنجوس ہونا۔
چھاج بولے سو بولے چھلنی کیا بولے	جو خود عیب دار ہو دوسروں کے عیب کیوں گنوائے۔
چور کی داڑھی میں تنکا	خیانت کرنے والا ہمیشہ ڈرتا ہے۔
چراغ تلے اندھیرا	غیر فائدہ اُٹھائیں اور اپنے محروم رہیں۔
چوروں کے کپڑے لاٹھیوں کے گز	مال مُفت دِل بے رحم
چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے	بُری عادت مشکل سے جاتی ہے۔
حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ	دوسروں کے مال سے بخشش کرنا۔
خُدا گنجے کو ناخن نہ دے۔	کمینے کو خدا صاحب اختیار نہ کرے
خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔	صحبت کا اثر مسلّم ہے۔

ضرب الامثال	معنی
دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر	بڑے آدمی یا مالک سے بگاڑ
دُور کے ڈھول سہاونے	دُور کی چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔
دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا	نکما آدمی۔
دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی	معمولی چیز پر زیادہ خرچ
دام بنائے کام	پیسے سے سب کام ہو جاتے ہیں۔
ڈوبتے کو تنکے کا سہارا	مصیبت کے وقت تھوڑی سی مدد بھی غنیمت ہے
سانپ نکل گیا اب لکیر پیٹا کر	موقع جاتا رہا اب افسوس بیکار ہے۔
سانچ کو آنچ نہیں	سچا کبھی نقصان نہیں اُٹھاتا۔
سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے	کام بھی ہو جائے اور نقصان بھی نہ ہو۔
سر منڈاتے ہی اولے پڑنا	شروع ہی میں مصیبت کا سامنا
سیوا بن میوہ نہیں	جس نے خدمت کی مخدوم بنا۔
طویلے کی بلا بندر کے سر	قصور کسی کا سزا کسی کو۔
غرور کا سر نیچا	تکبر عزازیل را خوار کرد۔
غریب کی جورو سب کی بھابی	غریب پر سب کا زور چلتا ہے۔
کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی	دھوکا بار بار کامیاب نہیں ہوتا۔
کوئلوں کی دلالی میں مُنہ کالا	برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔
کہاں راجہ بھوج کہاں گنگا تیلی	عالم اور جاہل کا کیا مقابلہ۔
گھر کی مُرغی دال برابر	گھر کی عمدہ چیز کی قدر نہ کرنا۔
مُفلسی میں آٹا گیلا	مصیبت تنہا نہیں آتی۔
نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی	نہ شرط ادا ہوگی نہ کام ہوگا۔
ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا	خوئے بدرا بہانہ بسیار
نیکی اور پوچھ پوچھ	نیک کام کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں
مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال	مفت کی چیز ناجائز بھی جائز ہے۔

محاورات	استعمال
وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔	عیش کے دن جاتے رہے۔
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا	عیاں اور ظاہر چیز
ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں	جو بات بڑے مان لیں وہ سب کو ماننی پڑتی ہے۔
ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات	ہونہار بچے شروع سے پہچانے جاتے ہیں۔
ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور	ظاہر کچھ باطن کچھ
یہ منہ اور مسور کی دال	کسی چیز کے اہل نہ ہونا۔

محاوروں کی زبان میں

(ذیل کی عبارت میں تقریباً دو سو محاورات ضرب الامثال وغیرہ ہیں جنہیں کالج کے ایک طالب علم فیاض عادل نے جمع کیا ہے۔ انہیں غور سے پڑھیئے اور نشان لگاتے جائیے)

ایک دن یونہی بیٹھا خیالی پلاؤ پکا رہا تھا کہ دل نے کہا "یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو ؟ کوئی ایسا تیر مار کر دکھاؤ جس سے چار لوگوں میں نام تو ہو۔ آخر کب تک مفت کی روٹیاں توڑتے رہو گے ؟" بات من کو بھا گئی۔ دماغ پر زور ڈالا تو یہ دُور کی سوجھی کہ ایسا اوٹ پٹانگ مضمون لکھا جائے جس کے ہر جملے میں کم از کم ایک محاورے یا ضرب المثل کا روڑا اٹکا ہو۔ اگر چھپ گیا تو بس وارے نیارے ہیں۔ پھر تو پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑاہی میں۔ اپنی ادبیت کا بھی ڈنکا

بچ جائے گا گو کہ ہے لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہونے والی بات۔ پھر سوچا کہاں پدی اور کہاں پدی کا شوربا! ہوش کی دوا لوں۔ ادیبوں کی صف میں جگہ حاصل کرنا کوئی خالہ جی کا گھر تو نہیں۔ یہاں تو بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ بیٹھے بٹھلائے یہ کیا خبط سر پہ سوار ہو گیا؟ لیکن فوراً ہی جرأت نے میرا دل بڑھایا اور میں کمر ہمت باندھ کر لکھنے بیٹھ گیا یوں حضرات! ہلدی کی گرہ لے کے پنساری بن بیٹھا۔

رات بھیگ چلی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ آدھی خدائی گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھی لیکن نیند مجھ سے کالے کوسوں دُور تھی۔ پہاڑ سی رات کیسے کٹے؟ یہ سوچ کر میں ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں مصروف ہو گیا کاٹھ کی ہنڈیا آخر کب تک چڑھی رہتی۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ڈٹ گیا۔ لیکن میں جلد ہی تھک کر چور ہو گیا۔ کمر سیدھی کرنے کو پاؤں جو پسارے تو آنکھ لگ گئی۔ اب میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔

خواب میں ایک چور کو دیکھا جسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا اور اب اس کے گرد لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر طرف ہا ہا کار مچی تھی۔ غل غپاڑا اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چور بے چارہ خود تو شرم سے پانی پانی ہو ہی رہا تھا اس پر مستزاد تماشائیوں کی بھانت بھانت کی بولیاں۔ اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ ٹھیک ہے جتنے مُنہ اُتنی ہی باتیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ بعض منچلے تو اسے ہاتھ تک دکھانے پر تلے ہوئے تھے۔

میری جو شامت آئی بیچ بچاؤ کی نیت سے اس معاملے میں کُود پڑا۔ چھوٹتے ہی سب لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور لگے بے نقط سنانے۔ آدمی ہوتا تو آئندہ پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے سے کان پکڑتا لیکن میرے سر میں تو نصیحت کا سودا سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ اُن لوگوں کے سامنے

سر کھپانے لگا کہ "بھائیو! اس بے چارے کا قافیہ کیوں تنگ کئے ہوئے ہو؟ اس پر تو پہلے ہی گھڑوں پانی پڑ چکا ہے اوپر سے تم جلی کٹی سنا کر اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو! یہ تو وہی بات ہوئی مرے کو مارے شاہ مدار۔ صاحبو! عقل کے ناخن لو! کیوں غریب کے خون کے پیاسے ہو رہے ہو؟ تم لوگوں نے کبھی چوری کے مال سے گل چھرے نہیں اڑائے کیا؟ جو یوں اس بے چارے کی مٹی پلید کر رہے ہو۔ ہٰذا اپنے گریبان میں تو جھانک کے دیکھو۔ دیگراں را نصیحت خود را فضیحت"۔ بھلا نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے! میری باتوں سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ مجھے اپنی دال گلتی نظر نہ آتی تھی۔ اسی جھنجھٹ میں تھا کہ ہر چیز اڑن چھو ہو گئی۔ نہ وہ گھوڑا رہا نہ وہ میدان۔ چلو خلاصی ہوئی۔

جب میں اس خواب سے اپنے آپ میں آیا تو یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ سورج سوا نیزے پر آ چکا ہے۔ اور گرمی کا یہ عالم ہے کہ چیل بھی انڈا چھوڑ دے۔ ادھر بھوک کے مارے میری انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ جیب ٹٹولی تو وہاں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی بس اللہ کا نام تھا۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ کسی دوست کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا خیال آیا مگر ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ اگر اس نے ٹکا سا جواب دے دیا تو اپنی بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔ مزید قیاس کے گھوڑے دوڑائے لیکن گتھی کسی طرح سلجھتی نظر نہ آئی تھی۔ ناچار خدا کا نام لے کر ایک طرف منہ اٹھائے چل پڑا۔

رستے میں ایک اور جگہ دو غنڈوں کے درمیان تو تو میں میں ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تماشائیوں نے حاشیے چڑھا چڑھا کر بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ انجام کار رہا تھا پائی تک نوبت آ پہنچی۔ دونوں کے حامی بھی آپس میں گتھ گئے اب جو سر پھٹول ہوا ہے تو خدا کی پناہ۔ لڑنے والوں کو دن میں تارے ہی نظر آ گئے ہوں گے۔ جوتوں میں دال بٹنے والا محاورہ اب میری سمجھ میں آیا۔ تاہم

فریقین کی اینٹ سے اینٹ بجنے میں بس تھوڑی سی کسر رہ گئی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے یا سانپ کا کاٹا رسی سے بھی ڈرتا ہے، مجھے پچھلے تجربے سے اتنے کان ہو چکے تھے کہ اس دفعہ کنی کترا کر نکل جانے ہی میں خیریت سمجھی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔

کچھ دور جا کر دم لینے کو رکا تو چند لنگوٹیے یاروں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ دوست بھی مجھے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد ہم سب گپ اڑانے لگے۔ اختر نے لہر میں آکر ڈینگ ماری "آج میں نے اپنی بندوق سے جنگلی کبوتروں کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ اور بھیڑیوں کی فوج کو تتر بتر کر دیا۔" شریف نے جل بھن کر کہا "کہنا تو یہ چاہیئے تھا کہ تم چھپے رستم نکلے۔ لیکن تمہاری خودستائی کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو"۔ امیر باپ کے لاڈلے بیٹے اختر نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "منہ سنبھال کر بات کرو! تم گڑ کھانے والے ہم امیروں کے منہ آتے ہو؟ یہ منہ اور مسور کی دال!" شریف سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا "تم بھی اپنی زبان کو لگام دو ۔ مجھ سے تین پانچ کی تو مزا چکھا دونگا!" اس طرح ان دونوں کے درمیان تو تکار طول کھینچتی چلی گئی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ شرپسند گلزار کو سنہری موقع ہاتھ آگیا۔ وہ لگا جلتی پر تیل ڈالنے۔ اس کی باتوں میں آکر دونوں دوست گتھم گتھا ہو گئے۔ اور بھس میں آگ لگا جالو دور کھڑی —— وہ اُن کے جھگڑے سے لطف اندوز ہونے لگا۔

جب اُونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہ آیا تو مجھے مزید صبر کا یارا نہ رہا۔ مرتا کیا نہ کرتا میں نے دوستانہ مروت کو بالائے طاق رکھ کر گلزار کو دو چار سنائیں اور اسے چلتا کیا۔ خس کم جہاں پاک —— وہ تو رفو چکر ہو گیا لیکن ادھر ابھی تک دونوں کے دل کی بھڑاس نہیں نکلی تھی۔ میں نے للو پتو کرتے ہوئے ان سے کہا۔ "دوستو! آپے سے باہر کیوں ہوتے ہو؟ اتنے لال پیلے نہ ہو۔ غصہ تھوک دو۔

ابھی کل تک تو تم دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ آپس میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ اب نہ معلوم تمہارے خون کیوں سفید ہو گئے؟ —— خدا لگتی تو یہ ہے کہ ابھی اپنے پچھلے کئے پر پانی پھیر دو۔ اس پر آٹھ آٹھ آنسو بہاؤ اور آئندہ کے لیے ایسی باتیں زبان پر لانے سے توبہ کر دو۔" لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات معلوم ہوتا تھا۔ ان کے دیدے کا پانی ڈھل چکا تھا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور دھینگا مشتی پر آ گئے، اور زیادہ بڑھ بڑھ کر بولنے لگے۔ میں نے دوبارہ اونچا بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا "غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ بزرگوں کے اس قول کو پلّے باندھ کر رکھو۔"

جمشید ابھی تک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائے کھڑا تھا۔ جب میری کوئی پیش نہ گئی اور معاملہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا گیا تو اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہ اب خم ٹھونک کر اور کمر کس کر میدان میں اتر آیا۔ میں بھی یہ سوچ کر کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے جمشید کے ساتھ مل ان دونوں شوریدہ سروں پر پل پڑا۔ انہیں وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ چھٹی کا دودھ ہی تو یاد آگیا ہوگا۔ ہم نے مار مار کر ان کا کچومر نکال دیا لیکن دوسری طرف ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آیا۔ ہم نے ان دونوں سے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا۔ اس دن سے ایک تو ہماری شہرت کو چار چاند لگ گئے اور دوسرے اختر اور شریف کی دانتا کلکل اور ان بن ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ گویا ایک تیر سے دو شکار ہوئے۔

اس تمام دوڑ دھوپ سے میری بھوک اور زیادہ چمک اٹھی تھی۔ چنانچہ پیٹ پوجا کی فکر میں ناک کی سیدھ میں آگے کو چل دیا۔ اب ایک ایسے اجاڑ علاقے میں پہنچا جہاں بلا کی خاموشی تھی۔ سناٹے کا یہ عالم کہ پرندے کو بھی پر مارنے کی مجال نہ تھی۔ مارے دہشت کے میرے اوسان خطا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ یکایک میں نے انسانی آبادی کا کچھ نشان اور کھانے کا کچھ سامان وہاں دیکھا تو میری جان میں جان آئی۔

کھانے کے سامان میں تازہ انگور دیکھے تو میرے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ ابھی میں اس پرائے مال پر ہاتھ صاف کرنے کو پر تول ہی رہا تھا کہ اس کے مالک کو آتا دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ سچ ہے چور کی داڑھی میں تنکا میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ چپ ایسے تھا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ واقعی زبان کو تالا لگا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ پیر فرتوت بلائے ناگہانی کی طرح سر پہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر تو مجھے جان کے لالے پڑ گئے۔ شرمندگی سے تو پہلے ہی زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اوپر سے یہ خطرہ قیامت بن گیا۔ خیر کچھ جی کڑا کر کے اس سے آنکھیں چار کیں تو اس نے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔ مجھے بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر جب اس طرح بھیگی بلی بننے سے کام بنتا نظر نہ آیا تو میں اپنے بچاؤ کی خاطر الٹی سیدھی ہانکنے لگا۔ خدا جانے اس کے پلے کچھ پڑا یا نہیں تاہم اس نے مجھ سے زیادہ مغز مارنا مناسب نہ سمجھا اور میری جان سستی چھوٹ گئی۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ اُسی وقت اُلٹے پاؤں واپس ہو جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں پڑ کر دن کاٹ دوں۔ اور آئندہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کروں۔ صرف بے پر کی اڑانے سے کام نہیں چل سکتا۔

تو حضرات! خدا خدا کر کے اس طرح تقریباً دو سو محاورات اور ضرب الامثال کی بیل منڈھے چڑھی۔ ویسے اس میں بھرمار محاوروں ہی کی ہے۔ ضرب الامثال تو بس آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

تلمیحات

کلام میں کسی مشہور واقعہ، قصہ، کہانی، آیت قرآن یا کسی فن کی اصطلاح کی طرف اشارہ کرنا تلمیح کہلاتا ہے۔ اس کے معلوم ہوئے بغیر کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مثلاً جوئے شیر (فرہاد کے نہر کھودنے کی طرف اشارہ ہے) اس میں فائدہ یہ ہے کہ طویل قصے، کہانیوں اور علمی مسئلوں کے بیان سے جو وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ ان تلمیحات کے استعمال سے بچ جاتا ہے۔

نارِ نمرود کو کیا گلزار
دوست کو یُوں بچا لیا تُو نے

(نمرود کی آگ کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت ابراہیم کو ڈالا گیا تھا اور وہ گلزار ہو گئی تھی)

؎ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی (آتشِ نمرود)

؎ ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

(دار و رسن — حضرت منصور حلاج انا الحق کہتے تھے۔ چنانچہ انھیں پھانسی پہ لٹکا دیا گیا) ؎

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
(چاہِ یوسف تلمیح ہے)

؎ ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

(مسیحائی۔ حضرت عیسےٰ مُردہ کو زندہ کرنے کی طرف اشارہ ہے)

؎ عاشق اس غیرت بلقیس کا ہوں میں آتشؔ
بام تک جس کے کبھی مرغ سلیمان نہ گیا

(سبا کی ملکہ کا نام بلقیس تھا۔ مرغ سلیماں سے مراد ہُدہُد ہے۔ جو حضرت سلیمان کا خط ملکہ بلقیس کے پاس پہنچاتا تھا)

؎ یوسف کا اپنے دھیان ہے تحریر خط کے وقت
ڈر ہے کہ انگلیاں نہ قلم ہوں قلم کے ساتھ

(اس شعر میں قصۂ یُوسف کی طرف اشارہ ہے۔ زلیخا نے مصر کی عورتوں کے روبرو یوسف کو بلایا تھا وہ دیکھ کر اس قدر از خود رفتہ ہوئیں کہ انھوں نے لیموں کاٹنے کی بجائے اپنی انگلیاں کاٹ لیں)

؎ اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اورنگ سلیماں (حضرت سلیمان کا تخت) اور اعجاز مسیحا (مردوں کو زندہ کرنا)

؎ سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہو گئیں

زنان مصر کے ہاتھ کاٹ لینے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

چند مشہور تلمیحات

آب حیات۔ آب بقا۔ آب حیواں:۔ کہا جاتا ہے کوہ قاف یا ظلمات میں ایک چشمہ ہے۔ جس کا پتہ صرف حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم ہے۔ جو شخص اس کا ایک گھونٹ پی لے وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے۔ حضرت خضر نے اسی چشمے کا پانی پی لیا ہے ؎

وہ مے پلا جو ماحصل کائنات ہے
زاہد کو موت ہے مجھے آب حیات ہے

آتش نمرود:۔ حضرت ابراہیم کے زمانے میں ایک نمرود نامی بادشاہ تھا، جو خدا ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم نے اس کی خدائی کے خلاف کئی دفعہ بحث کی اور شکست دی مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے حضرت ابراہیم کو آگ میں جلانے کا ارادہ کیا۔ اور بارہ کوس کے حلقے میں لکڑیاں بھروا کر آگ جلائی۔ جب آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ تو حضرت ابراہیم کو اس میں پھینک دیا۔ مگر خدا کے حکم سے وہ آگ گلزار بن گئی ؎

باغ و بہار آتش نمرود کو کیا
مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا

آئینۂ سکندر:۔ سکندر بادشاہ نے سکندریہ آباد کر کے دریا کے کنارے ایک مینارہ تیار کرایا۔ اور اس میں طلسم و حکمت سے ایک آئینہ لگایا۔ آئینے میں وہ تمام باتیں جو شورش وغیرہ کے متعلق ہوتی تھیں منعکس ہوتی تھیں۔ نگہبان تمام حالات سے سکندر کو مطلع کر دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اہل فرنگ نے اسے غافل پا کر سکندریہ فتح کر لیا اور آئینے کو دریا میں ڈال دیا۔ سکندر نے دوبارہ اسے فتح کیا اور آئینہ نکالا ؎

آئینہ کہا رُخ کو کچھ بھی نہ ثنا کی
صفت وُہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی

اَرِنی:۔ اس کے لفظی معنی مجھے دکھا دے ہیں۔ حضرت موسےٰ کی قوم نے کہا تھا۔ کہ جب تک ہم خدا کو نہیں دیکھیں گے۔ ایمان نہیں لائیں گے۔ چنانچہ آپ بنی اسرائیل کے ساتھ کوہ طور پہ گئے۔ اور التجا کی "یا رب مجھے اپنا جلوہ دکھا دے" (رب ارنی) لیکن جواب ملا۔ تم مجھے ہر گز نہیں دیکھ سکتے (لن ترانی) مگر قوم نے اصرار کیا۔ چنانچہ کوہ طور پر یکایک بجلی چمکی۔ کوہ طور جل گیا۔ بزرگان قوم جل کر خاک ہو گئے اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ "برق تجلی" کوہ طور کی تلمیحات اسی واقعہ سے متعلق ہیں ؎

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

اعجاز مسیحا:۔ حضرت عیسیٰ کو مسیحا بھی کہتے ہیں۔ آپ کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ قُم باذن اللہ، کہہ کر مُردہ کو زندہ کر دیتے تھے۔

ع ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

ع اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

امام ضامن:۔ حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہ السّلام آٹھویں امام کا لقب ہے۔ آپ نے ایک موقع پر ایک صیّاد سے ہرنی آزاد کرائی اور ضمانت کی تھی۔ کہ یہ ہرنی اپنے بچوں کو دودھ پلا کر جلد واپس آجائے گی۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آگئی۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد مسلمان مصیبت یا سفر کے وقت امام ضامن کا روپیہ بازو پر باندھتے ہیں اور پھر مستحق کو دے دیتے ہیں۔

انا الحق:۔ لغوی معنی ہیں' میں خدا ہوں'۔ صوفیا کے نزدیک عشق الہٰی کی وہ منزل ہے جہاں انسان کو جلوہ ایزدی کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ منصور حلاج ایک صوفی تھے جنھوں نے جوش میں آکر انا الحق کہہ دیا۔ تین سو ستّر علماء نے فتویٰ دیا کہ اس شخص کو سُولی پر لٹکایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن وہ انا الحق کہتے رہے۔ لوگ پتھر برساتے تھے جو ان کو پھول کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ اس عالم میں وہ خود تختۂ دار پر چڑھ گئے۔

کہتے ہیں ان کے ہر قطرہ سے انا الحق کی آواز آتی تھی۔ قصّۂ دار و رسن' حضرت منصور ہی کا واقعہ ہے ع

قصّۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دِل
التجائے اَرِنی سُرخیٔ افسانۂ دِل

پیراہن یوسف :۔ حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے حسد سے کنوئیں میں گرا دیا (چاہ یوسف)، پھر آپ کا کُرتہ کسی جانور کے خون میں تر کر کے حضرت یعقوبؑ کے پاس لے آئے، آپ اس کُرتے کو آنکھوں سے لگا لگا کر روتے تھے، بہت سے انقلابات کے بعد جب حضرت یوسف مصر کے بادشاہ بنے تو آپ نے بھائیوں کے ہاتھ اپنا کُرتہ بھجوایا۔ حضرت یعقوبؑ نے خوشبو سونگھ کر کہا اس میں یوسف کی بو آ رہی ہے۔ اور بصارت پلٹ آئی ؂

پھیلی ہوئی وہ وحدت کی بُو ارض و سما میں
پیراہن یوسف کی وہ تاثیر ہوا میں

جام جم :۔ ایران کے بادشاہ جمشید (جم) نے ایک ایسا جام تیار کیا تھا جس میں سدی دنیا نظر آتی تھی۔ بعض کا خیال ہے دُنیا کے امور خیر و شر کا پتہ چل جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمشید نے شراب ایجاد کی تھی اس لیے اس کا جام مشہور ہے۔ جام جہاں نما بھی کہتے ہیں ؂

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

سکندر بادشاہِ رُوم بھی جمشید کہلاتا ہے۔

شیریں فرہاد ۔ خسرو پرویز شہنشاہ ایران نے اپنی بیوی شیریں کے لیے ایک محل تیار کرانے کے لیے فرہاد نامی ماہر انجنیر کو مقرر کیا۔ جب محل تیار ہو گیا تو شیریں دیکھنے کے لیے آئی۔ فرہاد نے ایک جھلک دیکھی اور عشق کی آگ بھڑک اُٹھی اور وہ دیوانہ وار پھرنے لگا۔

شیریں کے محل اور چراگاہ کے درمیان ایک پہاڑ حائل تھا اس لیے دُودھ لانے میں دیر ہو جاتی تھی۔ چنانچہ فرہاد کو کوہکن سے کہا گیا کہ وہ دُودھ لانے کے لیے نہر کھودے (جوئے شیر) فرہاد نے شیریں کی خاطر پہاڑ کاٹنا شروع کر دیا اور نہر تیار کر دی۔ بادشاہ گھبرایا اور ایک بڑھیا کے ہاتھ پیغام پہنچایا کہ شیریں مر

کہ مرگئی۔ فرہاد نے وہی تیشہ اپنے سر میں مارا اور مرگیا ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

کہتے ہیں جب فرہاد کی لاش شیریں کے محل کے پاس سے گذری تو اس نے بھی چھت پر سے چھلانگ لگادی ؎

کاوکاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

خاتم سلیمان:۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی (خاتم) تھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا اور اس کی برکت سے تمام جن پری وغیرہ آپ کے تابع تھے ؎

سلطنت دست بدست آئی ہے
جام جم خاتم جمشید نہیں

خیبر شکن۔ خیبر گیر:۔ خیبر رسول کریمؐ کے زمانے میں یہودیوں کا مضبوط قلعہ تھا۔ حضورؐ نے اس پر چڑھائی کی مگر قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ آخر چالیسویں دن آپ نے فرمایا کل میں ایسے شخص کو عَلَم دوں گا جو بڑھ چڑھ کر حملہ کرے گا۔ اور میدان جنگ سے منہ نہ پھرائے گا۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کو بلا کر نشان دیا۔ آپ نے پہاڑ پر علم گاڑ دیا۔ مشہور پہلوانوں مرحب اور عنترؔ کو واصل جہنم کیا۔ گھوڑے کو ایڑی لگائی اور خندق عبور کر کے دروازے کو توڑ ڈالا۔ اسی دروازے کو خندق پر رکھ کر پل بنا دیا۔ اور اس طرح قلعہ فتح ہو گیا ؎

علی نبی کے باب تو خیبر کشا علی
ہادی علی امام علی پیشوا علی

ید بیضا:۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے کئی معجزے عطا فرمائے تھے ان میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے تو وہ چاند کی طرح چمکتا۔ اسے ید بیضا کہتے ہیں۔ عصا زمین پر پھینکتے تو وہ اژدہا بن جاتا

ع ید بیضا لیے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

طوفانِ نوحؑ:۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کے افراد کو تقریباً چھ سو سال تک سمجھاتے رہے مگر وہ بتوں کی پوجا سے باز نہ آئے۔ صرف اسّی آدمی بت پرستی چھوڑ کر ایمان لائے۔ آخر تنگ آکر بددعا کی اور عذاب نازل ہوا۔ آپ نے کشتی تیار کرائی اور اپنے ساتھیوں سمیت سوار ہو گئے۔ اتنے میں پانی کا طوفان آیا اور اتنی سخت بارش ہوئی کہ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ قوم نے توبہ نہ کی اور پانی بلند ہونے لگا۔ سب کافر غرق ہو گئے۔ لیکن حضرت نوحؑ کی کشتی محفوظ رہی چالیس دن کے بعد طوفان تھما اور کشتی کوہِ جودی کی چوٹی پر جا ٹھہری۔ کہتے ہیں یہ کشتی اب تک موجود ہے۔

ہفت خواں: وہ سات منزلیں جنھیں کیکاؤس کو رہا کرنے کے لیے رستم نے طے کیا تھا۔ ہر منزل میں ایک نئی آفت پیش آئی اور رستم نے اس پر غلبہ پایا تھا۔

ہما:۔ ایک ایسا پرندہ تصور کیا جاتا ہے کہ اگر اس کے پروں کا سایہ کسی پر پڑتا ہے۔ تو وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

گریۂ یعقوب: حضرت یعقوب حضرت یوسف کے فراق میں اتنا روئے کہ آپ کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ کسی کے فراق میں رونے کے لیے گریۂ یعقوب استعمال کرتے ہیں۔

باغ ارم:۔ شدّاد قوم عاد کا بادشاہ تھا۔ خدا کی ہستی کا قائل نہ تھا۔ اُس نے بہشت کے نمونے پر باغ ارم تیار کرایا۔ لیکن وہ اسے اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکا کہ موت کا فرشتہ آپہنچا۔

بزِ اخفش:۔ اخفش نامی ایک عالم شخص تھا جس نے ایک بکری پال رکھی تھی۔

وہ گردانیں وغیرہ اس کے سامنے دُہرایا کرتا تھا۔ اور جب بکری سر ہلا دیتی تو وہ سمجھتا کہ سبق یاد ہو گیا۔ جس وقت بکری کو ذبح کیا گیا تو اس کے سر میں مغز ہی نہ تھا۔ اس لیے اس آدمی کو جو بلا سوچے سمجھے گردن ہلا دے بُزاخفش کہتے ہیں۔

ٹیڑھی کھیر:۔ اس کے معنی مشکل کام کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک اندھے سے کسی نے پُوچھا۔ کھیر کھاؤ گے۔ اُس نے کہا کھیر کیسی ہوتی ہے؟ اُس نے کہا سفید، بولا سفید کیسی؟ کہا بگلے کی طرح۔ اندھے نے کہا بگلا کیسا ہوتا ہے؟ اُس نے ہاتھ ٹیڑھا کر کے کہا ایسا۔ اندھے نے اُس کے ہاتھ کو ٹٹولا اور کہا یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم سے نہیں کھائی جائے گی۔

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے:۔ راون کے بھائی بھبیشن نے راجہ رام چندر سے مل کر لنکا کے بہت سے راز بتا دیے۔ جس سے راون کو شکست ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھیدوں سے واقف آدمی بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔

چور کی داڑھی میں تنکا:۔ ایک شخص کی چوری ہو گئی۔ قاضی نے تمام مشتبہ آدمیوں کو بُلایا اور کہا کہ ابھی چور کی پہچان ہو جائے گی۔ پھر اُس نے کہا دیکھیے چور کی داڑھی میں تنکا ہے۔ چور نے فوراً داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ اس طرح چور کا پتہ چل گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قصور وار ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے۔

مانی و بہزاد:۔ چین کے مشہور و معروف مصوّروں کے نام ہیں۔

شیخ چلی:۔ ایک مشہور کردار ہے۔ جس کے متعلق بہت سے لطائف مشہور ہیں۔ ایسے شخص کے متعلق بولتے ہیں جو ہمیشہ بے سر و پا منصوبے باندھتا رہے۔

نیکی کر دریا میں ڈال:۔ ایک شخص ہر روز دریا میں روٹیاں ڈالا کرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے وہ بھی دریا میں گر پڑا۔ لیکن وہاں اسے خوراک مل گئی۔ اور وہ بچ رہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ نیکی کرنی چاہیے۔ اس کا ضرور فائدہ ہوگا۔ صلہ کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

طائرانہ نظر

محاورہ اگر کلام میں ایک یا کئی الفاظ مصدر کے ساتھ آ کر حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوں اور اہل زبان کی بول چال کے مطابق ہوں تو اُسے محاورہ کہتے ہیں۔ مثلاً چار چاند لگنا (عزت بڑھ جانا)، تار تار کرنا (چاک کرنا) وغیرہ۔ اسی طرح دھوکا کھانا محاورہ ہے۔ لیکن روٹی کھانا محاورہ نہیں کیونکہ کھانا اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

محاورہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ سے بنتا ہے

روزمرّہ وہ کلام جو اہل زبان کی روزمرّہ بول چال کے مطابق ہو، روزمرّہ کہلاتا ہے۔ اس میں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے پانچ سات، آئے دن روزمرّہ ہیں۔ لیکن چھ سات، آئے روز، روزمرّہ کے خلاف ہیں۔

فرق محاورہ میں الفاظ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن روزمرّہ میں حقیقی معنوں میں۔ محاورہ قواعد کی پابندی کے مطابق استعمال ہوتا ہے۔ لیکن روزمرّہ میں صرف اہل زبان کی پیروی کی جاتی ہے۔ کلام میں روزمرّہ کی پابندی محاورہ کی نسبت ضروری ہے۔

سوالات

۱۔ محاورہ اور روزمرّہ کی تعریف کیجیے اور دونوں کا فرق مثالوں سے واضح کیجیے۔

۲۔ مندرجہ ذیل محاورات کے معنی بتایئے اور فقروں میں استعمال کیجیے۔

بھانڈا پھوڑنا۔ ہاتھ دھونا۔ فاتحہ پڑھنا۔ ناک بھوں چڑھانا۔ گاڑھی چھننا۔ چھاتی پر مونگ دلنا۔ آنکھ لگنا۔ نشہ ہرن ہونا۔ جان کے لالے پڑنا۔

تین پانچ کرنا۔ بے نقط سُنانا۔ بال کی کھال نکالنا۔ رال ٹپکنا۔ ٹس سے مس ہونا۔ چھکے چھوٹ جانا۔ بیڑا اُٹھانا۔ بال بال بچنا۔ سبز باغ دکھانا۔

3۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی پانچ کی تشریح اس طرح کیجئے کہ مطلب واضح ہو جائے۔
چور کی داڑھی میں تنکا۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ کاغذ کی ناؤ سدا نہیں بہتی۔ ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ جھوٹ کے پاؤں کہاں۔ خس کم جہاں پاک۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

4۔ فقروں میں استعمال کیجئے اور معنی بھی لکھیے۔
ٹسوے بہانا۔ گنڈی کرانا۔ ڈورے ڈالنا۔ سورج کو چراغ دکھانا۔ دل بھر جانا آب آب ہونا۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ آنکھیں چار ہونا۔ بلائیں لینا۔ زہر مار کرنا۔ چرب زبانی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ لگائی بجھائی کرنا۔ گندم نما جو فروش۔ آگ بگولا ہونا۔ منہ میں پانی بھر آنا۔ صلواتیں سنانا۔ بات کا بتنگڑ بنانا۔ چمپت ہونا پاؤں تلے سے زمین نکلنا۔ کتر بیونت کرنا۔

5۔ خط کشیدہ الفاظ کے معنی لکھیے اور اپنے جملوں میں استعمال کیجئے۔
۱۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔ ناک پر ٹکا رکھ دیا اور چیز منگالی۔ فاضل پروفیسر نے ایک طرف تو بڑے میاں کی پگڑی نہیں اُتاری۔ کوئی اور بات کرد زبوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔ بہو نے میاں کو سمجھا بجھا کر بڑھیا کی خوب گنڈی کرائی اور ڈنڈا ڈولی کر اسی لڑکے نیچے چھوڑ آئے۔ میرزا جیسے نکھے بے نکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے کتنے شہزادے انہی سوالوں میں گرفتار ہو کر کافور ہو گئے۔ بادشاہ نے حسرت سے انگلیاں کاٹیں اور فرمایا کہ رزق کا گھر کھو دیں اپنے نوکروں کو انعام دے کر ٹھنڈے جی سے پاؤں پھیلا کر

سو رہی۔ سوداگر کو مال و اسباب بادشاہ کے سپرد کیا اور آپ ملک عدم کا راستہ لیا۔ سوداگر کو کاروانِ عدم کا ہم سفر کو بارِ ہستی سے سبکدوش کیا۔

ب۔ اب بڑی بی کے جو دن پھرے اچھے اچھے کھانے پکاتیں۔ اچھے اچھے کپڑے بناتیں مزے سے دونوں ماں بیٹے رہتے۔ جب ہوتے ہوتے تھوڑا بہت روپیہ بھی جمع ہو گیا تو بڑی بی کو بچے کی شادی کی سوجھی۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک لڑکی چندے آفتاب چندے ماہتاب بیاہ لائیں۔ بڑے چاؤ سے بہو کو گھر میں اُتارا اچھے سے اچھا کھانا بہو کو کھلاتی۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہناتی۔ مگر بہو تھی کہ کوئی چیز اس کو بھاویں ہی نہ آتی تھی۔ جب تک گھونگھٹ رہا۔ اس وقت تک تو کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ گھونگھٹ اُٹھنا تھا کہ ساس پر مصیبت آگئی۔ زبان سے ہوتے ہوتے ہاتھ پر اُتر آئی۔ خود ہی بڑھیا کو مارتی اور خود ہی ٹسوے بہانے بیٹھ جاتی۔ خاوند سے وہ لگائی بجھائی کی کہ ایک دن بیٹے نے بھی ماں کو خوب مارا۔

6۔ ان اشعار میں جو محاورات استعمال ہوئے ہیں ان کے معنی لکھیے اور اپنے فقروں میں استعمال کیجیے۔

١۔ ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا

٢۔ دل کہ اک قطرۂ خوں تھا — ایک عالم کے سر بلا لایا

٣۔ ؎ وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

٤۔ دل مجھے اس گلی میں لے جا کر — اور بھی خاک میں ملا لایا

٥۔ جی ڈھا جائے ہے سحر سے آج — رات گزرے گی کس خرابی سے

٦۔ یہ جو دو آنکھ مُند گئیں میری — اس پہ وا ہوئیں ایک بار اے کاش

٧۔ دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے — کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

٨۔ تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

٩۔ ؎ کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

١٠۔ آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ — دم دے نہ جائے ہستیِ ناپائدار دیکھ

۱۱۔ ع پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی

۱۲۔ ع رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

۱۳۔ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

۱۴۔ اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

۱۵۔ ع بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

۷۔ روزمرہ اور محاورہ پر نوٹ لکھیے (۱۹۶۷ء سالانہ و ضمنی)

۸۔ ذیل کے محاورات میں صرف پانچ کا مفہوم وضاحت سے لکھیے اور پھر اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

بیڑا اٹھانا۔ آڑے آنا۔ منہ بنانا۔ ٹوہ لینا۔ تین پانچ کرنا۔ طوطی بولنا۔ آنکھیں چرانا۔ کھویا جانا۔

(پشاور بورڈ ۱۹۶۷ء)

جزو سوم

جملوں کی تصحیح

؎ نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

باب ۱۳

جملوں کی تصحیح

زبان اظہار مطلب کا ذریعہ ہے اور صحیح مطلب اسی وقت ادا کیا جا سکتا ہے جب تحریر و تقریر ہر لحاظ سے درست ہو۔ اغلاط کی وجہ سے مطلب میں فرق آجاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عام غلطیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دی جائے۔ عام طور پر مندرجہ ذیل قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

۱۔ تذکرہ و تانیث کی ۲۔ واحد جمع کی ۳۔ الفاظ کی زیادتی کی ۴۔ الفاظ کی کمی کی۔ ۵۔ روزمرہ کی ۶۔ محاورے کی ۷۔ ترکیب کی ۸۔ املا کی ۹۔ فعل اور فاعل کی مطابقت کی ۱۰۔ نے اور کو کے استعمال کی ۱۱۔ متفرق قسم کی۔

صحیح اُردو لکھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے:

۱۔ تذکیر و تانیث کی غلطیاں۔ بعض فقروں میں مذکر کی جگہ مونث اور مونث کی جگہ مذکر استعمال کیا ہوا ہوتا ہے مثلاً

ہرے بھرے گھاس پر مت بیٹھو۔ میرے سر میں درد ہو رہی ہے۔

ان جملوں میں تذکیر و تانیث کی غلطی ہے گھاس مونث ہے۔ اور درد مذکر درست فقرے یہ ہیں۔ ہری ہری گھاس پر مت بیٹھو۔ میرے سر میں دَرد ہو رہا ہے۔

(تذکیر و تانیث کے لیے متعلقہ باب ملاحظہ ہو،

۲۔ واحد جمع کی غلطیاں:۔ بعض دفعہ واحد جمع کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً ان الفاظوں کو تحریر کرد۔ (ان الفاظ کو تحریر کرد)

اس لفظ کا معنی بتاؤ۔ (اس لفظ کے معنی بتاؤ کیونکہ معنی جمع استعمال ہوتا ہے)
(متعلقہ باب واحد جمع ملاحظہ ہو)

۳۔ الفاظ کی زیادتی کی غلطیاں: بعض جملوں میں کچھ الفاظ زائد ہوتے ہیں مثلاً
در اصل میں وہ بے گناہ ہے۔ ماہ رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ ان کی درستی اس طرح ہو گی۔
در اصل وہ بے گناہ ہے (میں زائد ہے)
ماہ رمضان شروع ہونے والا ہے یا رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔

۴۔ الفاظ کی کمی کی غلطیاں:۔ مثلاً
"باغ میں میں گیا اور وہ بھی"۔ جملہ یوں ہونا چاہیئے" باغ میں میں بھی گیا اور وہ بھی"۔

۵۔ روزمرّہ کی غلطیاں:۔ مثلاً
وہ دن بدن کمزور ہو جا رہا ہے یہاں روز بروز چاہیئے کیونکہ دِن ہندی کا لفظ ہے۔ اور ب فارسی کا۔ دن بدن روزمرّہ کے خلاف ہے۔ اہل زبان روز بروز بولتے ہیں۔ اسی طرح آئے روز کی جگہ آئے دن درست ہے۔

۶۔ محاورے کی غلطیاں:۔ مثلاً"
احمد بیٹے کے مرنے سے زندہ در گور ہے۔ درست فقرہ یوں ہو گا۔
"احمد بیٹے کے مرنے سے زندہ در گور ہے"۔ کیونکہ محاورہ" زندہ در گور ہونا" ہے
چغلی کرنا گناہ ہے (چغلی کھانا گناہ ہے) محاورہ چغلی کھانا" ہے۔

۷۔ ترکیب کی غلطیاں:۔ مثلاً
آب گنگا کی بجائے گنگا کا پانی یا آبِ گنگ کہنا چاہیئے۔ کیونکہ آب فارسی کا لفظ ہے۔ اور گنگا ہندی کا۔ اسی طرح لب سڑک۔ بیڈ ران بند کہنا غلط ہے۔

۸۔ املا کی غلطیاں۔ مثلاً
ضائع کو ذائع لکھنا۔ عالیشان کو آلی شان۔ تاجران کتب کو تاجران تطب۔

۹۔ فاعل اور فعل کی مطابقت:۔ ۱۔ فعل لازم ہمیشہ اپنے فاعل کے مطابق واحد یا جمع آتا ہے۔ مثلاً گھوڑا دوڑتا ہے۔ گھوڑے دوڑتے ہیں۔

۲۔ فعل لازم ہمیشہ اپنے فاعل کے مطابق مذکر یا مونث آتا ہے۔ مثلاً اسلم لاہور گیا۔ نجمہ لاہور گئی۔ لڑکے لاہور گئے۔ لڑکیاں لاہور گئیں۔

۳۔ جب فاعل کی عزت اور تعظیم مقصود ہو تو فعل اور تمام توصیفی کلمے جمع آتے ہیں۔ مثلاً آپ کب تک قیام فرمائیں گے، یہی مولوی صاحب ہیں۔ جن کا ہیں نے ذکر کیا تھا۔

۴۔ اگر ایک سے زیادہ فاعل ہوں تو فعل ترتیب میں آخری فاعل کی تذکیر و تانیث یا وحدت جمع کے مطابق لایا جاتا ہے۔ مثلاً لڑکے اور لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ لڑکیاں اور لڑکے پڑھ رہے ہیں۔

۵۔ جب ایک سے زیادہ فاعل بصورت واحد ہوں تو فعل ہمیشہ جمع آئے گا۔ مثلاً ایک لڑکا اور ایک لڑکی جا رہے تھے۔

۶۔ جب فاعل دو یا دو سے زیادہ ہوں اور ان کے آخر میں "سب" آئے تو فعل جنس یا گنتی کے لحاظ سے آخری اسم کے مطابق آتا ہے۔ مثلاً رشید کے رشتہ دار اور یار و مددگار سب ناراض ہو گئے۔ اور اگر آخر میں "سب کچھ" آئے تو فعل واحد ہو گا۔ مثلاً اس کا مال و اسباب جاگیر، مکانات سب کچھ بک گیا۔

۷۔ اگر فاعل حرف عطف کے ذریعے ملے ہوئے ہوں تو فعل ہمیشہ جمع آتا ہے۔ مثلاً اقبال اور سلیم کھانا کھا رہے ہیں۔

۸۔ ماضی مطلق، قریب بعید اور احتمالی اور افعال متعدی کی تذکیر و تانیث اور وحدت جمع مفعول کے مطابق ہوتی ہے مثلاً جاوید نے خط لکھا۔ صبیحہ نے کتاب پڑھی۔ مہمانوں نے آم کھائے۔ تو نے روٹیاں کھائیں۔ حمید نے فقیر کو روٹی دی۔ باقی متعدی فعلوں میں فاعل کے لحاظ سے مثلاً مرد روٹی کھاتا ہے۔ وہ عورت روٹی کھاتی ہے۔

۹۔ تمام فعلوں میں جمع متکلم کا صیغہ مذکر و مونث میں یکساں ہی آتا ہے۔ سوائے ان متعدی

فعلوں کے جن کے فاعل کے ساتھ "نے" آتا ہے مثلاً مذکر کے لیے ہم آئے اور مؤنث کے لیے بھی ہم آئے۔ ہم کھاتے تھے (مذکر)، ہم کھاتے تھے (مؤنث) لیکن جہاں عورتوں وغیرہ کا لفظ یا کوئی اور قرینہ موجود ہو تو اس طرح لکھیں گے۔ ہم سب عورتوں جائیں گی۔ ہم سب بہنیں جائیں گی۔ فعل متعدی میں جب علامت "کو" مذکور ہو تو فعل ہمیشہ واحد اور مذکر ہو گا جیسے ہم نے اسلم کو دیکھا۔ ہم نے لڑکوں کو دیکھا۔ عورتوں نے مرد کو دیکھا۔ مرد نے عورتوں کو بلایا۔

۱۰۔ کتابوں، اخباروں اور رسالوں کے نام گو جمع ہیں مگر وہ مثل واحد کے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً تعزیرات پاکستان چھپ گئی"۔ کتاب چونکہ مونث ہے۔ اس لیے فعل مونث آیا۔

۱۱۔ بعض اوقات دو واحد اسم بلا حرف عطف مل کر جمع کی حالت پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً میاں بیوی ہنسی خوشی بسر کرتے ہیں۔ باپ بیٹا جا رہے ہیں۔ لیکن اگر وہ الفاظ ایک کلمہ کا حکم رکھتے ہوں تو فعل واحد آتا ہے۔ جیسے گھوڑا گاڑی بک گئی۔ قلم دوات رکھی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے خلاف بھی آتا ہے جیسے تمہارے کھانے میں نمک مرچ زیادہ ہوتا ہے۔

۱۲۔ مونث افعال جو "ہیں" سے پہلے آئیں وہ جمع کی صورت میں بھی واحد لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً عورتیں آتیں ہیں۔ غلط ہے "عورتیں آتی ہیں" ہونا چاہیئے۔

۱۳۔ جب دو اسموں کے آخر میں لفظ دونوں یا دونوں کے دونوں ہو تو فعل جمع آئے گا۔ مثلاً باپ بیٹا دونوں مر گئے۔ یا دونوں کے دونوں مر گئے۔

۱۴۔ جب فاعل دو یا دو سے زیادہ ضمیروں پر مشتمل ہو تو فعل جمع ہوگا۔ جیسے ہم تم وہاں گئے تھے۔ وہ اور میں راستہ بھول گئے۔ میں اور وہ ساتھ ساتھ آئے۔

۱۵۔ صفت جنس میں قریب کے اسم سے تعلق رکھتی ہے مثلاً

تمہارا نام اور شہرت یا تمہاری شہرت اور نام

۱۶۔ نہ اور نہیں کا استعمال :۔ افعال کے شروع میں نہ یا نہیں لگانے سے فعل

منفی بن جاتا ہے۔ بعض اوقات زور دینے اور تخصیص کے معنی پیدا کرنے کے لیے
نہیں بعد میں آتا ہے مثلاً میں تمام دن انتظار کرتا رہا مگر وہ آیا ہی نہیں

؎ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

۱۔ ماضی شرطیہ اور مضارع کے ساتھ "نہیں" استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ "نہ" استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اگر وہ نہ آتا تو خوب ہوتا۔

؎ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

؎ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

۲۔ فعل نہی میں "نہ" آتا ہے جیسے نہ کر۔ نہ جا

۳۔ تکرار فعل میں "نہ" آتا ہے جیسے نہ وہ آیا نہ تم آئے

؂ نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

۴۔ فعل مستقبل میں ہمیشہ "نہیں" آتا ہے۔ جیسے وہ نہیں جائے گا مگر زور دینے کے لیے "نہ" استعمال ہوتا ہے۔ جیسے میں نہ آؤں گا۔

۵۔ فعل حال میں "نہیں" استعمال ہوتا ہے۔ جیسے وہ نہیں لکھتا ہے۔

؂ کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

۶۔ اثباتی فعل پر زور دینے کے لیے "نہ" استعمال ہوتا ہے جیسے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طُور کی

۱۱۔ **"نے" کا استعمال** (۱) "نے" فاعلی حالت کے لیے مخصوص ہے اس لیے اسے علامت فاعل بھی کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ فعل لازم کے ساتھ "نے" نہیں آتا۔ مثلاً انور آیا۔ نجمہ روئی۔ سوائے تھوکنا اور موتنا کے۔ بچے نے بستر پر موتا۔ دُنیا نے تھوکا۔

۲۔ "نے" علامت فاعل متعدی افعال کے ماضی مطلق، قریب، بعید اور احتمالی کے ساتھ آتا ہے۔ اسلم نے کھانا کھایا۔ حامد نے محمود کو مارا۔ یہ خط کس نے لکھا تھا۔ اسلم نے لکھا ہوگا۔

مگر بعض متعدی افعال اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے شرمانا۔ بولنا۔ لانا۔ بخشنا وہ بولا۔ احمد قلم لایا۔ مگر بولنا کے ساتھ کوئی لفظ بطور مفعول ہو۔ تو پھر "نے" آتا ہے۔ اس نے جھوٹ بولا۔"

۳۔ چاہنا مصدر سے ماضی مطلق، قریب، بعید اور احتمالی کے ساتھ ہمیشہ "نے" آتا ہے۔

ع ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مگر "جی" اور "دل" کے ساتھ "نے" نہیں آتا۔ جیسے "جی چاہا تو کر دوں گا۔ جب دل چاہا آؤں گا۔"

۴۔ جب متعدی فعل کے ساتھ امدادی فعل لازم ہو تو "نے" کا استعمال نہیں ہوتا۔

میں خط لکھ چکا (لکھنا۔ متعدی، چکنا۔ فعل لازم)

۵۔ بعض متعدی افعال کیساتھ "نے" استعمال ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا مثلاً جیتنا، ہارنا، سمجھنا۔ سیکھنا۔ پکارنا۔ بھرنا۔ پلٹنا۔ بدلنا۔

میں نے بازی جیتی (بطور فعل متعدی)، میں بازی جیتا (بطور فعل لازم)،

اس نے مجھے پکارا (بطور فعل متعدی، وہ پکارا بطور فعل لازم)

۶۔ "نے" علامت فاعل ہے اس لیے مفعول کے ساتھ نہیں آتی۔ لیکن جب مجھ اور تجھ کے ساتھ کوئی صفت آئے تو "نے" استعمال کرتے ہیں۔

مجھ خاکسار نے کب کہا تھا۔ تجھ نالائق نے ایسی حرکت کیوں کی؟

۷۔ اُردو مصدروں کے ساتھ "نے" لکھنا غلط ہے۔ مثلاً

میں نے لاہور جانا ہے کی بجائے "مجھے لاہور جانا ہے" کہنا چاہیئے۔ اسی طرح "یہ تو میں نے دیکھا ہوا ہے" کی بجائے "یہ تو میرا دیکھا ہوا ہے" کہنا چاہیئے۔

یہ کتاب میں نے پڑھی ہوئی ہے کی بجائے "یہ کتاب میری پڑی ہوئی ہے۔"
ہونا چاہیئے۔ "یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں"۔
ایسی صورت میں ضمیر فاعلی، مفعول کی شکل اختیار کر لیتی ہے اس نے (اسے)، انہوں نے (انہیں)، تونے (تجھے)، تم نے (تمہیں)، میں نے (مجھے)، ہم نے (ہمیں)۔

۱۲۔ "کو" کا استعمال:۔ "کو" اُردو میں مفعول حالت کے لیے مخصوص ہے۔ اس لیے اسے علامت مفعول کہتے ہیں۔

۱۔ جب فعل کا ایک ہی مفعول ہو اور وہ ذی عقل ہو تو اس مفعول کے ساتھ "کو" آتا ہے۔ جیسے اقبال نے امجد کو مارا۔ (امجد ذی عقل مفعول ہے۔ لیکن مفعول غیر ذی عقل یا بے جان ہو تو "کو" نہیں آتا جیسے لڑکا کتاب پڑھتا ہے۔ میں ریاضی جانتا ہوں۔

۲۔ اگر جملے میں لفظ "آدمی" مفعول ہو تو "کو" نہیں آتا جیسے میں نے ایک آدمی دیکھا۔
" لیکن آدمی کا نام دیا ہوا ہو یا مخصوص کر دیا گیا ہو تو "کو" استعمال ہوتا ہے۔ میں نے محمود کو دیکھا۔ میں نے اس آدمی کو دیکھا۔ ہم نے آپ کے باپ کو دیکھا۔

۳۔ محاورات میں مفعول جب مصدر کے ساتھ آتا ہے تو "کو" استعمال نہیں ہوتا جیسے مُنہ چڑانا۔ تارے گننا۔ دِل دینا۔ کمر باندھنا۔ سر اٹھانا۔

۴۔ جملے میں اگر دو مفعول ہوں تو مفعول قریب کے ساتھ "کو" نہیں آتا بلکہ مفعول بعید کے ساتھ آتا ہے مثلاً ناصر نے میرا قلم ممتاز کو دے دیا۔
جب دو مفعول ہوں۔ ایک شخص ہو اور دوسرا کوئی چیز تو "کو" مفعول شخصی کے لیے آتا ہے۔ جیسے استاد نے شاگرد کو شاباش دی۔ امیر نے غریب کو انعام دیا۔

۵۔ فعل مجہول کے مفعول کے ساتھ "کو" نہیں لانا چاہیئے۔ جیسے دروازے کو

بند کیا گیا کی جگہ "دروازہ بند کیا گیا" درست ہے مگر ذی عقل کے لیے "کو" آتا ہے۔ جیسے اشرف کو بلایا گیا۔

کبھی یہ علامت مفعول غرض یا معاوضے کو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً میں نے سو روپے کو گائے خریدی۔ سب دوست سیر کو نکلے۔

۶۔ بعض اوقات علامت مفعول "کو" کی بجائے "سے" اور "کے" استعمال کرتے ہیں مثلاً میں نے اسلم سے کہا۔ اکرم نے خالد کے تھپڑ مارا۔

۱۳۔ چند اور باتیں: ۱۔ جس لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو اور اس کے بعد حرف جار لایا جائے، تو "ہ" ہائے مجہول سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً زمانہ میں کی بجائے "زمانے میں"۔ "مدینہ کو" کی بجائے "مدینے کو"

۲۔ "نہ" کے بعد "ہی" لکھنا صحیح نہیں جیسے نہ ہی آپ آئے، نہ ہی خط بھیجا درست فقرہ یوں ہوگا۔ نہ آپ ہی آئے نہ خط ہی بھیجا۔

۳۔ اُردو کے مصدر کو جب کہ اس کے ساتھ مفعول مونث ہو مونث بھی بولتے ہیں اور مذکر بھی مثلاً کتاب پڑھنی ہے۔ کتاب پڑھنا ہے۔

۴۔ "نے" فاعل کے ساتھ چاہیئے مثلاً

ایک شخص جس کی بیوی فوت ہو چکی ہے نے نزدیکی گاؤں میں شادی کا بندوبست کیا۔

درست فقرہ یہ ہے "ایک شخص نے جس کی بیوی فوت ہو چکی ہے، نزدیکی گاؤں میں شادی کا بندوبست کیا۔

۵۔ جب ایک فقرے میں متعدد چیزوں کا ذکر ہو تو عطف کے لیے ہر چیز کے ساتھ لفظ "اور" نہ لکھنا چاہیئے۔ بلکہ صرف "آخری چیز کے ساتھ مثلاً قلم، دَوات اور کاغذ لے آؤ۔

۶۔ ایسے عربی الفاظ جن کے آخر میں "ع" ہوتا ہے جب ان کے بعد حرف جار آتا ہے تو "ع" کے بعد "ے" بڑھا دیتے ہیں جیسے مصرعے میں۔ قلعے میں

۷۔ تعداد غیر معین سینکڑوں، ہزارہا، کروڑوں وغیرہ کے ساتھ اکثر الفاظ واحد استعمال ہوتے ہیں۔ اور معنی جمع کے دیتے ہیں۔ اور جمع کی صورت میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً

ع ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ہزار ہا مکان جل گیا۔ ہزار ہا مکان جل گئے (دونوں طرح جائز ہے)

ایک ہزار کرسی پڑی ہے۔ ایک ہزار کرسیاں پڑی ہیں۔

۸۔ فعل جب مفرد ہوتا ہے تو حرف نفی ہمیشہ اوّل آتا ہے، مگر تاکید کی صورت میں بعد میں آئے گا۔ جیسے اٹھو مت، مانتا نہیں۔

مرکب فعل ہونے کی حالت میں فعل کے شروع یا آخر میں دونوں طرح جائز ہے۔ مثلاً میں نہیں جا سکا۔ یا میں جا نہیں سکا۔

اِسمائے جمع

انگوروں کا گچھا	تقریروں کا سلسلہ	امرا کی مجلس
ٹڈیوں کا دل	جوتوں کا جوڑا	غلے کا ڈھیر
اونٹوں کی قطار	جہازوں کا بیڑا	کپڑوں کی گٹھڑی
آدمیوں کا گروہ	چوروں کا گروہ	کنجیوں کا گچھا
پرندوں کا غول	چیونٹیوں کی قطار	کتابوں کا بستہ
پھولوں کا گلدستہ	شعرا کی مجلس	کھنڈرات کا ڈھیر
پہاڑوں کا سلسلہ	سادھوؤں کی منڈلی	کاغذوں کا دستہ
تیروں کی بوچھاڑ	عربوں کا قبیلہ	گیہوں کا ڈھیر۔ انبار

گھاس کا پولا	لڑکوں کی ٹولی جماعت	لوگوں کا ہجوم
درختوں کا جھنڈ	مٹی کا تودہ	مینہ کی بوچھاڑ
گویّوں کی سنگت	سپاہیوں کا دستہ	تیتروں کی ڈار

صحیح جُملے

۱۔ تذکیر و تانیث اور واحد جمع کی غلطیاں

غلط	درست
۱۔ آپ کی مزاج کیسی ہے	آپ کا مزاج کیسا ہے ؟
۲۔ مجھے اُردو نہیں آتا	مجھے اُردو نہیں آتی
۳۔ مرض بڑھتی گئی جوں جوں دوا کی	مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
۴۔ کراچی سے تار آئی ہے۔	کراچی سے تار آیا ہے۔
۵۔ میں نے آپ کی بہت انتظار کی	میں نے آپ کا بہت انتظار کیا
۶۔ دو آنے کی دہی لاؤ۔	دو آنے کا دہی لاؤ۔
۷۔ تمہاری قلم قیمتی ہے۔	تمہارا قلم قیمتی ہے
۸۔ میرے ناک پر پھنسی ہے۔	میری ناک پر پھنسی ہے۔
۹۔ دِل کو دل سے راہ ہوتا ہے	دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔
۱۰۔ قائدِ اعظم کی فوٹو دیکھو۔	قائدِ اعظم کا فوٹو دیکھو۔
۱۱۔ میرا اس سے تکرار ہو گیا۔	میری اس سے تکرار ہو گئی۔
۱۲۔ اس کتاب کا کیا دام ہے	اس کتاب کے کیا دام ہیں۔
۱۳۔ آج ان کا درشن نہیں ہوا۔	آج ان کے درشن نہیں ہوئے۔

غلط	درست
۱۴- کیا آپ نے اخبار پڑھی ہے	کیا آپ نے اخبار پڑھا ہے۔
۱۵- اس نے مرہم لگائی	اس نے مرہم لگایا۔
۱۶- ہرا ہرا گھاس اُگ رہا ہے	ہری ہری گھاس اُگ رہی ہے۔
۱۷- میز خالی پڑا ہے	میز خالی پڑی ہے۔
۱۸- اس نے زور سے ڈکار لیا	اس نے زور سے ڈکار لی۔

۲- محاورے کی غلطیاں

غلط	درست
۱۹- ان دونوں میں بیس اکیس کا فرق ہے	ان دونوں میں انیس بیس کا فرق ہے۔
۲۰- گھوڑے کے آگے بین بجانا بے فائدہ ہے	بھینس کے آگے بین بجانا بے فائدہ ہے
۲۱- چیرو تو بدن میں لہو نہیں	کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
۲۲- آسمان سے گرا کیکر میں اٹکا	آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔
۲۳- چغلی کرنا مناسب نہیں۔	چغلی کھانا مناسب نہیں۔
۲۴- ایک کریلا دوسرا بینگن۔	ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔
۲۵- وہ میرے سینے پر مونگ دلتا ہے	وہ میری چھاتی پر مونگ دلتا ہے۔
۲۶- یہ منہ اور ماش کی دال	یہ منہ اور مسور کی دال
۲۷- پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں	پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔
۲۸- لڑکا گھر میں ڈھنڈورا شہر میں	لڑکا بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔
۲۹- آگ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔	دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔
۳۰- پانی دیکھو پانی کی دھار دیکھو	تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔
۳۱- اس کی شہرت کی طوطی بول رہی ہے	اس کی شہرت کا طوطی بول رہا ہے۔
۳۲- آپ کا کہنا سر ماتھے پر	آپ کا کہنا سر آنکھوں پر۔

۳۔ روزمرّہ کی غلطیاں

غلط	درست
۳۳۔ میں نے لاہور جانا ہے۔	مجھے لاہور جانا ہے
۳۴۔ کیا آپ چائے پیو گے۔	کیا آپ چائے پئیں گے۔
۳۵۔ موسم بہار کے اوپر مضمون لکھو	موسم بہار پر مضمون لکھو
۳۶۔ تیرے کو بھوک نہیں لگتی۔	تجھے بھوک نہیں لگتی۔
۳۷۔ اکرم دن بدن ترقی کر رہا ہے	اکرم روز بروز ترقی کر رہا ہے۔
۳۸۔ وہ بے ناغہ کالج جاتا ہے۔	وہ بلا ناغہ کالج جاتا ہے۔
۳۹۔ اسلم اور حامد اور محمود بیمار ہیں۔	اسلم، حامد اور محمود بیمار ہیں۔
۴۰۔ وہ راتوں رات گھر پہنچ گیا۔	وہ راتوں رات گھر پہنچ گیا۔
۴۱۔ برائے مہربانی معاف فرمائیں۔	براہِ مہربانی معاف فرمائیں۔
۴۲۔ آپ کا غریب کدہ کہاں ہے۔	آپ کا دولت کدہ کہاں ہے۔
۴۳۔ آپ ضرور بہ ضرور تشریف لائیں۔	آپ ضرور تشریف لائیں۔
۴۴۔ آئے روز کا جھگڑا اچھا نہیں	آئے دن کا جھگڑا اچھا نہیں۔
۴۵۔ ہم سب بخیریت سے ہیں۔	ہم سب خیریت سے ہیں۔
۴۶۔ مجھے سخت حیرانگی ہوئی۔	مجھے سخت حیرانی ہوئی۔
۴۷۔ آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں	آپ کی خیریت چاہتا ہوں۔

۴۔ زائد الفاظ یا ناموزوں الفاظ کی غلطیاں

غلط	درست
۴۸۔ در حقیقت میں وُہ سچا ہے	در حقیقت وُہ سچّا ہے۔
۴۹۔ وُہ بڑھیا عورت بیمار ہے	وُہ بڑھیا بیمار ہے۔
۵۰۔ وہ منگلوار کے دن یہاں آئے گا۔	وہ منگلوار کو یہاں آئے گا۔
۵۱۔ نماز پڑھنا کارِ ثواب کا کام ہے۔	نماز پڑھنا کارِ ثواب ہے۔
۵۲۔ برائے مہربانی کر کے رخصت دیجئے۔	مہربانی فرما کر رخصت دیجئے۔
۵۳۔ وہ خود آپ یہاں آئے گا۔	وُہ خود یہاں آئے گا۔
۵۴۔ میری بھاوجہ بالکل تندرست ہے	میری بھاوج بالکل تندرست ہے۔
۵۵۔ بندہ آپ کا تابعدار ہے۔	بندہ آپ کا تابع فرمان ہے۔
۵۶۔ کولمبس نے امریکہ ایجاد کیا۔	کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔
۵۷۔ تم تمہارا کام کرو	تم اپنا کام کرو۔
۵۸۔ اس تنخواہ میں بمشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔	اس تنخواہ میں مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔
۵۹۔ آبِ زمزم کے پانی میں برکت ہے۔	آبِ زمزم میں برکت ہے۔
۶۰۔ بے فضول باتیں نہ کرو۔	فضول باتیں نہ کرو۔

عام غلطیاں

غلط	درست
۶۱ ۔ خط ملا ۔ احوال معلوم ہوا	خط ملا ۔ حال معلوم ہوا ۔
۶۲ ۔ السلام و علیکم کے بعد عرض ہے	السلام علیکم کے بعد عرض ہے ۔
۶۳ ۔ بارات کہاں جا رہی ہے ۔	برات کہاں جا رہی ہے
۶۴ ۔ اہالیان شہر انصاف پسند ہیں	اہل شہر انصاف پسند ہیں ۔
۶۵ ۔ ضد کرنی بڑی بات ہے ۔	ضد کرنا بری بات ہے ۔
۶۶ ۔ اصغر بڑا تیراک ہے	اصغر بڑا پیراک ہے
۶۷ ۔ میں آپ کا مشکور ہوں گا ۔	میں آپ کا شکر گزار ہوں گا ۔
۶۸ ۔ وہ بہت فاشش گالیاں دیتا ہے ۔	وہ بہت فحش گالیاں دیتا ہے ۔
۶۹ ۔ خورد و نوش کا انتظام کرو ۔	خورد و نوش کا انتظام کرو ۔
۷۰ ۔ اس کا رجحان فوج کی طرف ہے	اس کا رجحان فوج کی طرف ہے ۔
۷۱ ۔ قائد اعظم ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے	قائد اعظم ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے ۔
۷۲ ۔ وہ بہت راشی ہے	وہ بہت مرتشی ہے ۔

فاعل اور فعل کی غلطیاں

غلط	درست
۷۳ ۔ میں اور وہ ساتھ ساتھ آیا ۔	میں اور وہ ساتھ ساتھ آئے ۔
۷۴ ۔ گھوڑا گاڑی بک گئے ہیں ۔	گھوڑا گاڑی بک گئی ہے ۔

غلط	درست
۷۵۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی آ رہی ہے	ایک لڑکا اور ایک لڑکی آ رہے ہیں۔
۷۶۔ میز اور کرسیاں گر پڑے۔	میز اور کرسیاں گر پڑیں۔
۷۷۔ ہمارے پیر و مرشد یہاں نہیں ہے	ہمارے پیر و مرشد یہاں نہیں ہیں۔
۷۸۔ میں نے وہاں کی عورتوں کو گوری پایا۔	میں نے وہاں کی عورتوں کو گورا پایا۔
۷۹۔ عورتوں نے کہا ہم ضرور آئیں گی	عورتوں نے کہا ہم ضرور آئیں گے۔
۸۰۔ آپ کب آؤ گے	آپ کب آئیں گے۔
۸۱۔ دونوں بہنیں آئیں ہیں۔	دونوں بہنیں آئی ہیں۔
۸۲۔ مرد اور عورتیں سودا خرید رہے ہیں۔	مرد اور عورتیں سودا خرید رہی ہیں۔
۸۳۔ آدمی کے دو ہاتھ، دو آنکھیں اور ایک ناک ہیں۔	آدمی کے دو ہاتھ، دو آنکھیں اور ایک ناک ہے۔
۸۴۔ ہوش و حواس جاتا رہا۔	ہوش و حواس جاتے رہے۔

۷۔ ترکیب کی غلطیاں

غلط	درست
۸۵۔ میرا مکان برلبِ سڑک واقع ہے	میرا مکان سڑک کے کنارے واقع ہے۔
۸۶۔ حدتِ گرمی سے جسم جھلس گیا۔	گرمی کی حدت سے جسم جھلس گیا۔
۸۷۔ کاغذ و پنسل تیار کر دو۔	کاغذ اور پنسل تیار کر دو۔
۸۸۔ لیڈرانِ پاکستان کا نام لکھو۔	پاکستان کے لیڈروں کے نام لکھو۔
۸۹۔ انہوں نے اپنا حساب و کتاب ٹھیک کر لیا	انہوں نے اپنا حساب کتاب ٹھیک کر لیا۔

درست	غلط
تم بڑے بے پروا ہو۔	۹۰۔ تم بڑے لاپرواہ ہو۔
ہم بے روک ٹوک آ گئے۔	۹۱۔ ہم بلا روک ٹوک آ گئے
اس نے مجھے لاجواب کر دیا۔	۹۲۔ اس نے مجھے بے جواب کر دیا
اُستاد نے بورڈ پر لکھا۔	۹۳۔ استاد نے تختۂ بورڈ پر لکھا
خرید و فروخت میں ایمانداری سے کام لو۔	۹۴۔ خرید اور فروخت میں ایمانداری سے کام لو۔

۸۔ اِملا کی غلطیاں

درست	غلط
بلّی چوہے کی تاک میں بیٹھی ہے۔	۹۵۔ بلّی چوہے کی طاق میں بیٹھی ہے
قاضی نے فتویٰ دے دیا	۹۶۔ کاضی نے فتوا دے دیا
کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے	۹۷۔ کیا آپ کو کوئی اعتراز ہے
مہمان کی خاطر تواضع کرو۔	۹۸۔ مہمان کی خاتر توازو کرو۔
کالج کی عمارت بڑی عالیشان ہے	۹۹۔ کالج کی امارت بڑی آلی شان ہے
فیاض کا سوال صحیح نہیں	۱۰۰۔ فیاز کا سوال سہی نہیں۔
تشبیہ اور استعارے میں کیا فرق ہے	۱۰۱۔ تشبیہی اور استعارہ میں کیا فرق ہے
میں نے حلوائی کا حساب بے باق کر دیا۔	۱۰۲۔ میں نے ہلوائی کا حساب بے باک کر دیا۔
چیل کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔	۱۰۳۔ چیل کی نذر بڑی تیز ہوتی ہے
غلاظت سے وبا پھیلتی ہے۔	۱۰۴۔ غلازت سے دبہ پھیلتی ہے
توبۃ النصوح نذیر احمد نے لکھی۔	۱۰۵۔ توبۃ لنسوح نظیر احمد نے لکھی۔

غلط	درست
۱۰۶۔ اس کتاب کی عبارت مقفع و مسجع ہے۔	اس کتاب کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔
۱۰۷۔ یہ بات بلکل ٹھیک ہے	یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔
۱۰۸۔ اس نے ناکس کتاب تبع کرائی	اس نے ناقص کتاب طبع کرائی۔
۱۰۹۔ سلام کے بعد واضع ہو	سلام کے بعد واضح ہو۔
۱۱۰۔ مصائب دعالام سے نہ گھبراؤ	مصائب و آلام سے نہ گھبراؤ۔
۱۱۱۔ وہ صدا میری بات مانتا ہے	وہ سدا میری بات مانتا ہے۔

۹۔ متفرق غلطیاں

غلط	درست
۱۱۲۔ حضور تو مالک ہے جو چاہو کرو	حضور تو مالک ہیں جو چاہیں کریں۔
۱۱۳۔ نائی حجامت کرنے لگا۔	نائی حجامت بنانے لگا۔
۱۱۴۔ اے خدایا میرے حال پر رحم کر	اے خدا دیا خدایا، میرے حال پر رحم کر۔
۱۱۵۔ ہم آج شب کو لاہور جائیں گے	ہم آج شب لاہور جائیں گے
۱۱۶۔ میں تمہیں حکم کرتا ہوں	میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔
۱۱۷۔ میں آپ کا بے دام خریدا ہوا غلام ہوں۔	میں آپ کا بے دام غلام ہوں۔
۱۱۸۔ ایک راس گھوڑا بالعوض موازی سو روپیہ۔	ایک لگام گھوڑا بالعوض مبلغ سو روپیہ۔

غلط	درست
۱۱۹۔ یہ کتے کا بچہ کس نے پال رکھا ہے۔	یہ پلا کس نے پال رکھا ہے۔
۱۲۰۔ عبدل مجید سکنہ لائل پور	عبدالمجید ساکن لائل پور
۱۲۱۔ اس کمرے کا عرض بارہ فٹ چوڑا ہے	اس کمرے کا عرض بارہ فٹ ہے۔
۱۲۲۔ آہا! کتنی گرمی ہے	اُف! کتنی گرمی ہے۔
۱۲۳۔ انبیاؤں کے حالات کا مطالعہ کرو۔	انبیا کے حالات کا مطالعہ کرو۔
۱۲۴۔ ستاراں میں چوداں جمع کرو۔	سترہ میں چودہ جمع کرو۔
۱۲۵۔ ماہ رمضان کے مہینے کے روزے رکھنا فرض ہے۔	ماہ رمضان کے روزے رکھنا فرض ہے۔
۱۲۶۔ بارش سے کیچڑ پھیل گیا ہے	بارش سے کیچڑ پھیل گئی ہے۔
۱۲۷۔ پاکستان میں اُردو خوب سمجھا جاتا ہے۔	پاکستان میں اُردو خوب سمجھی جاتی ہے۔

۱۰۔ متفرق

غلط	درست
۱۲۸۔ اپنے ہر فرائض ایمانداری سے ادا کرو۔	اپنا ہر فرض ایمانداری سے ادا کرو۔
۱۲۹۔ حبس ہو رہا ہے اغلبًا آندھی آئیگی	حبس ہو رہا ہے غالبًا آندھی آئیگی

غلط	درست
۱۳۰۔ دن بھر کی بھاگ دھوپ بیکار گئی۔	دِن بھر کی بھاگ دوڑ بیکار گئی
۱۳۱۔ جلیل بمعہ اہل وعیال آیا	جلیل مع اہل وعیال آیا۔
۱۳۲۔ وہ ہر ممالک میں پھرا۔	وہ ہر ملک میں پھرا۔
۱۳۳۔ اُسے شاہی دربار سے خلعت عطا ہوئی۔	اِسے شاہی دربار سے خلعت عطا ہُوا۔
۱۳۴۔ پچاس روپے ماہوار سے میرا گزر نہیں ہوتا۔	پچاس روپے ماہوار سے میری گزر نہیں ہوتی۔
۱۳۵۔ اگر وہ کونین کھاتا تو ملیریا سے نہیں مرتا۔	اگر وہ کونین کھاتا تو ملیریا سے نہ مرتا۔
۱۳۶۔ مجھ کو آرام کرنے دو۔	مجھے آرام کرنے دو۔
۱۳۷۔ آج حامد میرے پاس آوے گا	آج حامد میرے پاس آئے گا۔
۱۳۸۔ عورتیں بھی آئی ہوئیں تھیں	عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں۔
۱۳۹۔ دوسرا جو مسلح تھا مزاحم ہوا	دوسرا جو مسلح تھا مزاحم ہُوا
۱۴۰۔ ہم صحیح سلامت گھر پہنچ گئے	ہم صحیح سالم گھر پہنچ گئے۔
۱۴۱۔ میری ڈاڑھ میں درد ہو رہی ہے	میری ڈاڑھ میں درد ہو رہا ہے۔
۱۴۲۔ لاہور دریائے راوی پر واقعہ ہے۔	لاہور دریائے راوی پر واقع ہے۔
۱۴۳۔ اس نے گاجر کا مربعہ کھایا۔	اس نے گاجر کا مربّہ کھایا

۱۱۔ متفرق

غلط	درست
۱۴۴۔ باز آدمی جھوٹھ مارتے ہیں۔	بعض آدمی جھوٹ بولتے ہیں۔
۱۴۵۔ آپ آؤ گے تو ساری بات بنا دوں گا۔	آپ آئیں گے تو ساری بات بتا دوں گا۔
۱۴۶۔ مجھے آج یہ خواب آئی	میں نے آج یہ خواب دیکھا۔
۱۴۷۔ زیادہ نقطہ چینی نہ کرو۔	زیادہ نکتہ چینی نہ کرو۔
۱۴۸۔ تم نہ آتی تو یہ کام کبھی نہ ہو سکتا۔	تم نہ آتیں تو یہ کام کبھی نہ ہو سکتا۔
۱۴۹۔ میں نے ایک روپیہ ادھارا لیا تھا۔	میں نے ایک روپیہ ادھار لیا تھا۔
۱۵۰۔ میں ان دیکھے کیسے بتا دوں کہ وہ مکان کیسا ہے۔	میں بن دیکھے کیسے بتا دوں کہ وہ مکان کیسا ہے۔
۱۵۱۔ اس کامیابی کا سہرا نوجوانوں کے سر پر ہے۔	اس کامیابی کا سہرا نوجوانوں کے سر ہے۔
۱۵۲۔ میں ہر دن صبح سیر کو جاتا ہوں۔	میں ہر روز صبح سیر کو جاتا ہوں۔
۱۵۳۔ نیز یہ بھی بتاؤ کہ تم کب آؤ گے۔	یہ بھی بتاؤ کہ تم کب آؤ گے۔
۱۵۴۔ آتی دفعہ میری کتاب لیتے آنا۔	آتے ہوئے میری کتاب لیتے آنا۔
۱۵۵۔ بارش برس رہی ہے	بارش ہو رہی ہے یا مینہ برس رہا ہے۔

۱۲- متفرق

غلط	درست
۱۵۶- چار پانچ کرنا شریفوں کا کام نہیں۔	تین پانچ کرنا شریفوں کا کام نہیں۔
۱۵۷- زد کرنی اچھی نہیں	ضد کرنا اچھا نہیں
۱۵۸- آپ میرے کام میں ہرج نہ کریں۔	آپ میرے کام کا حرج نہ کریں۔
۱۵۹- بوڑھے کوّے کو پڑھانا مشکل ہے۔	بوڑھے طوطے کو پڑھانا مشکل ہے
۱۶۰- ننھا سرِ شام سے رو رہا ہے	ننھا شام سے رو رہا ہے
۱۶۱- وُہ آج کل فاقتے مرتا ہے	وُہ آج کل فاقوں مرتا ہے
۱۶۲- تحالص دودھ ملنا مشکل ہے	خالص دودھ ملنا مشکل ہے۔
۱۶۳- میں نے دفتر جانا ہے۔	مجھے دفتر جانا ہے
۱۶۴- یہ بازو میں نے آزمائے ہوئے ہیں۔	یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں
۱۶۵- سرخ سیاہی سے نہ لکھو۔	سرخ روشنائی سے نہ لکھو۔
۱۶۶- چینیوں کا ناک موٹا ہوتا ہے۔	چینیوں کی ناک موٹی ہوتی ہے۔
۱۶۷- جلسے میں بیسوں آدمی موجود تھے۔	جلسے میں بیسیوں آدمی موجود تھے۔
۱۶۸- یہ میرے نانے کا مکان ہے	یہ میرے نانا کا مکان ہے

غلط	درست
۱۶۹۔ ایک انار ہزار بیمار	ایک انار سو بیمار
۱۷۰۔ لاہور کی اخباروں میں جنگ کی اخبار ہوتی ہیں ۔	لاہور کے اخباروں میں جنگ کی خبریں ہوتی ہیں ۔

۱۳۔ متفرق

غلط	درست
۱۷۱۔ بچہ کوٹھے پر سے گر پڑا	بچہ کوٹھے سے گر پڑا
۱۷۲۔ یہ ضرب المثل تم پر صادر آتی ہے ۔	یہ ضرب المثل تم پر صادق آتی ہے ۔
۱۷۳۔ سب کو ایک چابک سے مت ہانکو ۔	سب کو ایک ہی لاٹھی سے مت ہانکو ۔
۱۷۴۔ میں تمہارے گھر گیا مگر تو نہ ملا ۔	میں تمہارے گھر گیا مگر تم نہ ملے
۱۷۵۔ تم نے صحن میں جھاڑو نہیں دیا	تم نے صحن میں جھاڑو نہیں دی ۔
۱۷۶۔ آخر کر ہمایوں کامیاب ہوگیا	آخر ہمایوں کامیاب ہوگیا ۔
۱۷۷۔ میں تمہاری کرتوتیں، دیکھ رہا ہوں ۔	میں تمہارے کرتوت دیکھ رہا ہوں ۔
۱۷۸۔ یہ خبر سن کر بدن پر رونگٹے کھڑے ہوگئے ۔	یہ خبر سن کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے ۔
۱۷۹۔ اسے قبض رہتی ہے ۔	اسے قبض رہتا ہے ۔

غلط	درست
۱۸۰- یہ دیوار اندازاً دس فٹ لمبی ہوگی۔	یہ دیوار تقریباً دس فٹ لمبی ہوگی۔
۱۸۱- ملتان سے لے کر لاہور تک پکی سڑک ہے	ملتان سے لاہور تک پکی سڑک ہے۔
۱۸۲- نسیمہ نے کہا ہم ابھی آتی ہیں۔	نسیمہ نے کہا ہم ابھی آتے ہیں۔
۱۸۳- بھاگتے چور کا جوتا ہی سہی	بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی
۱۸۴- یہ لڑکا میرا ہم جماعتی ہے۔	یہ لڑکا میرا ہم جماعت ہے
۱۸۵- کسی کام میں ہرج نہ ڈالیں	کسی کے کام میں خلل نہ ڈالیں۔
۱۸۶- تقریر کرنی چھوٹوں کا کھیل نہیں	تقریر کرنا بچوں کا کھیل نہیں

۱۴- متفرق

غلط	درست
۱۸۷- میں کبھی بھی نہیں آؤنگا	میں کبھی نہیں آؤنگا
۱۸۸- میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی	میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی
۱۸۹- واسطہ ہمارا تمہارا کیا	ہمارا تمہارا کیا واسطہ
۱۹۰- وہیں پیزاریں تڑ تڑ اس کے پڑنے لگیں۔	وہیں اس کے تڑ تڑ پیزاریں پڑنے لگیں۔
۱۹۱- میرے ابے نے خط لکھا	میرے ابا نے خط لکھا
۱۹۲- مبادا وہ نہ آئے	مبادا وہ آئے۔
۱۹۳- اس نے دو اشعار سنائے	اس نے دو شعر سنائے۔

غلط	درست
۱۹۴- وہ جوتے کے ساتھ اندر چلا گیا	وہ جوتے سمیت اندر چلا گیا
۱۹۵- ہم نے رات آنکھوں میں گزار دی	ہم نے رات آنکھوں میں کاٹ دی

جزو چہارم

تلخیص

(۱۵ نمبر)

باب ۱۴

مختصر نویسی

مختصر نویسی کیا ہے؟ مختصر نویسی یا خلاصہ نگاری کے دراصل یہ معنی ہیں کہ کسی طویل عبارت، لمبے مضمون، خط یا عرضی کے غیر ضروری لفظوں کو نکال کر اس کے اصل مطلب کو بیان کر دیا جائے اور کوئی اہم اور ضروری بات چھوٹ نہ جائے اسے تلخیص بھی کہا جاتا ہے اور انگریزی زبان میں اسے PRECIS WRITING کہتے ہیں۔

تلخیص عام طور پر ایک تہائی الفاظ کی ہونی چاہیئے لیکن اگر اصل عبارت میں اعداد و شمار اور رقوم زیادہ ہیں تو تلخیص نسبتاً طویل ہوگی کیوں کہ عموماً اعداد و شمار اور رقوم کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

ضرورت و اہمیت ہماری نظروں کے سامنے گوناگوں واقعات گزرتے ہیں۔ مسرت آمیز، دلچسپ، پریشان کن اور بھیانک۔ ہم ان کو دیکھتے ہیں اور اکثر واقعات کا ذکر دوسروں سے بھی کرتے ہیں، کبھی تفصیل سے اور کبھی اختصار کے ساتھ۔ مفصل واقعات کو اجمالی طور سے بیان کرنا خلاصہ نگاری کی ابتدا ہے۔ یوں سمجھیے کہ آپ سینما دیکھنے گئے، وہاں سے واپس آکر جو کچھ آپ نے دیکھا ہے اپنے لفظوں میں اختصار کے ساتھ اپنے دوستوں سے بیان کرتے ہیں۔ دراصل غیر شعوری طور پر آپ تین گھنٹے نظروں کے سامنے سے گزرنے ہوئے واقعات کا خلاصہ مختصر لیکن جامع طور پر تھوڑی سی دیر میں کر رہے ہیں۔ ان واقعات کو بیان کرتے وقت آپ اپنی جگہ پر جن چیزوں کو ضروری سمجھتے ہیں بیان کرتے ہیں اور جن کو غیر ضروری سمجھتے ہیں چھوڑے جاتے ہیں۔ آپ حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ آپ کے بیان میں ترتیب اور تنظیم ہو۔ دراصل یہ ایک طرح کا خلاصہ ہی ہے۔

یا ایک اور مثال لیجئے۔ آپ کسی جلسہ میں موجود ہیں جس میں کسی موضوع کے متعلق لوگ موافق اور مخالف دھواں دار تقریریں کر رہے ہیں۔ اب اگر آپ سے کہا جائے کہ اس موضوع کی نسبت موافق اور مخالف جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس کی ایک روداد لکھ کر دیجیے تو اس موضوع کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے آپ اپنے الفاظ میں مختصر طور سے تحریر کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ کو یہاں یہ خیال بھی رکھنا پڑے گا کہ کوئی اہم بات رہنے نہ پائے اور ہر ضروری بات آپ کی رپورٹ میں آجائے۔ آپ کی یہ تمام زحمت دراصل خلاصہ نگاری کے لیے جدوجہد ہے جس سے بارہا آپ کو زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس زمانہ میں خلاصہ نگاری کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ دنیا کا کاروبار بہت بڑھ گیا ہے اور لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ کسی محکمہ کے چلانے والے تمام لوگ ہر ایک تحریر کو شروع سے آخر تک پڑھیں۔ اس لیے عموماً ماتحت لوگ کسی رپورٹ، عرضی یا مضمون کو پوری طرح پڑھ کر اس کے زائد لفظوں کو نکال کر اصل مفہوم کو چند لفظوں میں لکھ دیتے ہیں جس سے افسروں کا وقت بچ جاتا ہے۔

آئے دن جلسے، جلوس اور کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں اور ان میں لمبی لمبی تقریریں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی اخبار یہ سب چھاپے تو اخبار کا حجم بہت بڑھ جائے اور قیمت بڑھ جانے کے علاوہ لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ خبروں کے علاوہ لمبی لمبی تقریریں پڑھیں۔ اس لیے عموماً اخبار نویس ان سب چیزوں کا خلاصہ لکھ دیتے ہیں۔

تعلیمی اہمیت

خلاصہ نگاری کی تعلیمی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا منشا ذہانت کو ترقی دینا ہے اور یہ صلاحیت پیدا کرنا ہے کہ واقعات کا انتخاب صحت کے ساتھ کیا جا سکے، تحریر و تقریر کے منطقی استدلال کو سمجھا جا سکے۔ اور واقعات پر اچھی طرح سے نظر ڈال کر ان کو اجمالی طور پر بیان کیا جا سکے۔ خلاصہ نگاری طالب علموں میں اس بات کا صحیح مذاق بھی پیدا کرتی ہے

کہ وہ خیال اور انداز بیان کے لطیف تعلقات کو سمجھ سکیں اور ان سے لطف اندوز ہو سکیں۔ یہ فن گویا ایک طالب علم کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ کسی خیال کو آسان، واضح اور منظم طور پر پیش کر سکے۔

ادبی اہمیت

ادب اور خلاصہ نگاری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب کا مطالعہ ہی اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ ایک طرف کسی عبارت سے لطف اندوز ہوا جائے اور دوسری جانب ان خیالات کو پرکھا جائے جو اس میں بیان کئے گئے ہیں۔ دراصل کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت ہم غیر شعوری طور پر خیالات کا خلاصہ کرتے رہتے ہیں اور اپنے ذہنی خزانے میں انہیں محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ اگر ہم ادب کا مطالعہ اس طرح کرنے کی عادت ڈالیں کہ ہر عبارت کے اصل مفہوم کو ذہن نشین کرتے جائیں تو امتحانات میں خلاصہ نگاری کوئی مشکل چیز نہیں رہے گی۔

امتحانی لحاظ سے اہمیت

امتحانات کے لحاظ سے اس کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اگر ایک طالب علم سبق، مضمون یا کسی عبارت کو مختصر لفظوں میں احسن طریقے سے پیش کر سکتا ہے تو وہ نہایت اچھے نمبر حاصل کر سکتا ہے۔

خلاصہ نگار کو کن چیزوں کی ضرورت ہے

خلاصہ نگاری کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں:

(۱) الفاظ کا اچھا ذخیرہ اور اس پر قدرت۔

(۲) ضروری خیالات کے انتخاب کے لیے قوتِ فیصلہ۔

اگر طالب علم کے پاس ذخیرۂ الفاظ ہے تو وہ آسانی سے مفہوم کو ادا کر سکتا ہے۔ خلاصہ نگار کو ایسے الفاظ کا علم ہونا چاہیے جو کئی لفظوں کے مفہوم کو اختصار کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اس کے پاس مرادف الفاظ کا بھی اچھا سرمایہ ہونا چاہیئے تاکہ ایک ہی لفظ بار بار استعمال نہ کرنا پڑے۔ اس سلسلہ میں ذیل کی مثالیں دیکھیے:

۱۔ کسانوں نے کھیتوں کو پانی دینا شروع کر دیا۔
(کسانوں نے آبپاشی شروع کر دی)

۲۔ اس کا وہ سیکریٹری، جو آج کل اس کا کام کر رہا ہے اس کے ساتھ ہے۔
(اس کا موجودہ سیکرٹری اس کے ساتھ ہے)

۳۔ تصویر بنانے والے نے ایک نئی تصویر بنائی۔
(مصوّر نے ایک نئی تصویر بنائی)

۴۔ جس پر ظلم کیا جائے اس کی آہ بے کار نہیں جاتی۔
(مظلوم کی آہ بیکار نہیں جاتی)

۵۔ اس کے مکان میں مہمانوں کے ٹھہرنے کا حصہ اچھا خاصا ہے۔
(اس کا مہمان خانہ عمدہ ہے)

۶۔ وہ بہت تھوڑا بولنے کا عادی ہے، عموماً دوسرے کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل نہیں دیتا۔
(وہ کم سخن ہے اور دخل در معقولات کا عادی نہیں)

۷۔ کیا یہی وہ شخص ہے، جس نے قتل کیا ہے؟
(کیا یہی قاتل ہے؟)

۸۔ وہ غریبوں کا بڑا خیال رکھتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔
(وہ بڑا غریب نواز ہے)

خلاصہ نگاری کے لیے عام ہدایات

(۱) سب سے اوّل عبارت نگاری کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے حتّٰی کہ اصل موضوع سمجھ میں آجائے۔

(۲) عبارت کو دوسری بار اس نظر سے پڑھیے کہ آپ کو اس کا خاکہ تیار کرنا ہے۔ یہاں

دو صورتیں ممکن ہیں : پہلی صورت تو یہ ہے کہ عبارت کو پڑھ کر ضروری باتوں کے نیچے خط کھینچے جائیں اور حاشیے پر نمبر لگادیں ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عبارت کو پڑھ کر ضروری باتیں اختصار کے ساتھ ایک کاغذ پر الگ نوٹ کرلی جائیں ۔

(۳) حتی الوسع نکات کی وہی ترتیب قائم رکھی جائے جو اصل عبارت میں ہے ۔

(۴) تلخیص میں نہ تو اصل عبارت کا کوئی اہم خیال نظرانداز کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی زائد خیال کا اپنی طرف سے اضافہ کرنا چاہیے ۔

(۵) اصل عبارت کے چند الفاظ لکھ دینا اور چند حذف کر دینا خلاصہ نہیں کہلاتا۔ بلکہ عبارت کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کرنا چاہیے ۔ البتہ جہاں ضروری ہو اصل عبارت کے الفاظ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں ۔

(۶) ہر طویل عبارت میں بہت سے زائد فقرات ہوتے ہیں جو کسی امر کی وضاحت کے لیے بیان کرنے پڑتے ہیں یا بسا اوقات ایک ہی خیال کو بار بار مختلف الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے ۔ تلخیص میں ایسے زائد فقروں کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے ۔

(۷) سوالیہ اور زائد جملوں کو بدل کر سیدھے سادھے جملے بنا لینے چاہئیں ۔

(۸) اکثر جملوں میں خیال کی وضاحت کے لیے تشبیہ و استعارات سے کام لیا جاتا ہے خلاصہ لکھتے وقت تشبیہ و استعارہ سے گریز کرنا چاہیے اور رنگینیوں سے بچ کر نفسِ مضمون کو سلجھے ہوئے سادہ انداز میں بیان کرنا چاہیے ۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل عبارت دیکھیے :

" دنیا کی مثال ایک شیشہ گر کی دکان کی سی ہے جس میں ہر طرف شیشے پھیلے ہوں ۔ یہاں ذرا احتیاط سے قدم رکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی شیشۂ دل کو ٹھیس لگے ۔ اگر ایسا ہوا تو اس بے احتیاطی کا خمیازہ شیشے کے ٹوٹنے کے ساتھ تم کو بھی اٹھانا پڑے گا۔ تمہارے تلوے بھی زخمی ہوں گے "۔

تلخیص: دنیا میں اس طرح رہو کہ تم کو کسی سے تکلیف نہ پہنچے ورنہ تم کو

خود بھی نقصان اٹھانا پڑے گا۔

(۸)

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

تلخیص: دنیا میں مسافر کے ساتھ ہمدردی کرنے والوں کی کمی نہیں۔

(۹) مکالمے کی صورت میں الفاظ کی ترتیب بدل جاتی ہے اور قواعد کے اعتبار سے بھی جملوں میں تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ مثلاً

اصغر: کہو اکبر تمہارے پرچے کیسے ہوئے!

اکبر: اچھے خاصے ہو گئے ہیں۔

اصغر: حساب کا پرچہ کیسا کیا؟

اکبر: وہ بھی اتفاق سے کافی اچھا ہو گیا۔

اصغر: اتفاق سے اچھا ہو گیا! تمہارے پرچے ہر امتحان میں اتفاق ہی سے اچھے ہو جاتے ہیں؟

اکبر: نہیں بھائی! پرچہ کافی مشکل تھا، لیکن کچھ سوال آتے ہی گئے۔

اصغر: اور جغرافیہ کا؟

اکبر: اس کی طرف سے زیادہ اطمینان نہیں۔ تم جانتے ہو کہ اس مضمون میں میرا دل نہیں لگتا۔

تلخیص: اصغر نے اپنے دوست اکبر سے پرچوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اکبر نے بتایا کہ اس کا حساب کا پرچہ تو بہت اچھا ہو گیا ہے۔ لیکن جغرافیہ کا پرچہ تسلی بخش نہ ہو سکا۔

(۱۰) ہر خلاصہ کا عنوان لکھنا ضروری ہے۔ یہ عنوان عبارت کے بنیادی خیال پر مبنی ہونا چاہیے۔ حتی الوسع عنوان مختصر ہونا چاہیے۔

(۱۱) عام طور پر خلاصہ ایک تہائی الفاظ میں لکھا جاتا ہے۔

(۱۲) اگر عبارت میں مختلف پیرے ہوں تو ہر پیرے کا الگ خلاصہ لکھنا ضروری نہیں بلکہ عبارت کا مطالعہ بحیثیت مجموعی ہونا چاہیے اور خلاصہ میں الفاظ کی تعداد بھی بحیثیت مجموعی ایک تہائی ہونی چاہیئے۔

(۱۳) آخر میں اپنے لکھے ہوئے خلاصے کو پھر پڑھ لیجیے اور وقت ہو تو ایک بار پھر اصل عبارت کو پڑھ کر دیکھ لیجیے کہ خلاصے میں کوئی ضروری بات رہ تو نہیں گئی۔ یہ بھی واضح رہے کہ آپ کی عبارت عمدہ ہو اور قواعد کی خامیوں سے پاک ہو۔

حل شدہ مثالیں

(۱)

"ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں جن میں ایک نے اپنے باپ دادا کو درجۂ کمال پر پہنچا ہوا اور ناقابلِ سہو و خطا سمجھ کر ان کے علوم و فنون اور طریق معاشرت کو کامل سمجھا اور اسی کی پیروی پر جمی رہی اور اس کی ترقی اور بہتری پر اور نئی چیزوں کے اخذ و ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی اور دوسرے نے کسی کو کامل نہیں سمجھا اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے نئے علوم و فنون و طریقۂ معاشرت کے ایجاد میں کوشش کرتی رہی۔ اب دیکھ لو کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور کون تنزل اور کون ترقی کی حالت میں ہے۔"

اب اس عبارت کو بغور پڑھیے۔ سر سید احمد خاں نے اس پیراگراف میں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ قوموں کا فرق دکھایا ہے۔ یا یوں کہیے کہ قوموں کے عروج اور زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہی اس عبارت کا مرکزی خیال ہے۔ سرسری طور پر پڑھنے سے پیرے کا عنوان "دو قسم کی قومیں" معلوم ہوتا ہے لیکن عبارت کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس سے بہتر عنوان جو سمجھ میں آتا ہے یہ ہے "ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ قوموں کا فرق" اس عنوان سے اصل عبارت کا مرکزی خیال بھی فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ صرف دو قسم کی قومیں کہنے سے بات صاف نہیں ہوتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مرکزی خیال کی وضاحت کن کن باتوں سے کی گئی ہے۔

(۱) غیر ترقی یافتہ قومیں :

(ا) اپنے باپ دادا کو کامل اور ناقابل خطا سمجھتی ہیں اور ان کے طریق معاشرت کی پیروی پر لگی رہتی ہیں۔

(ب) نئی چیزوں کے اخذ اور ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کرتیں۔

(۲) ترقی یافتہ قومیں :

(ا) کسی کو کامل نہیں سمجھتیں۔

(ب) ہمیشہ نئے نئے علوم و فنون اور طریق معاشرت کے ایجاد میں لگی رہتی ہیں۔

ہم نے کم و بیش اصل عبارت ہی کے الفاظ میں چند ضروری باتیں دونوں قوموں کے متعلق درج کرلیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ انہیں کو ہم یوں ہی دو چار الفاظ گھٹا بڑھا کر نقل کر دیں۔ بلکہ اس لیے کہ ان کو پیش نظر رکھ کر ہم اپنا پہلا خاکہ تیار کر سکیں۔

پہلا خاکہ :

دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں۔ ایک ترقی یافتہ اور دوسری غیر ترقی یافتہ۔ غیر ترقی یافتہ

قوم اپنے باپ داوا کے علوم وفنون اور طریق معاشرت کو کامل سمجھتی ہے اور اس کی تقلید کرتی ہے۔ خود جدوجہد نہیں کرتی۔ لیکن دوسری قسم کی قوم کے نزدیک کوئی انسان کامل نہیں۔ وہ علمی جدوجہد میں مصروف رہتی ہے اور نئے نئے علوم کی موجد بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی قوم ترقی کی حالت میں ہے۔

لیکن ابھی اس خاکہ کو درست کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ اصل عبارت میں تقریباً ۱۱۰ الفاظ ہیں اور اس خاکہ میں ۵۷۔ اگر یہی عبارت یوں لکھی جائے تو عبارت مختصر ہو جائے گی۔

خلاصہ:

ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ قوموں کا فرق

دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں ایک وہ جو عقل سے کام لیتی ہے اور علوم وفنون اور طریقۂ معاشرت میں نئی راہیں نکال کر ترقی یافتہ بن جاتی ہے اور دوسری باپ دادا کو کامل سمجھ کر ان کی اندھی تقلید میں لگی رہتی ہے اور ترقی سے محروم رہتی ہے۔

(۲)

"حسین نے اس مستقل مزاجی اور دھن پر زمرد کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر گدھے درختوں سے باندھے اور دونوں چٹانوں سے چمٹتے اور ہاتھوں سے پتھروں کے سروں اور درختوں کو پکڑتے ہوئے آگے روانہ ہوئے۔ کوئی دو گھڑی یہ کٹھن سفر کیا ہو گا کہ گھاٹی ختم ہو گئی جس سے نکلتے ہی دونوں نے حیرت سے دیکھا کہ نہر دیہ بجاں اس گھاٹی سے گزر کر یکایک ایک نہایت ہی فرح بخش مرغزار میں بہنے لگی ہے۔ یہ عجب لطف کا مقام تھا۔ قدرت نے خود ہی چمن بندی کر دی تھی شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کے تختے دور دور تک پھیلے چلے گئے تھے۔

نغمہ سنج طیور بھی یہاں کثرت سے نظر آئے جو ہر طرف شاہدان چمن کے حسن وجمال پر صدقے ہوتے پھرتے تھے۔ شام ہو رہی تھی اور بہ جوش بھی بھرے ہوئے عاشقان شاہد گل اپنے معشوقوں کو آخری الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ سماں دیکھتے ہی زمرد نے خوش ہو کے کہا۔ اب ہم اپنی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ اسی وادی میں بھائی موسےٰ مارے گئے اور یہیں کہیں ان کی قبر بھی ہو گی۔ یہ کہہ کے زمرد ایک نازک بدن اور چُست وچالاک ہرنی کی طرح چاروں طرف دوڑی اور ایک بڑے پتھر کے پاس ٹھہر کے چلائی! "آہ! یہی میرے بھائی کی قبر ہے"

(عبدالحلیم شرر)

اشارات

(۱) زمرد کی دھن اور مستقل مزاجی پر حسین کا تعجب۔

(۲) گھاٹی کا مشکل سفر۔

(۳) وادی کا سماں۔

(۴) زمرد کا اپنے بھائی موسےٰ کی قبر کو تلاش کرنا اور پالینا۔

خلاصہ:

حسین اور زمرد موسےٰ کی قبر پر

حسین نے اس مستقل مزاجی اور دھن پر زمرد کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا پھر گدھے باندھے اور دونوں نے بڑی مشکل سے اس گھاٹی کو عبور کیا اور دیکھا کہ نہر دیر بخان اس گھاٹی کے بعد ایک دلفریب وادی میں بہنے لگی ہے۔ یہ وادی بہت سرسبز تھی۔ دور دور تک پھول کھلے ہوئے تھے۔ پرندے چہچہا رہے تھے، شام کا وقت تھا۔ زمرد نے کہا ہماری منزل مقصود یہی ہے۔ یہیں میرے بھائی موسےٰ مارے گئے اور

پھر تھوڑی دیر ادھر اُدھر دوڑ کر اس نے اپنے بھائی کی قبر تلاش کر لی۔

(۳)

ہندوستان کے دانا عہد قدیم میں کبھی بغرض تفریح اور کبھی بغرض اصلاح بعد رسوم ملکی کے بعض معاملات کو بطور نقل کے اس کے کل سامان کے ساتھ محفلوں میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو نقل سے اصل کا مزہ آجاتا تھا۔ شعرار اور انشار پرداز اس میں زور طبع کی داد دیتے تھے اور اسے ناٹک کہتے تھے کیونکہ وہ فقط اندر سبھا یا راس دھاریوں کا سوانگ نہیں ہوتا تھا بلکہ کبھی عظیم الشان بادشاہوں کے معرکے اس میں بیان ہوتے تھے، کبھی نیک اور بد رسموں کی خوبیاں اور برائیاں دکھا کر لوگوں کے دلوں میں برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا کی جاتی تھی۔

لیکن افسوس ہے کہ مدت ہائے دراز سے یہ مفید اور دلچسپ کام اس ملک سے محو ہو گیا ہے اور اگر ہے تو ایک معیوب حالت میں ہے۔ دانایانِ فرنگ نے سنسکرت کے ترجمے کر کے اس میں کچھ کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ اپنے ملک میں رواج دیا اور وہاں اس نے بڑی قدر پائی۔ اس کے لکھنے والے انشا پردازی کے اعلےٰ انشا پرداز کہلاتے ہیں کیوں کہ مضمون انشائیہ کا ادا کرنا بھی ایک جزوِ اعظم انشا کا ہے اور اسے عمل میں لانے والے صاحب فن اور صاحب کمال لوگ ہوتے ہیں۔ یہ فن زبان عرب اور زبان فارس میں نہیں ہے اور چوں کہ اُردو کی شاعری اور انشا پردازی فارسی کی بنیاد پر اٹھی ہے اس لیے اس میں بھی ناٹک نہیں۔

(محمد حسین آزاد)

ناٹک

مولانا آزاد فن ناٹک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں شعراء اور دوسرے لکھنے والے بغرض اصلاح یا تفریح ڈرامہ لکھتے تھے جن میں بادشاہوں کے جنگی کارنامے یا نیک و بد رسموں کی خوبیاں اور برائیاں دکھائی جاتی تھیں :۔
انگریزوں نے سنسکرت ناٹک کا ترجمہ کرنے کے بعد اس کو بہت ترقی دی مگر اردو کے ادیبوں نے فارسی اور عربی کی نقل میں اس فن کی طرف توجہ نہ کی۔

(۴)

اے جناب میرن صاحب ! السّلام علیکم

حضرت آداب۔

کہو صاحب ! آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی۔

حضور ! مَیں کیا منع کرتا ہوں مگر مَیں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں ؟

نہیں میرن صاحب ! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہو گا، جواب لکھنا ضروری ہے۔

حضرت ! وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے کیا خفا ہوں گے ؟

بھائی ! آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔

سبحان اللہ ! اے لو۔ آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

اچھا تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں ؟

کیا کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا ہے وہ پڑھا جاتا ہے تو میں سنتا ہوں اور حظ اٹھاتا ہوں۔ اب جو میں وہاں نہیں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے۔

میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے یا نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی ہوں، بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے (میر مہدی کو) خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔

خلاصہ:

میرزا غالب کا خط مجروح کے نام

میرزا غالب گھر پر موجود تھے۔ میرن صاحب ملنے کے لیے آئے تو میرزا نے پوچھا کہ کیا آج میر مہدی کو خط لکھ دیا جائے مگر میرن صاحب نے صرف اس لیے کہ مرزا کا خط اس وقت میر مہدی کو ملے جب کہ یہ بھی وہاں موجود ہوں، اس طرح کہہ کر ٹال دیا کہ میں اپنے خط میں آپ کے حالات لکھ دیتا ہوں اس لیے خط لکھنے کی ضرورت نہیں، مگر میرزا غالب ان کے کہنے میں نہ آئے اور اس تمام گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے میر مہدی کو خط لکھ دیا۔

(۵)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترقی کی تدبیریں کیا ہیں۔ تدبیریں تو مختلف ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں مگر ہندیوں کا بکثرت دنیا کے دوسرے ملکوں میں پھیل جانا ان میں سے ایک تدبیر ہے جس کی اہمیت میرے دل پر روز بروز نقش ہو جاتی ہے۔ صنعتی تعلیم کے لیے سفر درکار ہے۔ محنت مزدوری کے ذریعے ڈھونڈنے کے لیے سفر درکار ہے۔ مگر ان کے علاوہ بعض اور فوائد دوسرے ممالک میں چندے

قیام پذیر رہنے سے وابستہ ہیں جن کا احساس وطن میں کم ہوتا ہے اور زیادہ تر وطن کے باہر ہی ہو سکتا ہے۔ دوسری قوموں کے اوضاع اور اطوار دیکھنے سے خیالات میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے جو نہایت قابل قدر ہے اور جب کسی ملک میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہو جو مدتوں باہر رہے ہیں اور جنہوں نے اپنے ہاں کی ہوا کے سوا اور مقامات کی بھی ہوا کھائی ہے تو نامعلوم طور پر ایک قسم کا تغیر ملک کے حالات اور خیالات میں پیدا ہونے لگتا ہے جیسا کہ میدہ پر خمیر کا اثر ہوتا ہے۔

خلاصہ:

سفر وسیلۂ ظفر

دیگر ممالک میں کچھ عرصہ قیام پذیر رہنے سے ترقی کے بہت سے وسائل حاصل ہوتے ہیں۔ عام ترقی اور صنعتی تعلیم کے لیے ہندیوں کو دوسرے ممالک میں جانے کی ضرورت ہے۔ دوسروں قوموں کے ملنے جلنے اور ان کے اوضاع و اطوار دیکھنے سے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ نیز دیگر ممالک سے واپس آئے ہوئے لوگوں کی موجودگی سے ملک کے حالات اور خیالات میں چپکے ہی چپکے ایک تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔

(۶)

جس آدمی کا خیال شائستہ ہے اس کے تمام کام خود بخود ایسی عمدہ تہذیب سے انجام پاتے ہیں جس سے وہ تمام خوشیاں اور آرام جو تہذیب و شائستگی کا نتیجہ ہیں بالضرور حاصل ہوں۔ نامہذب آدمی کے تمام کام ہمیشہ بے ترتیب ہوتے ہیں جن سے زندگی اور تلخ ہو۔

مہذب آدمی کی مثال بالکل انسان کی تندرستی کی سی ہے۔ جب تک انسان تندرست ہوتا ہے، اس کے تمام اعضاء اپنے اپنے موقع سے وہ تمام کام خود بخود کرتے ہیں جو انسان کی راحت اور خوشی بڑھانے کا ذریعہ ہوں اور رنجوں اور تکلیفوں کو دور کریں۔ جن آدمیوں کا خیال شائستہ نہیں ہوا ہے اگر وہ کسی شائستہ اور مہذب قوم کی چند رسموں اور دستوروں کی تقلید ہی کو شائستگی سمجھتے ہیں ان کی مثال بالکل ایک ایسے مریض کی سی ہے، جو تندرستوں کی سی حرکتیں کرنا چاہتا ہے۔ مگر کسی طرح مریض کی یہ حرکتیں ایک تندرست آدمی کے کاموں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح جن لوگوں کے ابھی خیال شائستہ نہیں ہوئے ان کے بعض تقلیدی طریقے ان کو مہذب اور شائستہ نہیں کر سکتے۔"

خلاصہ:

شائستگی اور ناشائستگی

ایک شائستہ آدمی کے تمام کام خود بخود عمدہ ترتیب سے اس طرح ترتیب پاتے ہیں کہ جس طرح ایک تندرست آدمی کے اعضاء اپنا اپنا کام خود بخود موقع پر کرتے رہتے ہیں۔ تندرست آدمی کو اس کی تندرستی سے راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ شائستہ آدمی کو اس کی شائستگی کی وجہ سے راحت نصیب ہوتی ہے۔ بعض آدمی شائستہ نہیں ہوتے لیکن خود کو مہذب قوموں کی چند رسموں کی تقلید سے شائستہ سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ اس بیمار کی طرح ہیں جو تندرستوں کی سی حرکتیں کرنا چاہتا ہو مگر وہ کر نہ سکے۔

(۷)

عورت کو فطرت نے کمزور پیدا کیا ہے اس لیے زمانے نے ہمیشہ اسے اس کے حقوق سے محروم رکھا ہے اور ہمارے سماج نے تو اِس حق تلفی کو ظلم و تشدّد کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اسی لیے ادب میں ہر دور میں ایک گروہ ایسے لکھنے والوں کا رہا ہے جس نے عورت کے حقوق اسے واپس دلانے کی کوشش کی ہے۔ شاعروں نے اس غرض سے کہیں کہیں اس استحقاق کو زیادہ مستحکم بنانے کے لیے عورتوں کو اپنے افسانوں کا کردار بنایا ہے۔ ان میں سیرت کی جتنی اچھائیاں ممکن تھیں پیدا کیں۔ عورت کو ایثار، محبت، اطاعت اور خدمت کی دیوی بنا کر پیش کیا۔ شوہر خواہ اس پر کتنے ظلم کرے اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ اس کے پیر دھو دھو کر پیئے۔ اپنی نیند، عیش و آرام کو صرف اپنے سرتاج زندگی کے آرام پر بھینٹ چڑھاوے اور اس کے آرام کو اپنا سکھ چین اور خدمت کو عبادت جانے۔

خلاصہ:

عورت کی سیرت

عورت فطرتاً کمزور ہے۔ زمانے نے اسے اس کے حقوق سے پوری طرح محروم رکھا ہے۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں نے عورت کی سیرت کو اجاگر کر کے اس کے حقوق دلانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ عورت کو ایثار، محبت، اطاعت اور خدمت کی دیوی بنا کر پیش کیا ہے۔ شوہر کے مظالم کے باوجود اُسے خدمت گزار دکھایا ہے۔ اور شوہر کی بے لوث خدمت میں زندگی بسر کرنے کو عورت کی فطرت قرار دیا ہے۔

(۸)

آج ہمارے لیے پھول حسین ہے۔ دریا کی روانی دل کش ہے شفق اور قوس قزح کے رنگوں میں بلا کا جادو ہے۔ ہم انہیں دیکھتے ہیں اور ان سے لذت حاصل کرتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچتے کہ اس لذت کے سرچشمے کہاں ہیں اور ان تمام مظاہر کا حسن ہماری خارجی زندگی اور شعور اور ان کی حرکت کے ساتھ کہاں تک وابستہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملکہ الہامی نہیں بلکہ اکتسابی ہے جسے انسان نے صدیوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد حاصل کیا ہے۔ جس طرح ہم کھانا کھاتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ یہ غذا کس محنت اور جاں فشانی سے پیدا کی گئی ہے، کس کس جتن سے حاصل کی گئی ہے، اس کی قیمت کیا ہے؟ اور اس کے کیمیاوی عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ کیوں کہ کھانا کھاتے وقت ہم صرف ذائقے کو اہمیت دیتے ہیں، اسی طرح جمالیاتی تجربے کے وقت ہم اس کے سرچشموں اور تاریخی جڑوں کا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کرتے اور صرف لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن جب تجزیہ اور تنقید کا وقت آتا ہے تاکہ ہم اپنے علم کو منظم کر کے نئی تخلیق کے لیے بہتر صلاحیت پیدا کریں تو ہم سماجی اور تاریخی جڑوں کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔

اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے مجموعی مفاد سے وابستہ نظر آئے گی۔ جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی۔ پھول سے انسان نے بیج حاصل کئے ہیں اور بیج سے غذا۔ دریاؤں سے اس نے اپنی پیاس بجھائی ہے اور اپنے کھیتوں کو سینچا ہے۔ شفق نور کی پہلی علامت ہے۔ وحشی انسان کی راتیں بڑی بھیانک ہوتی تھیں اور وہ اجالے کے لیے شفق کی پہلی سرخ لکیر کا منتظر رہتا تھا۔ اس لیے یہ صرف جہالت اور توہم پرستی نہیں تھی کہ

ہمارے پرکھوں نے سحر کو اوشا دیوی اور دریا کو گنگا ماتا بنا دیا۔

خلاصہ:

حسن اور افادیت

آج ہم پھول اور دریا کی روانی، شفق اور قوس قزح کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہمارے اس ذوق کا منبع کہاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمالیاتی ذوق کا ملکہ الہامی نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو ہر حسین چیز انسان کے مجموعی مفاد سے وابستہ نظر آئے گی۔ پھول سے انسان نے بیج حاصل کیے اور بیج سے غذا۔ دریاؤں سے اس نے اپنی اور اپنے کھیتوں کی پیاس بجھائی۔ شفق نور کی پہلی علامت ہے اور نور سے انسان نے اپنی روح کی پیاس بجھائی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ تمام حسین چیزیں انسان کے مجموعی مفاد سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۹)

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ پرست اس کی پابندی اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو کریں، مَیں تو کہتا ہوں کہ مَیں نے صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں جو آندھی آئے، مینہ برسے، روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے ادھر انھوں نے لائبریری کے دروازے پر قدم رکھا اور ادھر گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن بجائی۔ لطف یہ ہے کہ ان میں ایک مشرق میں رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں یہ تین شخص کون تھے ایک منشی ذکاء اللہ صاحب، دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب اور تیسرے مولوی نذیر احمد صاحب۔ ایک چیلوں کے کوچے سے آتا ہے دوسرا دریبہ سے اور تیسرا

کھاری باؤلی سے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے آکر دوسرے کا انتظار کیا ہو۔ اگر ان میں سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ (نذیر احمد کی کہانی)

خلاصہ:

پابندیٔ وقت

یہ درست نہیں کہ پابندیٔ وقت صرف یورپ والوں ہی کا حصہ ہے۔ مَیں دہلی کے تین اصحاب منشی ذکاء اللہ، پیارے لال اور مولوی نذیر احمد کی مثال پیش کرتا ہوں جو بلا ناغہ روزانہ ٹھیک چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک نہ پہنچتا تو یہ یقینی بات تھی کہ وہ سخت بیمار ہے یا چلنے سے معذور ہے۔

(۱۰)

ایک بادشاہ شکار کو جا رہا تھا اچانک اس کی نظر ایک درویش پر پڑی۔ درویش کے نزدیک ایک کتا تھا جو گوشت کا ٹکڑا کھا رہا تھا۔ درویش خوش دکھائی دے رہا تھا۔ بادشاہ اس کے نزدیک جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے مذاق کے طور پر درویش سے کہا۔ ارے بھائی! اللہ کے دربار میں تیرا کتا بہتر ہے یا تو خود۔ درویش نے مؤدبانہ جواب دیا۔ حضور اگر ہم اپنے مالک حقیقی کا حکم بجا لائیں تو کتے سے بہتر ورنہ کتا ہم سے بدرجہا بہتر۔ کہتے ہیں کہ اس معمولی سے واقعہ نے بادشاہ کی زندگی کو بالکل بدل دیا۔

(۱۹۷۳ء ملتان بورڈ)

خلاصہ:

مالک کی اطاعت

ایک بادشاہ نے ایک خوش دل درویش کے کتے کو گوشت کھاتے دیکھا اور طنزاً پوچھا اللہ کے حضور میں کتا بہتر ہے یا تو خود۔ درویش بولا۔ اگر ہم مالک کی اطاعت کریں تو بہتر ورنہ کتا بدرجہا بہتر۔ بادشاہ یہ سن کر بے حد متاثر ہوا۔

(۱۱)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہماری تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے مگر اس پر آنسو بہانے کی بجائے اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ باقی ماندہ پاکستان کی سالمیت کو کیونکر برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں منجملہ اور اسباب کے الگ علاقائی عصبیت بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ خطرہ اب بھی ہمیں درپیش ہے۔ وطن دشمن اور خود غرض سیاستدان اب بھی صوبائی تعصبات کے فتنوں کو مسلسل ہوا دے رہے ہیں اور یوں وطنِ عزیز میں انتشار پھیلا رہے ہیں۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا انحصار، سیاسی استحکام پر ہوتا ہے۔ مگر انتشار پھیلانا ایک منفی سیاست ہے جو استحکام کی ضد ہے۔ پچیس سال کے بعد اب ہمیں ایک ایسی منزل پر پہنچ جانا چاہیئے تھا جہاں کوئی پنجابی، سندھی، سرحدی یا بلوچی نہ ہوتا بلکہ صرف اور صرف پاکستانی ہوتے۔ ہمیں اس وقت عظیم تر پنجاب، سندھ یا سرحد کی ضرورت نہیں بلکہ عظیم تر پاکستان کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم صوبائی تعصبات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔

(۱۹۷۳ء لاہور بورڈ گروپ I)

تلخیص:

علاقائی تعصبات اور سقوطِ ڈھاکہ

پاکستان کی ترقی اور سالمیت کے لیے سیاسی استحکام ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے خود غرض سیاستدانوں کی انتہاپسندانہ پالیسیوں سے خبردار رہنا ہوگا۔ اور علاقائی تعصبات کو ختم کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان ہی کی وجہ سے ملک ماضی میں وطن دشمن عناصر کی سازشوں کا شکار رہا اور ہمیں مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اب صوبائی تعصبات سے ہٹ کر عظیم تر پاکستان بنانے کی ضرورت ہے۔

(۱۲)

اردو کی زندگی اور ترقی پذیری کا صحیح نقش جمانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کو ہماری قومی زندگی میں منفرد اور نمایاں حیثیت حاصل ہو۔ یہ امر واقعہ ہے کہ پاکستان کثیر اللسانی ملک ہے۔ مختلف علاقوں کے طلبہ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے جب انہیں قریبی ماحول میں اردو کی بجائے علاقائی زبان ہی سے واسطہ رہتا ہے اور دوسری طرف سرکاری اور عدالتی سطح پر انگریزی کو مسندِ فضیلت پر بیٹھا دیکھتے ہیں اور خود مدرسے کے اندر بھی انہیں اردو زبان کی بالاتری نظر نہیں آتی تو بجا طور پر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اردو ایک مکتبی زبان ہے جس کے بغیر بھی گزارہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم قومی زبان کی عالی منصبی کے دل سے قائل ہیں تو ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اردو کو سب کے لیے ایک ناگزیر ضرورت بنا دیں۔ کوئی اعلیٰ طبقے کا فرد ہو یا غریب گھرانے کا سپوت، ہر ایک کے لیے اردو کے بغیر سماجی، معاشرتی اور علمی دنیا میں معزز مقام کا حصول ناممکن ہو جائے۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری مراسلات، احکام و قوانین، عدالتی کارروائی اور فیصلے اعلیٰ ملازمتوں

کے امتحانات اور انٹرویو، غرض ہر جگہ اردو کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ ورنہ زندگی کو معاشی معیاروں پر جانچنے والے لوگوں کے لیے اردو کو زندگی اور ترقی پذیری کا ثبوت مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

(۱۹۷۳ء سرگودھا بورڈ دوسرا گروپ)

تلخیص

اُردو بحیثیت قومی زبان

قومی زبان اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ضروری ہے کہ اسے مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ طلباء اسے صرف مکتبی زبان ہی نہ سمجھیں بلکہ ایک ناگزیر ضرورت محسوس ہو۔ اس کے بغیر کسی فرد کو معاشرے اور علمی دنیا میں اعلےٰ مقام نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنا کر اس کی اہمیت کا احساس دلانا ضروری ہو گا۔

عبارات برائے مشق

مندرجہ ذیل عبارتوں کی تلخیص ایک تہائی الفاظ میں کیجیے۔ نیز مناسب عنوان تجویز کیجیے۔

(۱)

وقت بے شک ایک دولت ہے۔ جو کوئی اس دولت کو بے اندازہ و بے حساب خرچ کرتا ہے وہ روز بروز بے نوا اور تہی دست اور مفلوک ہوتا جاتا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہتا ہے، ہمیشہ رنجیدہ و پریشان اور زمانے کا شاکی رہتا ہے۔ موت بھی اس کو اس پشیمانی اور اندوہ سے نہیں چھڑا سکتی بلکہ اُس کے حق میں

موت کا آنا گویا مجرم کے لیے گرفتاری کا پروانہ ہے۔ وہ جس طرح جیتے جی قسمت اور تقدیر کو جھینکتا رہتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد وقت گذشتہ اور عمر رفتہ کے حسرت واندوہ میں مبتلا رہے گا۔

سچ یہ ہے کہ وقت ضائع کرنا بھی ایک طرح کی خودکشی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خودکشی ہمیشہ کے لیے زندگی سے محروم کر دیتی ہے اور تضیع اوقات ایک محدود زمانے تک زندہ کو مردہ بناتی ہے۔ یہی منٹ، گھنٹہ اور دن جو غفلت اور بے کاری میں گزر جاتے ہیں اگر آدمی حساب کرے تو ان کی مقدار مہینوں بلکہ برسوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر اس سے کہا جاتا کہ تیری عمر سے دس پانچ برس کم کر دیے گئے تو یقیناً اس کو سخت صدمہ ہوتا لیکن وہ خود معطل بیٹھا ہوا اپنی عمر عزیز کو برباد کر رہا ہے اور اس کے زوال و فنا پر کچھ افسوس نہیں کرتا۔

(اسماعیل میرٹھی)

(۲)

موجودہ مسلمان عصر حاضر کے تہذیبی ارتقاء سے کچھ اس طرح مرعوب ہو چکا ہے کہ اس کے مقابلے میں اس کو اپنی ہر چیز حقیر نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس حقیقت سے آج تک بے خبر ہے جس کو خود اہل فرنگ کے بہت سے بالغ نظر اور سنجیدہ فکر لوگوں نے آج محسوس کر لیا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب حاضر کی عظمت و ترقی کی رفتار بلاشبہ حیران کن ہے مگر بے اختیار ترقی انسانیت کے لیے قابل فخر نہیں ہے۔ بلکہ باعث صد عار ہے۔ انسانیت کو ایسے تمدنی ارتقاء کی ضرورت ہے جو تمام انسانی قوتوں کو کمال کی طرف لے جائے اور فضائل انسانیت کا کوئی زاویہ اس کی نگہ التفات سے محروم نہ ہو، مگر تمدن جدید کی حالت یہ ہے کہ اس نے مادی پہلو کے لحاظ سے انسان کو انتہائی بلندی پر پہنچا دیا ہے اور اس کی روحانی صلاحیتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی مجموعی طور پر بربادی کی

طرف بڑھ رہی ہے۔ اس بنا پر تہذیب جدید کی ارتقائی حرکت غیر متوازن اور سراپا ہلاکت آفریں ہے اور حق یہ ہے کہ آج انسانوں کو اس پُر خطر راہ سے ہٹا کر فکر و عمل کے صراطِ مستقیم کی طرف لے جانا ہی انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے: اور یہ کام جتنا دِقت طلب اور کٹھن ہے اتنا ہی شاندار نتائج کا حامل ہے۔

(اردو ایڈوانسڈ ۱۹۶۴ء)

(۳)

ذوقِ حسن اور لطافتِ جذبات ہر آرٹ کی جان ہے۔ ادب اور شاعری بھی ایک آرٹ ہے۔ اگر شاعر یا ادیب کوئی ایسا حسین اور پاکیزہ تخیل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس سے روشناس ہو کر چاہے تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی، ہم اپنی سرشت کی ازلی حیوانیت کو بھول کر آدمی میں انسانیت کے قائل ہونے لگتے ہیں۔ یا اگر حسن و عشق کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ وہ جاذب نظر ہوتی ہے اور ہم اسے دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ ہمارے پیمانِ وفا، ایثار نفس، بے غرضی، سچائی اور پاکیزگی کے حسیات کچھ اس طرح اثر قبول کرتے ہیں کہ زندگی کا ہوش آنے لگتا ہے۔ اگر وہ مظلوم و بے کس کے دکھ درد کا بیان کرتا ہے تو ہمارے دل پر کچھ اس طرح سے چوٹ لگتی ہے کہ ہم تڑپ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور انسانی ہمدردی کے جوش کی کیفیت ہماری تمام تر قوت عمل کو متحرک کر دیتی ہے۔ اگر شاعر آزادی کا گیت گاتا ہے تو حُبِ وطن کا جوش ہم میں ایسی بے خودی اور وارفتگی پیدا کر دیتا ہے کہ ہم مٹا دینے اور خود مٹ جانے کے لیے سر بکف ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ اگر شاعر کی زبان اور ادیب کا قلم یہ تاثیر اور جادو رکھتا ہے تو یہ اس کا کمال ہے اور جو شاعری ایسے ذوقِ حسن اور لطافتِ جذبات کی کیفیت پیدا کر سکتی ہے وہ یقیناً اعلےٰ پائے کی ہے۔

(اردو ایڈوانسڈ ۱۹۶۳ء)

(۴)

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف اٹھ بھاگتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپاشنکر برہم چاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔ وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے، دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مُکّہ بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے، ابھی سے کیا فکر؛ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ مَیں کیا میرے آباد اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہو گی۔ (پطرس بخاری)

(۵)

یوں تو ہماری قومی زندگی کے اکثر شعبے ترقی کے بجائے تنزل کی طرف مائل ہیں مگر ادب کا زوال قومی سانحہ ہے۔ ایک المناک اور دردناک سانحہ، قانون کا احترام ختم ہو رہا ہے۔ قومیت کا احساس مِٹتا جا رہا ہے۔ ذہنی رفعت کی جگہ حیوانی جذبات پرورش پا رہے ہیں، جرائم بڑھتے جا رہے ہیں۔ منجملہ اور اسباب کے میرے نزدیک اس کی وجہ قوم کی ادب سے اجتماعی طور پر لاتعلقی بھی ہے اور گھٹیا نام نہاد ادب کا نتیجہ۔ کیونکہ اچھے ادب کا کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اعلےٰ اقدار کو فروغ دے اور قلب و روح میں ایک رفعت اور جلا بخشے۔ ادب بھی زندگی کی طرح ایک متحرک قوت ہے لہٰذا اس میں بدلتے رہنے کی صلاحیت ضروری ہے لیکن یہ حرکی قوت اگر تعمیر کے بجائے تخریب، ضبط و نظم کے بجائے انتشار اور بلندی کے بجائے پستی کی طرف

لے جاتی ہے تو یقیناً ایک تکلیف دہ بات ہوگی۔ جو قومی ضیاع کی آئینہ دار ہوگی لہٰذا ضروری ہے کہ ادب کو کاروبار نہ بنایا جائے۔ (میرزا ریاض)

(۶)

۱۰ رمئی کی صبح کو مَیں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا ہے۔ مَیں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیال دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا ہو سکتا تھا، دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مَیں نے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے؟ بولے! ہاں جہاز کا انجن ٹوٹ گیا ہے۔ مَیں نے کہا، آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے؟ بولے کہ اگر جہاز کو برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائیگاں کرنا بے عقلی ہے۔ ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا۔

(شبلی نعمانی)

(۷)

نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں ایک بانکے جہانگیر بیگ تھے۔ ان کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ باپ نواب صاحب کے درباریوں میں تھے۔ جہانگیر بیگ کی شورہ پشتی کی خبر کئی بار سن کر نواب صاحب خاموش رہے مگر آخر کار ایک دن بہت برہم ہوئے اور ان کے والد سے کہا، آپ کے صاحب زادے کی شورہ پشتیاں حد سے گزرتی جاتی ہیں۔ انہوں نے سارے شہر میں اودھم مچا رکھا ہے۔ ان سے کہہ دیجئے گا کہ اپنے اس بانکپن پر نہ بھولیں، ناک نہ کٹوائی تو میں سعادت علیخاں نہیں۔

باپ خود بھی بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھے، گھر آئے اور بی بی سے کہا۔ اتنے میں جہانگیر بیگ جو کہیں باہر گئے ہوئے تھے، آ گئے۔ ماں نے کہا "بیٹا! خدا کے لیے اپنی حرکتیں چھوڑ دو۔ تمہارے ابا بہت پریشان ہیں"۔ مرزا صاحب نے کہا "میرا کچھ قصور بھی بتائیے گا یا خالی الزام ہی دیجیئے گا"۔ باپ نے کہا، کوئی ایک قصور ہو تو بتایا جائے! آج نواب صاحب کہنے لگے کہ "اپنے صاحب زادے سے کہہ دینا میں سعادت علی خاں نہیں جو ناک نہ کٹوا دی ہو"۔ باپ کی زبان سے اتنا سنتے ہی مرزا صاحب کو جو طیش آیا تو کمر سے پیش قبض نکالی اور خود ہی اپنی ناک کاٹ کر باپ کی طرف پھینک دی اور بولے "بس اسی ناک کاٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے ہیں؟ لیجئے یہ ناک لے جا کے انہیں دے دیجئے"۔ (عبدالحلیم شرر)

(۸)

اس افلاس اور ذلت کے باوجود ہندوستان شرافت اور عظمت سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ قدیم روایات اور موجودہ مصیبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کا خمار تھا مگر اسی کے ساتھ اس میں ایک حسن تھا جو روحانی کیفیت نے اس کے خدوخال میں پیدا کر دیا تھا۔ اس کے عجیب و غریب تصورات، نادر تخیلات اور پاکیزہ جذبات کے نقش ایک ایک کر کے اس کے چہرہ پر ابھر آئے تھے۔ اس کے شکستہ جسم سے روحانی عظمت و وقار کی جھلک اب تک نظر آتی ہے۔ اس نے تاریخ کی طویل منزلیں طے کی ہیں اور اس سفر میں علم و حکمت کا بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اسے بہت اجنبیوں سے سابقہ پڑا۔ اس نے انہیں اپنے وسیع خاندان میں شامل کر لیا۔ اس نے بڑے نشیب و فراز اٹھائے۔ سخت ذلتیں اور مصیبتیں جھیلیں اور عجیب عجیب تماشے دیکھے۔ لیکن اس لمبے سفر میں اوّل سے آخر تک اس نے اپنی پراچین تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس سے تقویت اور زندگی حاصل کی اور دوسرے ملکوں کو بھی اس میں

سے حصہ دیا۔ جھولے کی طرح وہ کبھی اوپر گیا کبھی نیچے آیا۔ اٹھا تو اپنے تخیل کی پرواز سے آسمانوں کی خبر لایا، گرا تو پستی کے گڑھے میں پاتال تک پہنچا۔

(ترجمہ، میری کہانی ۔ از جواہر لعل نہرو)

(۹)

دنیا میں ایک میدان کارزار ہے اور جس چیز کو تم عمل کہتے ہو دراصل یہ ایک حریفانہ کش مکش اور مقابلہ ہے۔ پس جس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح و شکست سے چارہ نہیں، وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں؛ اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے اُسے کامیابی و ناکامی اور فیروزمندی و نامرادی سے چارہ نہیں۔ کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہماری تلوار اور دشمن کی گردن ہو۔ کیوں نہ ہم اپنے سر و سینہ میں بھی زخم کے نشان پائیں۔

بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا چاہیے کہ پاؤں میں کانٹا چُبھ گیا، لیکن سپاہی کو زخم پر زخم کھا کر بھی اُف نہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کی جگہ بستر نہیں ہے بلکہ میدانِ جنگ ہے۔ شکست و زخم کا خوف ہے تو میدان میں قدم ہی نہ رکھو! اور تلوؤں کو بچانا چاہتے ہو تو تمہارے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ چلو گے تو ٹھوکر کھاؤگے اور لڑوگے تو زخم سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو اور بیٹھ کر رونے کی جگہ تیزی سے چلو، کیونکہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا اتنی دیر میں قافلہ اور دور نکل گیا۔ (ابوالکلام آزاد)

(۱۰)

ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مضبوط اور تنومند نوجوان کو دیکھ کر جو بہت صبح معاش کی تلاش میں نکلا تھا، یہ کہا کہ "کیا اچھا ہوتا، اس شخص کی قوت اور پھرتی اللہ کی راہ میں صرف ہوتی!" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایسا نہ کہو! کیونکہ اگر وہ مانگنے سے بچنے اور لوگوں کا محتاج نہ ہونے کے لیے

محنت کرتا ہے تو یہ بھی خدا کی راہ میں ہے۔ اور اگر اپنے ضعیف ماں باپ یا بال بچوں کی پرورش کے لیے محنت کرتا ہے تو وہ بھی خدا ہی کی راہ میں ہے۔"

(اردو متبادل ۱۹۶۶ء)

(۱۱)

ایک دن ایک بزرگ میر اقبال کے پاس آئے، باتیں ہوئیں۔ اقبال نے فرمایا، سائیں جی! میرے لیے دعا کیجیے۔ وہ کہنے لگے "کیا آپ کو دولت مطلوب ہے؟" فرمانے لگے "نہیں!" پھر فقیر نے پوچھا کہ "دنیا میں عزت و رتبہ چاہتے ہو؟" "نہیں مجھے یہ بھی نہیں چاہیے"۔ سائیں نے پوچھا "تو پھر آپ خدا سے ملنا چاہتے ہیں؟"

اس پر اقبال کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی۔ فرمایا "خدا سے ملنا! سائیں جی! خدا خدا کرو۔ مَیں اس سے کیوں کر مل سکتا ہوں؟ مَیں بندہ وہ خدا، میرا اُس کا واسطہ صرف عبادت ہے۔ ملنا کیا معنی؟ مجھے اگر معلوم ہو جائے کہ خدا مجھ سے ملنے آرہا ہے تو مَیں بیس کوس بھاگ جاؤں۔ اس لیے کہ دریا قطرے سے ملے گا تو قطرہ غائب ہو جائے گا۔ مَیں قطرے کی حیثیت سے قائم رہنا چاہتا ہوں اور اپنے آپ کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ قطرہ رہ کر اپنے میں دریا کے خواص پیدا کرنا چاہتا ہوں"۔ اس پر سائیں جی بے خود ہو کر جھومنے لگے۔ اور کہنے لگے "واہ اقبال بابا! تُو خود فقیر ہے! تجھے کسی دوسرے فقیر کی دعا کی کیا ضرورت ہے"۔

(۱۲)

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات اور آفتاب لب بام ہوتا ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال

زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہو گی، اُمید ہوتی ہے۔

(۱۳)

نوجوان سمجھتا ہے کہ حقیقی بامسرت زندگی بعد میں آئے گی۔ جوانی کے گزر جانے پر وہ سوچتا ہے کہ یہ پہلے حاصل تھی۔ جب آدمی کسی ایک جگہ ہو تو وہ کہتا ہے کہ یہ ہندوستان یا یورپ میں ہو گی۔ وہاں پہنچتا ہے تو اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تو وطن واپس چلی گئی ہے اور وہیں ہماری منتظر ہے۔ بامسرت زندگی کی تلاش کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جو تتلیاں اکٹھی کرتا ہے۔ تتلی کو اڑتے ہوئے دیکھا جائے تو کیسی خوشنما لگتی ہے لیکن جونہی اسے پکڑا جائے اُس کے پَر انگلیوں میں مَسلے جاتے ہیں اور رنگ غائب ہو جاتا ہے۔ (اردو لازمی ۱۹۷۰ء لاہور بورڈ)

(۱۴)

وہ مسلمانوں کی بدحالی اور پریشانی روزگاری سے سخت متفکر تھے اور ہندوستان کی سیاست جس رخ چل رہی تھی، ایک موقع پر تو اس سے ایسے مایوس ہوئے کہ اپنی کوششوں سے ناامید ہو کر دوسرے مسلمانوں کی طرح خود بھی ہندوستان کو چھوڑ کر مصر میں سکونت اختیار کرنے پر آمادہ نظر آنے لگے لیکن پھر غمِ ملت نے انہیں روکا اور پوری قوم کو اس طرح تباہی اور بربادی میں چھوڑ کر کسی طرف چل دینا خلافِ انسانیت سمجھتے ہوئے ہندوستان میں ڈٹے رہنے پر مستعد ہو گئے اور ہوا کے رخ کی مطابقت میں سیاسی، سماجی، ادبی اور اخلاقی اصلاح کی خاطر تعلیم و تربیت میں مسلمانوں کو انگریزوں سے قریب تر لانے اور کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کرنے میں مصروف ہو گئے۔ تاکہ جس حقارت سے مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور مسلمان بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلائیں۔ سر سید کے اس طرز کو انگریزوں نے دل سے خوش آمدید کہا اور اپنے حصول مقصد کا بہترین آلہ کار سمجھتے ہوئے سر سید کی کوششوں کو مستحسن نگاہوں سے دیکھا۔ (اردو لازمی ۱۹۷۰ء سرگودھا بورڈ)

(۱۵)

سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانے تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے اپنے اس سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل (قدرتی اسلوب) میں ہر قسم کی تحریروں، کیا کتابیں، کیا مضامین، کیا مقدمات کے فیصلے اور تحریریں برابر لکھتے رہے۔ اس بیس سال کی مشق اور مہارت نے جو کہ ایک انداز پر متصل جاری رہی ضرور ہے کہ ان کے قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون کے سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہو گی۔

(اردو لازمی، ۱۹۷۰ء ملتان بورڈ)

(۱۶)

ہر بچے کی آنکھوں کے سامنے جو نمونہ مستقل طور پر رہتا ہے وہ اُس کی ماں ہے سو معلموں کے برابر ایک اچھی ماں ہوتی ہے۔ گھر عورت کی سلطنت ہوتا ہے۔ اس میں سارے احکام اسی کے چلتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی ننھی منھی رعیت پر حکم نافذ کرتی ہے۔ ہر چیز کے لیے بچے اپنی آنکھوں کو اُسی کی طرف لگائے رہتے ہیں۔ ہر وقت ان کے روبرو وہی مثال اور نمونہ ہے جس کی پیروی کرتے ہیں اور نقل اتارتے ہیں۔ اسی واسطے بچوں کے چال چلن اور طور طریقے پر ماں کا اثر بہ نسبت باپ کے زیادہ ہوتا ہے۔ گھروں میں ماں کا نیک مثال ہونا ایک بڑی نعمت ہے۔

(۱۹۷۱ء لاہور بورڈ دوسرا گروپ)

(۱۷)

جنگ نہایت درجے کا اجتماعی عمل ہے۔ اس کی تیاری، اس کے لیے افراد کا چناؤ، چنے ہوئے خوش بخت افراد کی تربیت، ان افراد یعنی افواج کے لیے ہتھیاروں کی ایجاد و ساخت، فراہمی و حفاظت، ان تمام کی مناسب نقل و حرکت اور لاتعداد دوسرے امور اجتماعی سطح پر

ہی انجام پاتے ہیں۔ لیکن اس اجتماعی اہمیت کے ساتھ ساتھ ان افراد کے انفرادی مقام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنہیں مل کر معاشرے کو تشکیل کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سپاہی کے انفرادی کردار پر گہری نظر رکھی جائے کیونکہ کسی سپاہی کی انفرادی کمزوری ہو سکتا ہے کہ پوری فوج کے لیے کسی وقت تباہی کا باعث بن جائے اور کسی افسر کی لغزش کا تباہ کن اثر تو ہر گز محتاجِ بیان نہیں ہے۔

(۱۹۷۱ء ملتان بورڈ پہلا گروپ)

(۱۸)

عوام کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت و پاسبانی حکومت کے اوّلین اور بنیادی فرائض میں سے سب سے اہم فرض ہے اور جو حکومت اس فرض کو کما حقہ انجام نہیں دیتی یا یا اس سے غفلت برتتی ہے اسے مسندِ اقتدار پر متمکن رہنے کا کوئی حق نہیں۔ حکومت کے قیام کے بارے میں جتنے نظریئے بھی آج تک سامنے آئے ہیں، ان کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانی معاشرے میں حکومت جیسی قوتِ قاہرہ کے وجود کا بنیادی جواز یہی ہے کہ وہ اپنی طاقت سے اجتماعی زندگی میں امن امان قائم کرے اور اپنے دائرہ اقتدار میں ایسے حالات پیدا کرے جن میں لوگ اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور اپنے انسانی حقوق کے معاملہ میں اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھیں۔ حکومت کے باقی فرائض بعد میں آتے ہیں، جو حکومت اس اساسی فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، وہ آخر دوسرے فرائض کس طرح انجام دے سکتی ہے۔ عدل کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ مظلوم کو نہ صرف ظالم کی چیرہ دستیوں سے بچایا جائے بلکہ ظالم کا غرورِ طاقت اس طرح توڑا جائے کہ وہ ایک مہذب معاشرے میں کسی پر ظلم کرنے کی ہمت ہی نہ کر سکے۔

(۱۹۷۱ء سرگودھا بورڈ پہلا گروپ)

(۱۹)

نوجوان نسل کا اضطراب ایک بیمار ذہن کا اضطراب ہے اور اس پریشان حالی اور انتشار کی پیداوار ہے جو ایک غیر مطمئن، ناآسودہ، بے مصرف اور بے عمل زندگی، غیر یقینی حالات اور بے مقصد زندگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آج کے نوجوان کے سامنے کوئی سمت نہیں، کوئی منزل نہیں، کوئی نصب العین نہیں، گھریلو زندگی میں وہ محبت اور شفقت سے محروم ہے۔ گھر سے باہر اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اسی لیے اس میں وحشت اور تشدد کا رجحان نمایاں ہو گیا ہے۔ معاشرہ میں ایک باعزت مقام حاصل کرنے کے لیے جن دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہ اتنے حوصلہ شکن ہیں کہ اس میں بے ہمتی اور مایوسی پیدا کر دیتے ہیں۔ بیزاری اور اکتاہٹ مایوسی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اعمال سے اس کی اندرونی پریشانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ تعلیمی زندگی سے فرار، آئے دن کے مظاہرے، توڑ پھوڑ اور دیگر مختلف کارروائیاں اسی اندازِ فکر و عمل اور اسی خلفشار کی مظہر ہیں۔

(۱۹۷۲ء لاہور بورڈ دوسرا گروپ)

(۲۰)

یوں تو ہمارے سامنے بہت سے مسائل ہیں لیکن ان میں تعلیم کی کمی اور مالی مشکلات بہت زیادہ اہم ہیں۔ ملک کی بڑی قلیل آبادی لکھنا پڑھنا جانتی ہے۔ لہٰذا اکثریت نہ پوری طرح اپنی صلاحیت سے کام لے پاتی ہے اور نہ ملکی و معاشرتی مسائل کو پوری طرح سمجھ سکتی ہے۔ پھر یہ کہ مالی پریشانیوں نے ان کی زندگی میں بڑی الجھنیں پیدا کر دی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں ذہنی اطمینان اور آسودگی میسر نہیں۔ مزید یہ کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی قومی تقاضوں کو اس طرح پورا نہیں کر رہا جس طرح اسے کرنا چاہیے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ہمارے قومی تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ اپنی ترقی کی خاطر ہمیں ان مسائل پر فوری توجہ دینی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جب تعلیم عام ہو جائیگی اور تعلیم کے معیار صاف ستھرے ہوں گے اور ساتھ ہی ملک میں ایسا نظام معیشت رائج ہو جائے گا جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہوگا تو ہماری قوم

تیزی سے ترقی کی منزلوں کو طے کرنے لگے گی۔ جن قوموں کا شمار آج ترقی یافتہ قوموں میں ہوتا ہے ان میں تعلیم عام ہے اور وہ تعلیم ایک خاص مقصد رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ معاشی لحاظ سے لوگوں کو فراغت حاصل ہے۔ (۱۹۷۳ء سرگودھا بورڈ دوسرا گروپ)

(۲۱)

میر کی مثنویوں کی چند کمزوریاں بھی ہیں ایک تو اختصار کا رجحان ہے جو واقعات کو کھلنے نہیں دیتا۔ چنانچہ قصے کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ ان کی کردار نگاری میں یہ عیب ہے کہیں تو وہ معمولی لوگ لیکن انکے اوصاف غیر معمولی بتائے گئے ہیں۔ اسطرح وہ مناظر کی تصویر کشی میں بھی اختصار کو مدّنظر رکھتے ہیں۔ انہیں مناظر کی تصویریں اس طرح کھینچنی چاہییے تھیں کہ ہمارے سامنے ان کی پوری اور صحیح تصویر آجاتی لیکن افسوس ہے کہ میر ایسا نہ کر سکے۔ اس طرح محبت کی جذبات نگاری اور معاملات بھی ان کے ہاں عام انسانی سطح سے ہٹ کر کیفیات لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ (۱۹۷۳ء ملتان بورڈ)

(۲۲)

اس وقت تک ملک میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کے لیے نوجوانوں کو قصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری سابقہ حکومتوں پر عائد ہوتی ہے اور سیاست دانوں پر۔ حکومتوں پر اس لیے کہ انہوں نے کبھی سنجیدگی سے ان کے جائز مسائل کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور سیاست دانوں پر اس لیے کہ انہوں نے اس عظیم مگر معصوم قوت کو اپنے سیاسی اغراض کے لیے اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے تو ضرور استعمال کیا مگر پھر انہیں بیچ منجدھار چھوڑ کر اقتدار کی کرسی پر متمکن ہو گئے اور ان بیچاروں کی خبر تک نہ لی مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ موجودہ حکومت کی قوت کا سرچشمہ ہی یہ نوجوان ہیں اور مقام شکر ہے کہ ان کے مسائل پر اب سنجیدگی سے غور ہو رہا ہے اور چونکہ ملک کو برسوں کے بعد صحیح قیادت نصیب ہوئی ہے اس لیے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اب ایک صحیح جہت اپنے تمام تر عظیم مقاصد کے ساتھ متعین ہو جائے گی اور نوجوانوں کا اضطراب

اسی سمت اپنی تمام تر قوتوں اور جولانیوں کے ساتھ گامزن ہوگا ۔ (۱۹۷۳ء لاہور بورڈ)

(۲۳)

زبان انسانی تمدن کی ایک اہم بنیادی ضرورت ہے ۔ انسانی معاشرے کے اجتماعی مفادات ہوں یا انفرادی حاجات، دونوں کو زبان کا محتاج ہونا پڑتا ہے ۔ تہذیبی و ثقافتی اقدار زبان کے طفیل اظہار کی راہ پاتی ہیں اور اسی کے سایۂ عاطفت میں گردشِ ایام سے پناہ حاصل کرتی ہیں ۔ زبان ہی وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے فرد اپنی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتا ہے اور معاشرے کی ترقی و پیش رفت میں مفید کردار ادا کرتا ہے ۔ قومی اور اجتماعی اعتبار سے زبان ملت کے ماضی اور حال کے درمیان مضبوط رشتہ استوار کرتی اور افراد میں قومی شعور کو فروغ دے کہ ان میں خیال و عمل کی ہم آہنگی پیدا کرتی ہے ۔ علم کی ترویج اور فنی مہارتوں کی اشاعت کا ذریعہ بھی زبان ہے اور چونکہ تعلیم کا مقصد بھی علم کو پھیلانا اور قومی اقدار کا تحفظ ہے اس لیے زبان اور عمل تعلیم لازم و ملزوم ہیں ۔ (۱۹۷۳ء سرگودھا بورڈ پہلا گروپ)

جزو پنجم

روداد نویسی

و

مکالمہ نویسی

(۱۵ نمبر)

روداد نویسی سے مراد کسی تقریب، جلسہ، نمائش، مباحثہ، ڈرامہ، سفر مذاکرہ، مشاعرہ وغیرہ کی کارروائی تحریر کرنا ہے۔ طلبا ایسی تقریبات میں عموماً شریک ہوتے رہتے ہیں لہٰذا ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جو کچھ مشاہدہ کریں اس کی روداد بھی قلمبند کر سکیں۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ واقعات کو ایک خاص ترتیب سے پیش کیا جائے ترتیب مکانی ہو یا ترتیب زمانی۔ ترتیب مکانی سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی نمائش یا مینا بازار کی رپورٹ لکھنا ہے تو نمائش گاہ میں رکھی ہوئی چیزوں یا اسٹالوں کی ترتیب کو مدنظر رکھا جائے جو چیز پہلے نظر آئے اس کا ذکر پہلے کیا جائے۔ ترتیب زمانی سے مراد یہ ہے کہ واقعات اس ترتیب سے پیش کیے جائیں جس ترتیب سے ظہور پذیر ہوئے۔

بعض اوقات ترتیب مکانی اور ترتیب زمانی دونوں کو یکجا کر کے اجتماعی ترتیب سے روداد لکھی جاتی ہے۔ مشاعرہ یا تقریری جلسہ کی روداد لکھتے وقت اس بات کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ شعرا اور مقررین کو ان کی شہرت اور اہمیت کے مطابق مقام دیا جائے۔

روداد کے لیے سادہ اور شگفتہ زبان استعمال ہونی چاہیے۔

باب ۱۵

روداد نویسی

روداد یوم اقبال

مدت گزری عیں اس وقت جبکہ پاک وہند پر غلامی کے بادل منڈلا رہے تھے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا ایک شعلہ نمودار ہوا جس کی روشنی سے لوگوں میں نیا شعور پیدا ہوا اور مُردہ قوم میں نئی روح پڑ گئی۔ وہ شعلہ تو بجھ گیا لیکن اس کی روشنی اسی طرح نور پھیلاتی رہی۔ لوگ اس کی روشنی کی سجھائی ہوئی راہوں پر چلتے رہے۔ آخر ایک دن منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ شعلہ اقبال تھے اور روشنی جو باقی رہی ان کا کلام تھا۔ وہ ہمارے قومی شاعر تھے۔ انہوں نے ہمیں نیا شعور دیا، نئی راہیں دکھائیں۔ ان کے اسی احسان کی یاد تازہ کرنے کے لیے ان کے ارادتمند ہر سال ان کے یومِ فراق پر مختلف طریقوں سے ان کی یاد مناتے ہیں۔ کہیں جلسے ہوتے ہیں اور کہیں مشاعرے۔

ہمارے کالج کی بزمِ ادب نے بھی امسال اپنے اس محسن کی یاد میں ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ یہ تقریب ۲۱۔ اپریل کی شام کو پانچ بجے منعقد ہوئی۔ اس تقریب کا آنکھوں دیکھا حال سُنیے۔

دھوپ میں ابھی کچھ تیزی ہے۔ سورج کا ایک تہائی سفر باقی ہے۔ سایہ کے لیے کالج کے وسیع میدان میں سائبان نصب ہیں۔ لوگ جلسہ گاہ کی طرف آ رہے ہیں اور نشستوں پر بیٹھے جا رہے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر محمد اوج کی رہنمائی کر رہے

ہیں۔ سٹیج سجا ہوا ہے۔ دائیں بائیں اور سامنے اقبال کے چند اہم شعر آویزاں ہیں بزمِ ادب کے معتمد ممتاز رضا بغل میں رجسٹر تھامے ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی علامہ اقبال کے فرزند ارجمند جناب ڈاکٹر جاوید اقبال ہیں پرنسپل صاحب اور پروفیسر صاحبان ان کا استقبال کرتے ہیں اور انہیں کرسیٔ صدارت پر بٹھاتے ہیں۔ سامعین تالیوں سے انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔

معتمد نے پروگرام کا آغاز کر دیا ہے۔ حافظ جاوید اختر تلاوت کلام پاک کرتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد پرنسپل صاحب مہمان خصوصی کا مختصر تعارف کراتے ہیں اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سب سے پہلے ننھے طالب علم ترنم رضا کا نام پکارا گیا۔ اس نے اپنی سریلی آواز میں کلامِ اقبال پیش کر کے سامعین کو مسحور کر دیا۔

؎ جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

ان کے بعد اسلم ضیا نے مقالہ پیش کیا۔ عنوان تھا "اقبال کا مردِ مومن" انہوں نے بتایا کہ اقبال کے تصوّر میں مردِ مومن کی بنیاد نیابت الٰہی کے اسلامی تصوّر پر ہے۔ جب اِنسان فقر و عشق کی منزلیں طے کر کے اپنی خودی کی تکمیل کر لیتا ہے تو وہ انسانِ کامل کے درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کی ہیبت سے پہاڑ رائی بن جاتے ہیں۔ اس کی طاقت کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

؎ کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سال دوم کے طالب علم وقار مہدی نے اقبال کی یہ غزل پیش کی۔

؎ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

پرویز سعید نے "اقبال کا شاہین" کے عنوان سے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے اقبال کے تصور شاہین کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اقبال مسلمان نوجوانوں میں شاہین کی صفات بلند پروازی، تیز نگاہی، دشمن پر جھپٹنے کی طاقت وغیرہ پیدا کرنے کے متمنی ہیں۔

ؔ جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

پروفیسر عباسی صاحب نے اقبال ایک فنکار کی حیثیت سے' کے عنوان سے ایک پُر مغز مقالہ پیش کیا اور دلائل سے ثابت کیا کہ اقبال ایک شاعر کی حیثیت سے بھی دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں۔

نثار جمیل سال سوم نے علامہ اقبال کے وہ اشعار ترنم سے پڑھ کر سنائے جو بالِ جبریل میں "جاوید کے نام" کے عنوان سے شامل ہیں۔

ؔ دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اور جب یہ شعر پڑھا گیا تو سماں بندھ گیا۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اب مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر جاوید اقبال کو دعوت دی گئی۔ آپ نے بزم ادب کی کوششوں کو سراہا اور شکریہ ادا کیا کہ انھیں اس پُر وقار محفل میں شرکت کا موقع دیا گیا ہے۔ آپ نے اقبال کے پیغام پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور نوجوانوں کو نصیحت کی کہ وہ شاعرِ مشرق کی تعلیمات پر عمل کریں۔ طلبا اپنے اندر وہ صفات پیدا کریں جو ایک سچے مسلمان میں ہوتی ہیں۔ اقبال یہی چاہتے تھے کہ مسلمان نوجوان اسلام کے سچے سپاہی بنیں۔ تن آسانی چھوڑ کر یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم

سے کام لیں - اپنی خودی کی تکمیل کریں۔ موجودہ حالات میں افکار اقبال کو تمام اسلامی دنیا میں پھیلانے کی ضرورت ہے - ملت اسلامیہ متحد ہو کر اسلام کا پرچم بلند کرے -

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

حرکت زندگی ہے اور جمود موت، جو قومیں مسلسل جد وجہد کرتی رہتی ہیں زندہ رہتی ہیں اور جو عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہیں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں -

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

آخر میں پرنسپل صاحب نے مہمان خصوصی ڈاکٹر جاوید اقبال اور دیگر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اس جلسہ میں شرکت کر کے طلبا کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور مہمانوں کو چائے کی دعوت دی گئی۔

روداد ایک ادبی تقریب (مذاکرہ) کی

(گورنمنٹ کالج وحدت کالونی)

مارچ اپریل کے خوشگوار مہینے ہر سال اپنے جلو میں سینکڑوں تقریبیں لے کر آتے ہیں - ان معتدل مہینوں میں ہر گہ فنی، تہذیبی اور ثقافتی محفلیں سجتی ہیں اور لوگ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا دل کھول کر مظاہرہ کرتے ہیں- ان دنوں کالجوں کا ماحول بھی فکری سرگرمیوں کا مرکز بن جاتا ہے اور مختلف درسگاہیں مشاعروں اور مباحثوں کے لیے انہی دنوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ اس دفعہ اس قسم کے تعلیمی اور ثقافتی معرکے اتنا طول پکڑ گئے کہ اپریل

کے بعد تک بھی جاری ہیں۔ مئی کے مہینے میں لاہور کی کولتار زدہ سڑکوں پر دوپہر کے وقت نقل و حرکت جاری رکھنا بہت مشکل ہے لیکن گورنمنٹ کالج وحدت کالونی کی مجلسِ ادب کے منتظمین بڑے سخت جان نکلے کہ انھوں نے اپنی مجلس کی تقریب مئی کی ایک جلتی ہوئی دوپہر میں منعقد کر ڈالی اور اس میں مذاکرے کا عنوان بھی اتنا گرما گرم رکھا کہ جب مقررین نے تقریریں کرنا شروع کیں تو پوری محفل سے دھواں اٹھنے لگا۔ مذاکرے کا عنوان تھا "نئے دور میں ادیبوں کے فرائض" یہ عنوان بہت ٹیڑھا بھی ہے اور متنازعہ بھی کیونکہ بہت سے ادیب ایسے ہیں جو ادب پیدا کرنے کے معاملے میں اپنے آپ پر کوئی فرض عاید کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ ادب میں مقصدیت تلاش کرنے کو بے معنی سمجھتے ہیں اور ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔ تقریب کے صدر گورنر کے مشیر خصوصی شیخ جاوید الرحمن تھے۔ انھوں نے ادب اور مقصدیت کی بحث میں الجھنے کی بجائے سیدھے سادھے انداز میں کہا کہ ہمارے ادیبوں نے گذشتہ پچیس سالوں میں اور بہت سی باتیں کیں لیکن انھوں نے نئی نسل کو یہ نہیں بتایا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو آخر پاکستان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ادیبوں کی اس کوتاہی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہماری جدید نسل کو سرے سے ان عوامل کا علم ہی نہیں جو پاکستان کے قیام کا موجب بنے تھے۔ ادیب خواہ کسی بھی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہو اسے اپنے وطن سے بے پناہ لگاؤ ہونا چاہیے کیونکہ اس کا سارا فن اور تمام تخلیقات بنیادی طور پر اپنے وطن کی سرزمین سے قوت نمو حاصل کرتی ہیں اور پھلتی پھولتی ہیں۔ ہمارے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ نئی نسل کو نظریۂ پاکستان سے روشناس کرائیں اور اس سلسلے میں ان کے ذہنی انتشار کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری جدید نسل پاکستان کی سیاسی اور تاریخی ضرورت کو جتنا بہتر طور پر سمجھے گی اتنا ہی ملک مضبوط ہوگا اور قومی خودمختاری اور آزادی کے باعث بہتر ادب

پیدا کرنے کے مواقع پیدا ہو سکیں گے۔ چنانچہ ہمارے قلم کاروں کا اس وقت فریضہ یہ ہے کہ وہ قائد اعظم اور برصغیر کے مسلمانوں کی انقلاب آفریں جد وجہد کو اپنے فن میں زیادہ سے زیادہ اجاگر کریں اور لوگوں کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ادیبوں کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادیبوں کو نئے حالات اور نئے تقاضوں کو پہچاننا چاہیے اور انہیں بدلتی ہوئی سماجی حقیقتوں کو اپنے فن میں سمونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے عوام کے شعور اور احساسات کو بیان کرنے کے اتنے بہتر مواقع موجود نہیں تھے جتنے آج ہیں۔ موجودہ حکومت عوام محنت کشوں اور کسانوں کی حکومت ہے۔ ہمارے معاشرتی نظام میں یہ ایک بہت ترقی پسندانہ تبدیلی آئی ہے اور یہ وہی تبدیلی ہے جس کے خواب ترقی پسند ادیب ایک عرصے سے دیکھ رہے تھے چنانچہ اس وقت تمام ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ زمانے کی نئی قدروں سے بھرپور تعاون کریں اور عوام میں ایک ایسا انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں اپنے فکری اور عملی مسائل حل کرنے میں مدد دے اور زندگی کے سفر میں ان کی راہنمائی کر سکے۔

عمر فیضی نے کہا کہ تمام ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو۔ ٹی وی وغیرہ پر کم وبیش انہی لوگوں کی پذیرائی ہے جو ایوب خاں اور یحییٰ خاں کے دور میں ان اداروں کو لوگوں کی "برین واشنگ" کے گر سکھایا کرتے تھے اور اب انہیں فکری انقلاب برپا کرنے کے طریقے بتا رہے ہیں۔ ایسے پیشہ ور خوشامدیوں سے حکومت اور عوام کا کوئی بھلا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان بے سود لوگوں پر تکیہ کرنے کی بجائے دوسرے صاحب الرائے ادیبوں سے کام لیا جانا چاہیے۔

پروفیسر سجاد باقر رضوی نے کہا کہ بدلے ہوئے حالات میں ادیبوں کے فرائض

بہت بڑھ گئے ہیں ۔ انہیں ترقی پسند معاشرے کی تعمیر میں حکومت سے مکمل تعاون کرنا چاہیے اور لوگوں میں بیداری پیدا کرنا چاہیے ۔ سجاد باقر رضوی چونکہ ادبی اقدار کے بارے میں بہت محتاط رویہ رکھتے ہیں ۔ اس لیے انہوں نے زور دے کر کہا کہ کوئی ادب پارہ ادبی سطح سے گرنے نہ پائے اور اپنے ترقی پسندانہ رویوں کے باوجود فن کا اعلیٰ نمونہ ہو ۔ نذیر ناجی نے اپنی تقریر میں کہا کہ لفظی گورکھ دھندوں اور تلفظ کے چکروں میں پڑنے کی بجائے ہمیں براہ راست عوام اور محنت کشوں سے تحریک ادب حاصل کرنی چاہیے ۔ (روزنامہ مساوات لاہور)

ایک مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال

انجمن طلبا کے زیر اہتمام پچھلے دنوں کل پاکستان مشاعرہ منعقد ہوا ۔ اس میں مقامی شعرا کے علاوہ ملک کے نامور شعرا نے شرکت کی ۔ اس موقع پر کالج ہال کو خوب آراستہ کیا گیا ۔ مشاعرہ کا آغاز رات کے آٹھ بجے ہوا ۔ ملک کے نامور شاعر اور ادیب جناب احمد ندیم قاسمی نے صدارت فرمائی اور انور کاظمی نے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے ۔

قاری شفیق صاحب نے تلاوت کلام پاک فرمائی ۔ اس کے بعد کالج کے چند طلبا نے غزلیں پیش کیں ۔

محمود شام کالج کے ہونہار طالب علم ہیں ۔ غزل خوب کہتے ہیں ۔ ایک شعر پیش خدمت ہے ۔

ے آنکھوں کا نور دل کا اجالا بھی لے اُڑے
ہم کو تو اپنے دوست ہی سنسان کر گئے

ریاض کو دعوتِ سخن دی گئی ۔ انھوں نے پُر کیف ترنم سے سماں باندھ دیا ۔

؎ آنکھوں میں تیز دھوپ کے نیزے گڑے رہے
ہم تیرے انتظار میں پھر بھی کھڑے رہے
سائے کو لوگ پوچھتے آئے ہیں دیر سے
پتّے ہمیشہ پاؤں میں بکھرے پڑے رہے

پروفیسر سلیم بیتاب کو اس شعر پر خوب داد ملی۔

؎ آج بیتاب فصیلوں کی ضرورت کیا ہے
شہر کو شہر کے لوگوں سے بچایا جائے

بیدل کے اس شعر کو بے حد پسند کیا گیا۔

؎ پڑ گئی پاؤں میں زنجیر تمنّاؤں کی
میں نے جب زلف کے حلقے سے نکلنا چاہا

اب جھنگ کے قلندر شاعر شیر افضل جعفری قلندرانہ شان سے ایک قطعہ پڑھتے ہیں اور پھر غزل۔ انوکھا انداز، اچھوتے الفاظ۔ سامعین بڑے شوق سے لطف اٹھا رہے ہیں۔

پھر سرمد و منصور کا آتا ہے زمانہ
اب اہلِ چمن گل کی جگہ دار اگائیں

محترمہ کشور ناہید کو اس شعر پر خوب داد ملی۔

؎ کچھ یونہی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

سید جعفر طاہر نے بڑے پر زور لہجے میں غزل پیش کی۔ اس شعر کو کئی بار سُنا گیا۔

؎ میں نے جو تیرے تصوّر میں تراشے تھے کبھی
لے گئے وہ بھی مرے گھر سے پجاری پتّھر

جناب ضمیر جعفری مزاح گو شعرا میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار سے سامعین خوب محظوظ ہوئے اور تالیاں بجتی رہیں۔ ایک شعر آپ بھی سنیئے۔

ے بڑی مشکل سے کوئی دیدہ ور پیدا نہیں ہوتا
جو ہوتا ہے مسلمانوں کے گھر پیدا نہیں ہوتا

طلبا کے اصرار پر پروفیسر تقی انجم علیگ نے چند اشعار پیش کیے۔ مطلع یہ تھا۔

ے ہم وفا کر نہ سکے، ان سے جفا ہو نہ سکی
ایک بھی رسم محبّت کی ادا ہو نہ سکی

اب حبیب جالب کی باری ہے۔ ترنّم سے پڑھتے ہیں اور داد وصول کرتے ہیں۔ بعض اوقات طلبا بھی ساتھ پڑھنے لگتے ہیں۔

ے تیری صبح عاشقی میں کہیں شام آ نہ جائے
تجھے بے وفا کہوں میں وہ مقام آ نہ جائے
وہ جو منزلوں پہ جا کر کسی ہم سفر کو لوٹیں
انہیں رہزنوں میں تیرا کہیں نام آ نہ جائے

جناب قتیل شفائی ملک کے نامور شاعر ہیں۔ کیف میں ڈوبا ہوا ترنّم اور مہر بلب سامعین۔ ان کی آواز کا ہر پیچ اور غزل کا ہر مصرع حاضرین کو دُور کسی ان دیکھی دنیا میں لیے جا رہا ہے۔

ے اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

دورِ حاضر کے مقبول شاعر احمد فراز غزل سرا ہوئے تو ایک سماں بندھ گیا۔

ے رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

"خوابوں میں ملیں" "کتابوں میں ملیں" ایک طرف سے آواز گونجی چنانچہ انہیں وہ مشہور غزل بھی سنانا پڑی۔

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

سب سے آخر میں احمد ندیم قاسمی تالیوں کی گونج میں غزل سرا ہوئے ہیں۔ سادہ مگر پُرکار اشعار۔

ہر لمحہ اگر گریز پا ہے
تو کیوں مرے دل میں بس گیا ہے
جھکتی نظریں بتا رہی ہیں
مرے لیے تو بھی سوچتا ہے
میں ترے کہے سے چپ ہوں لیکن
چپ بھی تو بیان مدعا ہے
ہر دیس کی اپنی اپنی بولی
صحرا کا سکوت بھی صدا ہے
اس وقت کا میں حساب کیا دوں
جو تیرے بغیر کٹ گیا ہے
اب کس کی تلاش میں ہیں جھونکے
میں نے تو دیا بجھا دیا ہے

تمام شعرا اپنا اپنا کلام سنا چکے۔ انجمن طلبا کے صدر مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مشاعرہ کے اختتام کا اعلان کرتے ہیں۔ رات گہری ہو رہی ہے۔ ستارے آنکھیں جھپک رہے ہیں۔ چاند کی کرنیں نور برسا رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے اور ندیم قاسمی کی گھمبیر آواز گونج رہی ہے۔

اب کس کی تلاش میں ہیں جھونکے
مَیں نے تو دیا بجھا دیا ہے

ثقافتی ڈائری

گذشتہ دنوں سی بی کالج برائے خواتین میں ڈرامیٹک کلب کی سالانہ تقریب کا انعقاد ہوا۔ آج کل جب کہ تعلیمی اداروں میں بڑی گھمبیر خاموشی ہے، امتحانات کی بوریت نے کالج کی طالبات کو مضمحل کر رکھا ہے ایسے میں کسی کالج میں ہلچل مچا دینے والے پروگرام بڑے عجیب سے لگے۔

گرمی اپنی پوری بہار دکھا رہی تھی، شام کے سائے ڈھلنے لگے تو کالج کے سبزہ زار میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ جھلملاتے رنگا رنگ آنچل اور زیورات کی چمک دمک، ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ابھی پاکستان میں سونے کے بڑے ذخائر موجود ہیں اور سونے کی مہنگائی محض ایک اخباری خبر ہے۔ کالج کی پرنسپل بیگم مسعود نے بتایا کہ پروگرام ٹھیک چھ بجے شروع ہوگا اور ہوا بھی ایسے ہی۔ ٹھیک ٹائم پر جناب فیض احمد فیض اپنی بیگم کے ہمراہ تشریف لائے اور فیتہ کاٹ کر تقریب کا افتتاح کیا۔

اس پروگرام میں دو کھیل پیش کئے گئے ایک "کھلونا" دوسرا "چور نہیں آئے"۔ کھلونا بچوں کے کھیلنے والا نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسا کھلونا تھا جس سے مہذب سوسائٹی کے لوگ کھیلتے ہیں، سماج کھیلتا ہے۔ اس کھیل میں ہمارے معاشرے کی وہ جھلک دکھائی گئی جس سے آج کا انسان خود بھی تنگ آ چکا ہے۔ کسی طرح ایک شخص گاؤں سے آنے کے بعد سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو اتنا مہذب ظاہر کرتا ہے کہ اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ کھیل بڑے خوبصورت اور دل کش انداز سے پیش کیا گیا۔ خوبصورت مکالموں نے ناظرین کے ذہن پر اچھا تاثر چھوڑا۔ اس کھیل میں انجم گیلانی، شاہدہ سعید، شہناز اور یاسمین نے نمایاں حصہ لیا۔ انجم گیلانی اور شاہدہ سعید نے اچھی اداکاری کی۔

اس کے بعد ایک مزاحیہ خاکہ استاد اور شاگرد کے آپس کے سلوک کا آئینہ دار تھا

بعدازاں ایک رقص پیش کیا گیا اور پھر ایک طالبہ نے ایک خوبصورت بھارتی گیت کی ہوبہو نقالی کی۔ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور ہمارا سر اکثر ندامت سے جھک جاتا ہے جب ہم مستقبل کے معماروں کو بھارتی فلموں کے گانوں کو بڑے فخر اور اطمینان کے ساتھ سٹیج پر پیش کرتے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ شائد ہمارے ملک کے شاعر ابھی تک پائیدار تخلیقات نہیں کر سکے جو کم از کم تعلیمی اداروں میں مقبول ہوں۔ خدا جانے نقالی کا یہ رجحان کب ختم ہوگا؟

بعدازاں دوسرا کھیل "چور نہیں آئے" پیش کیا گیا۔ اس کھیل میں تسنیم اختر، رضیہ، فرحت اور عمرانہ الطاف نے حصّہ لیا۔ ڈرامے کے ڈائیلاگ بہت دل چسپ تھے مگر موضوع کے اعتبار سے ڈرامہ کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ البتہ بہترین اداکاری سے طالبات نے ناظرین کو بہت محظوظ کیا۔ اس ڈرامے میں ایک بیمہ پالیسی کے مالک کی ذہنیت کو پیش کیا گیا تھا کہ کس طرح وہ اپنے تمام زیورات کو بیمہ کرا کر چوروں کا منتظر رہتا ہے کہ کب زیورات چوری ہوں اور وہ بیمہ کی رقم حاصل کر سکے۔ چونکہ زیورات کی چوری نہ ہونے کی صورت میں وہ تمام عمر بیمہ کی قسطیں ادا کرتا رہے گا۔ بالآخر جب چور آئے تو زیورات کو نقلی سمجھ کر چھوڑ جاتے ہیں اور دیگر قیمتی سامان جن میں کپڑے اور تانبے کے برتن شامل تھے وہ سمیٹ کرلے جاتے ہیں اور میاں بیوی اپنی سکیم کے بری طرح فعل ہو جانے پر کفِ افسوس مَلتے رہ جاتے ہیں۔ اس ڈرامے میں میاں بیوی نے جاندار اداکاری سے کھیل کی دلچسپی برقرار رکھی۔

اس تقریب کے تمام تر انتظامات سال چہارم کی طالبات نے کیے۔ چونکہ دوسری کلاسیں امتحانات میں مشغول ہیں اس لیے کسی دوسری جماعت کی کوئی طالبہ ڈراموں میں شریک نہیں تھی۔ کالج کی پرنسپل بیگم مسعود نے فیض احمد فیض کا تعارف عام طالبات سے کرایا جنھوں نے ڈراموں کی ترتیب و تدریں میں حصّہ لیا تھا۔ ان طالبات کی کارکردگی میں مسز جاوید اور مسز حہ خدر کی محنت بھی شامل تھی۔ بعدازاں انہوں نے حاضرین کا

شکریہ ادا کیا اور فیض صاحب کا بھی شکریہ ادا کیا۔ فیض صاحب نے اس پروگرام کو دیکھ کر اداکارہ طالبات کی کوششوں کو خوش آئند قرار دیا۔ لیکن رقص و موسیقی کے حصے کو خاصا کمزور قرار دیا۔ انہوں نے کہا تاہم طالبات محنت اور لگن سے کام لیں تو اس میدان میں آگے بڑھنے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں مجموعی طور پر یہ پروگرام نہایت کامیاب رہا۔ (روزنامہ مساوات)

روئداد ایک دلچسپ مباحثہ کی

کالج سٹوڈنٹس یونین کے زیرِ اہتمام ایک دلچسپ پنجابی مباحثہ "اَج کل دیاں کُڑیاں مُنڈیاں نوں لے ڈُبیاں" (آج کل کی لڑکیاں لڑکوں کو لے ڈوبی ہیں) انعقاد پذیر ہوا۔ اس کی صدارت یونین کے صدر پرویز ملک نے کی اور سیکرٹری کے فرائض شاہد نے سرانجام دیے اس دلچسپ مباحثہ کا آغاز قائدِ ایوان شکیل پرویز کے اظہارِ خیال سے ہوا۔ انہوں نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا کہ لڑکیوں کی ہی صنف تھی جس نے حضرت آدم کو جنت سے نکلوایا۔ حضرت یوسف پر الزام لگوایا۔ ہابیل اور قابیل کے درمیان لڑائی کرائی اور اب جنرل رانی بن پاکستان کا ایک حصہ علیحدہ کرانے میں بھی لڑکیوں کا ہاتھ ہے۔ اب تو خدا کے لیے رحم کرو۔ کچھ کام پاکستان کی ترقی کے لیے کرو۔ اس موقع پر لڑکیوں نے "جھوٹ! جھوٹ!" کے نعرے لگائے۔

ان کے بعد قرارداد کی مخالفت میں بولنے والوں کے سربراہ اختر شیرازی آئے اور کہا کہ عورت پاکیزگی اور تعظیم کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ جھوٹے الزام لگا کر اُسے بدنام نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے کہا عورت نہ ہوتی تو دُنیا نہ ہوتی۔ تنویر نے موضوع کی حمایت میں بولتے ہوئے کہا "ہیر، سوہنی اور لیلےٰ کی قوم اب تو خدا کے لیے اسلام کا نام بلند کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ حزبِ مخالف کے نجم الحسن نے کہا کہ یہ عورت ہی تھی جو کہ لیلےٰ خالد کے روپ میں تحریک آزادی کی امین بنی۔ سلیم اکبر نے حمایت کرتے ہوئے کہا کہ

لڑکیاں صرف لڑکوں کو ہی نہیں پاکستان کو لے ڈوبی ہیں - ان لڑکیوں نے جنرل رانی اور بلیک بیوٹی کا روپ دھار کے بڑے بڑے جرنیلوں کو تباہ کیا اور قوم کو ذلیل و رسوا کیا -

حزب مخالف کے رشید احمد نے قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ آج کل کے لڑکے ہوس کے پجاری ہیں اور لڑکیوں کو غلط راہ دکھا رہے ہیں - گرلز کالج کی فرزانہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ واقعی شہناز گل اور شیریں نادر جیسی لڑکیوں نے ہمارے ملک کے نوجوانوں کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے -

اس موقعہ پر لڑکیوں نے فرزانہ کے خلاف زبردست شور مچایا اور اُسے بولنے نہیں دیا۔ مس رفیعہ نے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ آج لڑکوں میں نہ محمد بن قاسم جیسی غیرت ہے، نہ طارق بن زیاد جیسی بہادری - آج کل کے لڑکے ماں بہنوں کو بُرا بھلا کہنا اپنا شعار سمجھتے ہیں - یہ لڑکے ہی ہیں جو لڑکیوں کو ورغلاتے ہیں، گمراہ کرتے ہیں، آج کل کے لڑکے لڑکیوں کو لے ڈوبے ہیں -

اس دل چسپ مباحثہ کے بعد مہمانِ خصوصی جناب وائس چانسلر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور انعامات تقسیم فرمائے - آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنے ملک کے نوجوانوں سے بڑی توقعات ہیں - ان کی تقریریں سُن کر اُن کی صلاحیتوں کو سراہتا ہوں - آج کے مباحثے میں لڑکوں اور لڑکیوں نے بڑی عمدہ تقریریں کی ہیں -

قرارداد کی حمایت اور مخالفت میں ووٹ لیے گئے تو لڑکے جیت گئے کیونکہ اس موقع پر بہت سی لڑکیاں چلی گئی تھیں -

پہلا انعام شکیل پرویز، دوسرا انعام مس رفیعہ اور حوصلہ افزائی کا انعام سلیم اکبر کو ملا - منصفین کے فرائض ابن انشاء، مرزا ادیب اور ناصر زیدی نے سرانجام دیے -

روداد بین الکلیاتی مقابلہ حسن قرأت کی

ہمارے زنانہ کالجوں میں تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں کے علاوہ مذہبی سرگرمیوں پر بھی خاص توجہ دی جارہی ہے۔ ان میں اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ قابلِ ذکر ہے یہ وہ کالج ہے جس نے آٹھ نو برس قبل حسنِ قرأت کے مقابلے منعقد کرنے کی ابتدا کی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اس سال بھی حسب سابق اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ کا ہال طالبات سے بھرا ہوا تھا۔ جمعہ کا دن تھا اور لڑکیاں رنگین ملبوسات پہنے تھیں کیونکہ اس دن کالج میں یونیفارم کے بغیر آنے کی اجازت ہوتی ہے۔ خوب صورت مہکتے پھولوں کے گلشنوں سے سٹیج معطر ہو رہا تھا۔ حسنِ قرأت کے مقابلہ میں حصہ لینے والی طالبات سٹیج پر نیم دائرہ کی صورت میں بچھی کرسیوں پر بیٹھی تھیں کئی ایک کے ہاتھوں میں قرآن پاک کے سیپارے تھے اور وہ سروں کو آنچلوں سے سے ڈھاپنے مختلف آیات پڑھ رہی تھیں۔ تقریب کی مناسبت سے سٹیج پر ولیا ہی پُر تقدس ماحول پیدا کیا گیا تھا۔ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج کی سابق پرنسپل مسز ملک کی آمد پر تقریب کی کارروائی شروع کی گئی تقریب کا وقت ساڑھے نو بجے تھا لیکن آغاز ساڑھے دس بجے ہوا۔

کالج کی پرنسپل مسز کاکاخیل نے مہمانِ خصوصی سے تعارف کرایا۔ ان کے بعد بلقیس طاہرہ ایک طالبہ نے بزم علوم اسلامیہ کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ قرآت ایک خاص اور مقدس فن ہے۔ اور اسے کلام الٰہی اور دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا مؤثر ذریعہ بنایا جاسکتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے لیے قرآت کا ہر لفظ درس اور احکامِ الٰہی کا اثر رکھتا ہے۔ اور اگر یہ مُقدس کلام خوش الحانی سے پڑھا جائے تو اس سے غیروں کے دل بھی متاثر ہوتے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ ہر سال کالج کی طالبات اپنے کالج میں حسنِ قرآت کے مقابلہ میں حصہ لینے کے علاوہ بیرونی کالجوں میں بھی قرآت کے مقابلوں میں شرکت کرتی ہیں اور کئی بار انعامات و ٹرافیاں بھی جیت کر لاتی ہیں۔ پروفیسر شبیر احمد قاری، قاری محمد طیب اور قاری غلام رسول نے منصفین کے فرائض سرانجام دیئے۔

مقابلہ میں شرکت کرنے والی طالبات کو شرائط سے آگاہ کیا گیا کہ کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین آیات سنانے کی اجازت ہے۔ قرآن پاک سے دیکھ کر بھی تلاوت کر سکتی ہیں۔ مقابلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے اسی کالج سے فرخندہ اور لالہ رُخ نے تلاوت کی اور ان کے بعد کوئین میری کالج سے طاہرہ کلثوم اور نجمہ شاہین، گورنمنٹ کالج برائے خواتین سیالکوٹ سے نجمہ چوہان اور نسیم گلشن، لاہور کالج برائے خواتین سے مریم حمید اور روبی شاہین، اسلامیہ کالج برائے خواتین قصور سے فاطمہ زہرہ اور عظمت، شعبہ علومِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی سے اقبال بیگم اور اُمِ کلثوم، لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور سے ریحانہ شاہین اور رضوانہ شاہین، گورنمنٹ کالج لاہور سے زاہدہ نسرین اور لاہور کے چند ایک اور کالجوں کی طالبات نے حصہ لیا۔

سب اپنی اپنی باری پر خوش الحانی سے آیاتِ قرانی کی تلاوت کرتی رہیں۔ مسز ملک اور منصفین صاحبان نے بھی قرآت سے تلاوت کی۔ سارا وقت ماحول پر تقدس برستا رہا۔ دلوں پر کلام الٰہی سے ایک عجیب روحانی سی کیفیت طاری تھی۔ سامعین اس طرح بُت بنی سُن رہی تھیں جیسے آیاتِ مقدسہ نے ان پر کوئی افسوں پھُونک دیا تھا، در و بام پر ایک نور کی چادر تنی تھی۔

نزہت زہرہ نے علم تجوید پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قرآت ٹھہر ٹھہر کر کرنی چاہیئے تاکہ قرآن پاک کے کسی حرف کی زیر زبر میں فرق نہ پیدا ہو سکے۔ کیونکہ ذرا سے فرق سے معنی و مفہوم بدل جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے ہاں آجکل اپنی اپنی علاقائی زبانوں کو مقبولِ عام کرنے کے چرچے ہیں لیکن دینی اور مقدس زبان یعنی عربی کی طرف زیادہ

توجہ نہیں دی جاتی۔ مسلمانوں کو لسانی تعصبات چھوڑ کر اپنی مذہبی زبان کو فروغ دینا چاہیے۔ آخر میں انعامات تقسیم کیے گیے۔ سیالکوٹ کی رخسانہ شاہین کو اوّل اور ریحانہ شاہین کو دوم انعام ملا۔ حوصلہ افزائی کا انعام ہوم اکنامکس کی طالبہ کو ملا۔ ٹرانی سیالکوٹ نے جیتی۔ (روزنامہ امروز لاہور)

حال ایک ادبی نشست کا

بزمِ ادب گورنمنٹ کالج جھنگ کے زیرِ اہتمام ملک کے نامور شاعر سید جعفر طاہر کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ سید جعفر طاہر اس کالج کے سابق طالب علم ہیں۔ حال ہی میں انہیں قومی عوامی گیت لکھنے پر پہلا انعام ملا ہے۔ اس سے پہلے "ہفت کشور" پر آدم جی انعام بھی مل چکا ہے۔

اس پر وقار تقریب میں مقامی شاعروں، ادیبوں اور اہلِ قلم نے شرکت کی۔ بزم ادب کے صدر علی اظہر نے صدارت کی اور معتمد کے فرائض ممتاز رضا سیال نے سرانجام دیئے۔

پروفیسر محمد حیات خاں سیال نے تعارفی جملے کہے اور پھر ڈاکٹر وزیر آغا کے تاثرات پڑھ کر سنائے۔ اس کے بعد پروفیسر سیال کا لکھا ہوا فیچر "شاعر جادو بیاں"، ممتاز رضا سیال اور نصرت علی نے پیش کیا۔ اس فیچر میں سید جعفر طاہر کی زندگی اور کلام کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ آپ ۱۹۱۷ء میں جھنگ میں پیدا ہوئے۔ بی اے کرنے کے بعد آرمی ایجوکیشنل سکول چلے گئے۔ فوج میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلی غزل ۱۹۴۷ء میں لکھی جو ادبی دنیا میں شائع ہوئی۔ غزل، نظم، کینٹوز کے علاوہ منظوم ڈرامے بھی لکھے جو ریڈیو سے نشر ہوتے رہے ہیں۔

وادیٔ چناب کے قلندر شاعر جناب شیر افضل جعفری نے سید جعفر طاہر کی زندگی اور شخصیت پر اپنے مخصوص انداز میں دلچسپ مضمون پڑھا۔ انہوں نے کہا کہ جعفر طاہر اناپرور

شاعر ہے جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور اسی لیے اس کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔

پروفیسر جی ایم ملک نے جعفر طاہر کی رزمیہ شاعری کے عنوان سے ایک پُر مغز مقالہ پیش کیا۔ آپ نے بتایا کہ جعفر طاہر کی شاعری موضوع اور بیان کے اعتبار سے رزمیہ شاعری ہے جس میں قومی معتقدات، رسومات، اوالعزم سورماؤں کے تاریخی اور جنگی کارناموں اور حب الوطنی کی لازوال مثالیں ملتی ہیں۔ "ہفت کشور" میں سات اسلامی ممالک کی تاریخ کی درخشندہ و تابندہ روایات کو شاعری کا موضوع بنایا گیا ہے۔ پڑھنے والوں میں جذبہ تفاخر پیدا کرنے کے لیے شاعر نے واقعات کے تار و پود کو نہایت خوبصورتی سے ایک حسین و رنگین اور ولولہ انگیز داستان کی شکل دی ہے۔

جعفر طاہر الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ دریائے نیل کی شام ہو، عراق کے ریگزار کا منظر ہو، چناب کے پانیوں کا ذکر ہو، جعفر طاہر الفاظ میں قدرت کے ان مناظر اور انسانی جذبات کی مکمل تصویر پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ انھوں نے ایک ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھا ہے۔

آخر میں سید جعفر طاہر نے اپنے فن پر روشنی ڈالی۔ "ہفت کشور" کے متعلق کچھ باتیں بتائیں اور غیر مطلوبہ مجموعہ "ہفت آسماں" کے کینٹوز کے کچھ حصے سنائے۔ سامعین بیحد محفوظ ہوئے۔ آپ نے پرنسپل اور دیگر احباب کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے ایسی پروقار تقریب کا اہتمام کیا۔ (اخبارِ جہاں کراچی)

روداد ایک تقریب کی

(شامِ ہمدرد)

ستمبر کا پہلا ہفتہ پاکستان کے عوام کو ایک ایسے امتحاں کی یاد دلاتا ہے جس میں انہیں فتح حاصل ہوئی، پاکستان اور مستحکم ہو گیا اور ہر پاکستانی کو تجربہ ہو گیا کہ قومی دفاع کیسے

کیا جاسکتا ہے اور جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر اسلام کے نام پر جان دینا کس قدر عظمت کا حامل ہے۔ اہل لاہور نے جس جرأت، بہادری اور ایثار کا مظاہرہ ان ایام میں کیا تھا۔ اس کی مثال بھی مشکل سے ملے گی۔ زندہ دلانِ لاہور نے دشمن کی توپوں کا مقابلہ اپنی زندہ دلی اور جرأت سے کر کے یہ ثابت کر دیا کہ لاہور واقعی پاکستان کا دل ہے۔ اس کے دھڑکنے کے ساتھ ساتھ اہلِ لاہور بے تاب ہو جاتے ہیں اور یہی بے تابی شجاعت و مردانگی کا روپ دھار لیتی ہے۔

اب کے شام ہمدرد یکم ستمبر کو منائی گئی اور مہمان خصوصی جناب جنرل بختیار رانا تھے۔ حاضرین کی تعداد بھی معمول سے زیادہ تھی۔ حسبِ دستور اس تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا۔ اس کے بعد میزبان جناب حافظ حکیم محمد سعید دہلوی نے معزز مہمان کا رسمی تعارف کرانے کے بعد فرمایا کہ ۶ ستمبر کا دن ہماری قومی حمیّت کا دن ہے اور حکومت نے اُسے یوم "دفاع پاکستان" کا نام دیا ہے۔ یہ نام یقیناً ایسا ہے کہ اسے یوم جہاد قرار دینا چاہیے۔ کیونکہ اس روز ہم نے بھارت کے اچانک حملے کا جواب اسلحہ سے نہیں دیا بلکہ ہماری فوج اور عوام کے جذبۂ جہاد اور تائید ایزدی کے نتیجے میں دشمن کو شکست فاش ہوئی۔

جنرل بختیار رانا ایک سپاہی ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ کوئی لچھے دار تقریر نہ کر سکیں گے۔ بلکہ اردو کی صحیح شکل میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ (اردو کے معنی لشکر کے ہیں) لیکن آپ کی تقریر نہایت سادہ اور مؤثر زبان میں تھی اور ایک ایک لفظ دل نشین ہوتا گیا۔ پھر موضوع بھی ایسا تھا جس پر جنرل صاحب ہی گفتگو فرما سکتے تھے کیونکہ بھارت کے خلاف پاکستان نے جو فاتحانہ جنگ لڑی ہے آپ ہی اس کے کمانڈر تھے۔

ایک نقشہ کی مدد سے آپ نے لاہور اور سیالکوٹ کے محاذ پر دشمن کے حملے اور پاکستانی افواج کے دفاعی کارناموں سے حاضرین کو باخبر کیا۔ آپ نے بتایا کہ حکومت

پاکستان بھارت کے تمام جارحانہ عزائم سے باخبر تھی۔ بھارتی فوج کی نقل وحرکت کا پورا پورا علم تھا۔ اس لیے ہم مقابلہ پر پوری طرح ڈٹے ہوئے تھے اور ہمارا دفاعی حصار مضبوط تھا۔ جنرل صاحب نے جب یہ فرمایا کہ گذشتہ سال کی جنگ کے بعد بھارت نے دور مار توپیں بھی خریدی تھیں جن سے لاہور پر گولے برسائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان تمام عسکری تیاریوں کے باوجود بھارت کبھی پاکستان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ پاکستانی فوج کے جوان اور شہری بہادر، نڈر اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں اور ان کا جذبۂ ایمانی مضبوط ہے وہ آڑے وقت میں اپنے دشمن کو دندان شکن جواب دے سکتے ہیں"۔ جنرل صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں فوج کے ان جیالوں کی باتیں بھی سنائیں جنہوں نے اپنی بہادری، شجاعت، جرأت اور ایمان کی ایسی مثالیں پیش کیں، جن پر آئندہ نسلیں فخر کریں گی اور تاریخ کے سنہری ابواب میں یہ مثالیں درخشاں ہوں گی۔ آپ نے شہریوں، سول حکام اور ریلوے کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔

یہ باتیں بڑی حوصلہ افزا تھیں اور پھر لاہور کے دانشوروں کو یہ بھی یقین علم ہوگیا کہ ہماری فوج نے کس جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ نے فضائیہ کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا۔ اور ان کے کارناموں کی داستان سنا کر حاضرین کے جوش میں اضافہ کیا۔ عوام نے اپنی افواج کو جس طرح خوراک پہنچائی اور عین میدانِ جنگ میں پہنچائی۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے فوج کے حوصلے بڑھا دیے۔

یہ داستان کافی طویل ہوگئی لیکن یہی دل چاہتا تھا کہ یہ کبھی ختم نہ ہو۔ ان واقعات نے حاضرین میں وہ جذبہ پھر سے بیدار کر دیا تھا جس نے بھارت کی نئے سامان جنگ سے لیس کثیر تعداد فوج کو شکست دی تھی۔ پاکستانی فوجیوں کی بہادری کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنے خدا پر کس قدر ایمان تھا اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سپاہی نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے جنہیں سن کر دنیا حیران ہے۔

آخر میں جناب جسٹس ایس اے رحمٰن جج سپریم کورٹ نے معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جنرل صاحب نے نہایت دل نشیں اور اعلےٰ فوجی انداز میں جنگ کی داستان سنائی اور بعض اسرار کی نقاب کشائی کی۔ دشمن کے عزائم بھی اچھے نہیں ہیں اور پاکستان کے لیے بدستور خطرہ موجود ہے۔ ان حالات میں ہمیں چوکنا رہنا چاہئیے۔ ہماری فوج نے جذبۂ جہاد اور ذوقِ شہادت کا جو فقید المثال مظاہرہ گذشتہ جنگ میں کیا ہے اس سے یقین ہے کہ آئندہ بھی فوج اور عوام اسی جذبے سے ملک کا دفاع کریں گے۔ جب یہ تقریب ختم ہوئی تو رات نے شام کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا، روشنیوں نے لان کی رونق کو اور بڑھا دیا۔ اب اگرچہ سارے مہمان چائے کی میزوں پر تھے مگر گفتگو کا موضوع جنگ ہی تھا۔ (ماخوذ از قندیل۔ دیکھتا چلا گیا)

ایک جلسہ تقسیم اسناد کی روداد

گذشتہ دنوں گورنمنٹ ڈگری کالج جہلم کا نواں سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کالج کے قطعۂ چمن میں منعقد ہوا۔ گورنمنٹ کالج کیمبلپور کے پرنسپل، پروفیسر محمد اسمٰعیل مہمانِ خصوصی تھے۔ پروفیسر محمد اسمٰعیل نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ بنی نوع انسان کی فلاح خدا اور رسول کے احکام کی پیروی میں مضمر ہے۔ آپ نے کہا کہ سائنسی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تحصیل بنیادی طور پر ضروری ہے۔ آپ نے اساتذہ اور نوجوان طالب علموں سے بالخصوص خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان سب میں اسلامی روح کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے کہا کہ اساتذہ کے لیے بالخصوص پاکستان اور سیرت نبی کریمؐ کا مطالعہ ازحد ضروری ہے تاکہ وہ کالجوں سے بہتر مسلمان طلبار کو فارغ التحصیل کر سکیں۔ آپ نے کہا کہ ملک میں غیر اسلامی لٹریچر کی اشاعت کو بالکل ممنوع قرار دینا چاہیے۔ تاکہ نئی نسل صحیح معنوں میں اسلامی جذبہ سے سرشار ہو اور معاشرے کی جملہ خرابیاں اور اس کی ناہمواری ختم ہو جائے۔

قبل ازیں کالج کے پرنسپل شیخ محمد ضیاء اللہ نے اپنی سالانہ رپورٹ میں کالج کی جملہ ادبی انجمنوں کی کارکردگی کو سراہا اور کالج کے مسائل کا ذکر کیا۔ آپ نے کہا کہ عرصہ دراز سے اس کالج کی ادھوری عمارت سے ہی کام لیا جا رہا ہے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اس عمارت کا باقی حصہ بھی جلد از جلد تعمیر کرا دے تاکہ طلبہ اور اساتذہ کی مشکلات میں کمی ہو۔ آپ نے طلبہ و طالبات سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے اندر بصیرت اور غور و فکر کا مادہ پیدا کریں، اور دیانت داری کے ساتھ معاشی اور معاشرتی ناانصافی کے خاتمہ کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ آپ نے کہا اپنے کالج کے طلبہ و طالبات کے تعمیر پسند اور باشعور ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا، مجھے اس امر پر فخر حاصل ہے کہ اس مادر علمی کی آغوش میں پرورش پانے والوں نے آج تک کوئی جلوس نہیں نکالا۔

اس جلسہ تقسیم اسناد میں اکیاسی طلبہ و طالبات کو بی اے اور بی ایس کی ڈگریاں عطا کی گئیں۔ آنسہ اقبال پروین نے بی۔اے میں اور محمد ادریس نے بی ایس۔سی میں کالج میں اول آنے پر طلائی تمغہ جات حاصل کیے۔ آنسہ اقبال پروین نے فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے پر کالج کا سب بڑا اعزاز "رول آف آنر" بھی حاصل کیا۔

سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات کی روداد

جونہی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات کا نوٹس لگا، طلبہ میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ مختلف گروپوں نے اپنے اپنے امیدواروں کے حق میں ووٹ حاصل کرنے کی مہم شروع کر دی۔ وہ طلبہ جو کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اب گھروں پر جا کر اپنے بھائی چارہ اور دوستی کا اظہار کرنے لگے۔ کالج میں اور کالج کے باہر انتخابات ہی موضوع سخن تھے۔ صدارت کے لیے صفدر ملک اور ناصر سلطان امیدوار تھے۔ معتمد کے لیے تین امیدوار تھے۔ اسی طرح نائب صدر بننے کے لیے چار اور نائب معتمد کے

عہدہ کے لیے تین درخواستیں تھیں۔

انتخابات کے لیے پندرہ تاریخ مقرر کردی گئی۔ طلبہ کے لئے یہ انتخابات کالج کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ طلبہ صبح سویرے کالج میں پہنچ گئے اور اپنے اپنے کیمپ لگا لیے۔ ہر طرف دیواروں پر، درختوں پر، بجلی کے کھمبوں پر پوسٹر لگے ہوئے تھے۔

آپ کے قیمتی ووٹ کا حق دار ......۔

کالج کا بے باک مقرر اور حق کی خاطر جان دینے والا ......۔

طلبہ کا صحیح نمائندہ ......۔

ووٹ دیتے وقت ...... کو یاد رکھیے۔ وغیرہ۔

امیدواروں نے تقاریر شروع کیں اور اپنے منشور سے طلبہ کو آگاہ کیا۔ ان تقریروں کے لیے ہر قسم کے تکلفات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ مثلاً کوئی دیواروں پر کھڑا گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنا لائحہ عمل بتا رہا ہے۔ کوئی کسی کمرے کی چھت پر چیخ چیخ کر طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ امیدواروں کے حامی اپنے امیدوار کے لیے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کر رہے تھے۔ قمیض پر، بشرٹ پر، کوٹ پر چھوٹے چھوٹے پوسٹر لگا رکھے تھے اور بعض نے تو مسخروں کا روپ دھار رکھا تھا۔ ایک طرف لاؤڈ سپیکر پر اعلانات ہو رہے تھے۔ بہر حال خوب ہنگامہ برپا تھا۔ ایک دو موقعوں پر تو طلبہ کے گروپوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا۔ اگر پروفیسر صاحبان وقت پر نہ پہنچتے تو لڑائی کا سخت خطرہ تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ بعض طلبہ کے پاس آتشیں اسلحہ بھی ہے۔

انتخابات کا وقت نو بجے تھا۔ چنانچہ گھنٹی بجی اور تمام طلبہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ٹیوٹر صاحبان نے حاضری لگائی اور ووٹ کی پرچی پر نشان لگانے کا طریقہ سمجھایا۔ ہر طالب علم خفیہ طور پر نشان لگاتا اور پرچی بکس میں ڈال دیتا۔ امیدواروں کے نمائندے ہر کمرے میں موجود تھے۔ ان کے روبرو پرچیوں کی گنتی ہوئی اور وائس پرنسپل

کے پاس پہنچا دیا گیا۔ امیدواروں کو بھی یہاں بُلا لیا گیا اور ووٹوں کا شمار ہونے لگا۔ پرنسپل صاحب نے نتائج کا اعلان کیا۔ صفدر ملک صاحب بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ انہوں نے ۱۲۵۰ میں سے ۸۱۲ ووٹ حاصل کئے۔ معتمد کے عہدے کے لیے طاہر رضا منتخب ہوئے۔ انور جعفری نائب صدر اور شکیل احمد نائب معتمد چُنے گئے۔ کامیاب امیدواروں کو ہار پہنائے گئے۔ ان کے ساتھیوں نے خوب نعرے لگائے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیا۔ کچھ ہائے جمالو کہتے ہوئے بھنگڑا ناچ ناچنے لگے۔ ہارے ہوئے امیدوار چپکے سے کھسک گئے۔ پھر عجیب و غریب نعرے سنائی دینے لگے۔ فلاں زندہ باد! فلاں کی ٹھاہ! اور پھر یہ جلوس کالج سے شہر کی طرف چل پڑا۔

رسم حلفِ وفاداری کی رپورٹ

گذشتہ دنوں شاہ لطیف گورنمنٹ گرلز کالج لطیف آباد حیدر آباد میں جشن حلف وفاداری کی تقریب منعقد کی گئی جس کی مہمان خصوصی محترمہ شمس عباسی صاحبہ ڈپٹی ڈائریکٹس آف ایجوکیشن آف حیدر آباد ریجن تھیں۔ جس وقت مہمان خصوصی تشریف لائیں ان کا استقبال انجمن اتحاد طالبات نے "ہمارا رہبر نشانِ حیدر" کے میوزک پر پریڈ کر کے اور ہار پہنا کر کیا۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض آنسہ شگفتہ پروین نے انجام دیے

تقریب کا آغاز خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا سے ہوا۔ آنسہ شکیلہ اقبال بی۔ اے سال دوئم نے تلاوتِ قرآن پاک کی۔ آنسہ شاہانہ آفریدی نے ان آیات کا ترجمہ پیش کیا۔ آنسہ فہمیدہ پروین نے آنحضرت صلعم کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ بعد ازاں کالج کی پرنسپل مسز ثریا صابر نے معزز مہمان خصوصی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اور ان کو کالج کا امتیازی نشان دیا۔ اس کے بعد انجمن اتحاد طالبات کی حلف وفاداری کی تقریب ہوئی۔ پرنسپل صاحبہ نے انجمن کی تمام نومنتخب عہدیداران سے حلف لیا۔ جس

میں تمام ممبران نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کیا کہ وہ اپنے پیارے پاکستان، کالج، پرنسپل اور طالبات کی وفادار رہیں گی۔ کالج کی طالبہ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شہری ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پوری کوشش کریں گی۔ انجمن کی تمام ممبران کے چہروں سے پختہ عزم کا اظہار ہو رہا تھا کہ انہوں نے یہ عہد نہ صرف زبانی بلکہ عملی طور پر بھی کیا ہے اور اپنے عمل کے ذریعے وہ طالبات کے حقوق کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہیں گی۔ بعد ازاں معزز مہمان خصوصی نے انجمن کی عہدیداران کو کالج کا امتیازی نشان دیا۔

آنسہ نسرین زیدی نے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے سالِ گذشتہ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور آنسہ شمیم بشیر نے سال رواں کی جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اپنا آئندہ لائحہ عمل پیش کیا۔ معزز مہمان خصوصی سے درخواست کی گئی کہ وہ ڈائس پر تشریف لا کر طالبات کو اپنی تعلیمات سے نوازیں۔ مہمان خصوصی محترمہ شمس عباسی صاحبہ نے طالبات اور خاص طور پر انجمن کی عہدیداران سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج جو ذمہ داری ان کے کندھوں پر آگئی ہے اس کو وہ پورے خلوص اور تندہی سے انجام دیں۔ طالبات کو درپیش مسائل کو حل کریں اور ان کی مشکلات کو اعلیٰ احکام تک پہنچائیں جو غریب طالبات فیس ادا نہیں کر سکتیں ان کی مدد کریں۔ پرنسپل صاحبہ نے اپنی تقریر میں جن مشکلات کا ذکر کیا تھا ان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ وہ ان پر ہمدردی سے غور کریں گی اور انکی جائز ضروریات کو پورا کر دیا جائیگا۔

طالبات کی سادگی، نظم و ضبط اور سجت بن کار کردگی کو معزز مہمان نے بھی سراہا اور ان کو سادگی اپنانے کی تلقین کی اور کہا کیونکہ آج کی طالبہ کل کی "ماں" ہے جس کی گود میں ایک نئی نسل کو پروان چڑھنا ہے۔ وہ نسل جس کو ہمارے ملک کی تاریخ کی نئی بنیاد ڈالنی ہے۔ تاکہ ہم ماضی کی غلطیوں کو فراموش کر کے مستقبل کے روشن پہلوؤں پر نظر رکھیں۔ اس لیے طالبات کو اپنے کردار میں پختگی پیدا کرنی چاہیئے۔ جلسے کے دوران مہمان خواتین کی ٹھنڈے مشروبات سے تواضع کی گئی۔ رسم حلف وفاداری کے بعد طالبات نے مختصر رنگا رنگ پروگرام

پیش کیا۔ چند طالبات مختلف علاقائی لباس میں ملبوس اسٹیج پر آئیں اور مشہور قومی و عوامی نغمہ "سوہنی دھرتی اللہ رکھے" کورس کے انداز میں پیش کیا۔

آخر میں سب طالبات نے مل کر قومی ترانہ پڑھا اور اس کے ساتھ ہی یہ سادہ اور پُر وقار تقریب اختتام کو پہنچی۔ تقریب کے خاتمہ پر مہمان خصوصی اور دوسری مہمان خواتین کو ایک پُر تکلف پارٹی دی گئی۔ (اخبار جہاں۔ کراچی)

کارٹونوں کی ایک نمائش کی روداد

آرٹس کونسل نے نوخیز فنکاروں کے فن کی نمائش کا ایک سلسلہ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے۔ جمشید انصاری کی نمائش اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے یہ تو خیر صرف کارٹونوں کی نمائش ہے۔ ویسے جمشید انصاری خالی کارٹونسٹ نہیں، یہ حضرت بہت کچھ ہیں موسیقار، اداکار، شاعر خطاط، صحافی بس یوں سمجھئے کہ کراچی کے انور سجاد ہیں۔ کچھ بھروسہ نہیں کہ کس وقت کیا کرنے لگیں۔ ان دنوں طبیعت کارٹونوں پر آئی ہوئی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں انہوں نے غالب کی شاعری سے کارٹون بر آمد کیے تھے۔ اس مرتبہ اقبال کی شاعری سے کارٹون کشید کیے ہیں۔ داستان اس کی یہ ہے کہ اس برس ۲۳ مارچ کو ایک ترنگ آئی کہ بازار جا کر "بال جبریل" خریدی، مہینے کے ختم ہوتے ہوتے ۲۰ کارٹون بنا لیے۔

نعیم طاہر صاحب کو جمشید انصاری کی ہمی برق رفتاری میں کچھ صادقین کی جھلک نظر آئی۔ پھر انہوں نے ان کے ہنر میں بھی صادقین کے اثرات دریافت کر لیے۔

وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی نے اس نمائش کا افتتاح کیا۔ انہوں نے بھی اس نوخیز ہنر مند کو بہت شاباش دی۔ اور شاباش کی بات تو ہے۔ غالب کی غزلوں میں جابجا طنز اور مزاح کا رنگ ملتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر پیروڈی لکھنے والوں نے پیروڈیز لکھیں، کارٹون بنانے والوں نے کارٹون بنا لیے اور ویسے بھی غالب سے یار لوگ ہمیشہ بے تکلف رہے ہیں۔ مگر علامہ اقبال کی شاعری اور بالخصوص بال جبریل والی شاعری اتنی سنجیدہ

رنگ لیے ہوئے ہے کہ اس سے کارٹون اور پیروڈی کی گنجائش نکالنا خاصا مشکل معاملہ ہے اور پھر علامہ اقبال سے ان کے قارئین اور مدّاح کبھی اس طرح بے تکلف نہیں ہوئے۔ جس طرح غالب سے بے تکلف چلے آتے ہیں۔ یہاں جائے ادب ہے۔ جمشید انصاری نے ادب کا دامن تو خیر ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے مگر علامہ اقبال سے انہوں نے کسی قدر بے تکلف ہونے کی کوشش ضرور کی ہے۔ انہوں نے بال جبریل کے مختلف اشعار کو اس طرح سے استعمال کیا ہے کہ اس قوم کے رویّوں پر جو علامہ اقبال کی مخاطب تھی طنز وتحریض ہوتی نظر آتی ہے۔ مولانا کوثر نیازی نے اپنی اختتامی تقریر میں کچھ مصوّر کو داد دی کچھ پاکستان کی ثقافت پر عمومی باتیں کیں۔ (انتظار حسین - لاہور نامہ)

لائل پور میں کتابوں کی نمائش کی روداد

عالمی سال کتاب ۱۹۷۲ء کی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہیں اور اس سلسلہ میں نیشنل بک سنٹر آف پاکستان لاہور مختلف مقامات پر نمائشوں کا اہتمام کر رہا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی نمائش ۱۳ر جنوری کو کارپوریشن ہال لائلپور میں ہوئی۔ جس کا افتتاح زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اسرار الحق نے کیا۔

ڈاکٹر اسرار الحق نے نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ یقیناً خوشی کا مقام ہے کہ علم وادب کی ترویج وترقی کے لیے ملک بھر میں منظم کوشش ہو رہی ہے۔ موجودہ حکومت بھی اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کے زیر اہتمام کتابوں کی ایک خوبصورت نمائش ہو رہی ہے۔ ایک مضبوط اور ترقی یافتہ قوم کے لیے اور ملک کی تعمیر وترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب علم وادب کے فروغ وترویج میں گہری دلچسپی لیں۔

نمائش کے افتتاح سے قبل نیشنل بک سنٹر آف پاکستان لاہور کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ذوالفقار احمد تابش نے پاکستان میں ملک گیر کتابی سرگرمیوں کا مفصل ذکر کیا اور بتایا کہ ہم پاکستان کے ہر شہر میں اور ہر قصبے میں کتابوں کی نمائش کرا رہے ہیں۔ علاوہ اس کے پاکستان کے متعدد دوسرے شہروں میں چلتی پھرتی نمائش ریلوے بوگیوں پر بھی کی جائے گی۔ نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کی ان کتابی نمائشوں کا مقصد لوگوں میں کتابوں کو متعارف کرانا، لوگوں میں ذوقِ مطالعہ پیدا کرنا اور قارئین کے تعاون سے ارزاں، بہتر اور مناسب کتابیں فراہم کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستانی ناشرین کی کتابوں کو قریہ قریہ اور شہر شہر روشناس کرانا بھی ضروری ہے۔ تاکہ قارئین یہ جان سکیں کہ پاکستان کے ناشرین کس پائے اور معیار کی کتابیں چھاپ رہے ہیں اور ملک کی کتابی صنعت کس حد تک ترقی کر چکی ہے۔

لائل پور کی اس نمائش میں پاکستان کے کم و بیش تمام ناشرین کی کتابوں کو شامل کیا گیا ہے۔ لائلپور کی اس کتابی نمائش میں صرف ڈیڑھ ہزار کتابیں رکھی گئی تھیں۔ ناظرین کی ایک بڑی تعداد نے اس نمائش کو دیکھا۔ نمائش کو ناظرین کی خواہش کے مطابق خلافِ پروگرام ایک دن مزید بڑھانا پڑا۔

اس نمائش میں رکھی گئی یوں تو تمام کتابیں ہی قابل دید اور جاذب نظر تھیں لیکن غلام علی اینڈ سنز اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی اسلامی کتابیں ناظرین کی بھرپور توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ مرکزی اردو بورڈ اور شیخ محمد اشرف کی خوب صورت کتابیں اپنی اپنی جگہ پر نمایاں شان دکھاتی ہیں۔ ادارہ بساطِ ادب، آئینہ ادب اور میری لائبریری کی رنگا رنگ سینکڑوں چھوٹی بڑی بیسیوں مختلف موضوعات پر کتابیں نمائش بینوں کی دلچسپی اور توجہ کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ ملک محمد دین، ملک سراج دین اور شیخ غلام حسین کی اسلامی کتابیں جو پاکستان کے گوشے گوشے میں پہلے ہی سے متعارف ہیں، انہیں بھی ناظرین نمائش نے ذوق شوق کے ساتھ دیکھا، مکتبہ جدید

کارواں بک ہاؤس، گوشۂ ادب، مقبول اکیڈمی، المعارف، المکتبہ العلمیہ، سندھ ساگر اور سنگِ میل پبلی کیشنز کی گوناگوں رنگوں بھری، علوم و فنون کا احاطہ کرتی ہوئی عمدہ اور بہتر تیاری کی حامل کتابیں اپنا رنگ خوب دکھاتی رہیں۔ فیروز سنز لمیٹڈ کی پیش کش کے اعتبار سے بلند پایہ، موضوعات کے لحاظ سے وقیع اور اعلےٰ طباعت کی شاہکار کتابیں ناظرین کی نظروں کو جھلملاتی دکھائی دیتی تھیں۔ اسلامک پبلی کیشنز، علمی کتب خانہ اور قومی کتب خانہ لاہور کی دینی، علمی، ادبی اور نصابی و تاریخی کتابیں علم و ادب کے دھارے بھی بہا رہی تھیں اور نمائش کی افادیت میں اضافہ بھی کئے ہوئے تھیں۔ ان کے علاوہ بے شمار ناشروں کی تاریخ اسلام، سیرت و سوانح، تفاسیر، فقہ، فلسفہ، نفسیات، سائنس، ادب، تحقیق و تنقید اور شعر و افسانہ کی سینکڑوں کتابیں سرزمینِ لائل پور میں جگمگا رہی تھیں۔

ایک طرف تو یہ خوب صورت، دل کش اور دیدہ زیب و خوش رنگ کتابوں کا جھرمٹ تھا اس پر مستزاد کہ کارونیشن ہال کی دیواروں پر روشنیوں، جھنڈیوں اور قمقموں کے جلو میں کتابوں کے خوب صورت گرد پوش اپنی اپنی فنکارانہ خوبیوں کو لیے ہوئے دیواروں کو مرقع کر رہے تھے۔ رنگوں اور خطوں کی بہار، سایوں اور روشنی کے امتزاج، نقطوں اور لائینوں کے کرشمے، خط و الوان کی رنگینیوں کی حامل کتابوں کے سینکڑوں گرد پوش، کتابوں سے بڑھ کر دل کش اور حسین۔ بامعنی، پر معنی، جدیدیت کے حامل، معروض اور موضوعی خوبیوں کے منہ بولتے شہ کار، موضوعات، عنوانات اور کتابوں کے اندرونی مواد کی غمازی کرتے ہوئے رنگین، زرق برق، چمکدار سینکڑوں ڈسٹ کورز، یہ بھی ہمارے ملک کے مایۂ ناز فنکاروں اور آرٹسٹوں کی اعلےٰ تخلیق ہیں۔ (ماہنامہ کتاب لاہور)

روداد کھیلوں کے سالانہ مقابلوں کی

گذشتہ دنوں گورنمنٹ کالج برائے خواتین سرگودھا میں کھیلوں کے سالانہ مقابلے ہوئے اس موقع پر کالج کے گراؤنڈ کو نہایت جانفشانی سے سجایا گیا تھا اور ایک طرف قناطیں لگی تھیں جن کے نیچے مہمانوں اور طالبات کو بٹھانے کا انتظام تھا۔ نو بجے سے مہمانوں کی آمد آمد ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی کالج کے گراؤنڈ میں سفید لباس کے ساتھ رنگ برنگے آنچل بھی نظر آنے لگے۔

"گارڈ آف آنر" اور مارچ پاسٹ کی طالبات اپنی جگہ مستعد کھڑی تھیں اور سب لوگ مہمان خصوصی کے لیے چشم براہ تھے۔ اس تقریب کی مہمان خصوصی محترمہ مسز رضیہ اعظم علی بیگ صاحبہ ڈائریکٹریس فزیکل ایجوکیشن پنجاب یونیورسٹی لاہور تھیں۔

مہمان خصوصی نے "گارڈ آف آنر" کا معائنہ کیا۔ مس فرحین ملک اور محترمہ مس نور محمد صاحبہ نے انہیں خوش آمدید کہا۔ اور انہیں ان کی جگہ پر بٹھا دیا۔ تقریب کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد مسز بیگ صاحبہ نے سلامی کے چبوترے پر کھڑے ہو کر سلامی دی۔ ہیڈ گرل مس وقار النساء آغا نے مارچ پاسٹ کی طالبات کی سربراہی کی۔ چاروں جماعتوں نے سرسید ہاؤس، جوہر ہاؤس، اقبال ہاؤس اور جناح ہاؤس کی نمائندگی کی۔

مارچ پاسٹ کے بعد دوڑوں کی ابتداء ہوئی۔ مسز سعیدہ صاحبہ نے مائیک سنبھال لیا اور اپنی پر لطف باتوں سے سب کو محظوظ کیا۔ لڑکیاں آئیں اور ۵۰ میٹر، ۱۰۰ میٹر، ۲۰۰ میٹر اور ریلے ریس میں حصہ لیا۔ مختلف طالبات نے اوّل، دوم اور سوم انعام حاصل کیا۔ کچھ طالبات ناکام رہیں مگر مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔ پھر پی ٹی کا مظاہرہ ہوا۔ پی۔ ٹی کی طالبات نے جسمانی ورزش کا مظاہرہ کر کے ناظرین سے داد پائی۔

اس کے بعد چاٹی دوڑ شروع ہوئی۔ طالبات سر پر چاٹیاں اٹھائے بھاگ رہی تھیں۔ کچھ تو راستے ہی میں گر پڑیں اور کچھ نے منزلِ مقصود کو پالیا۔ سائیکل دوڑ اور چار ٹانگوں والی دوڑ بھی ہوئی۔ جس میں کافی جوش کا مظاہرہ کیا گیا۔ مسز اعوان، مسز چوہدری، مس کرم الٰہی، مس مسرت چغتائی اور مس زاہدہ چغتائی نے منصفین کے فرائض انجام دیئے۔

پرنسپل محترمہ مس نور محمد صاحبہ نے حاضرین محفل سے خطاب کیا۔ انہوں نے بطریقِ احسن اپنی افواج کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ کھیلوں کی اہمیت واضح کی۔ اور مہمان خصوصی کا تعارف کرایا اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی۔

محترمہ مس رضیہ بیگ نے فزیکل ایجوکیشن یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ کی جانی پہچانی شخصیت ہیں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انہوں نے بھی حاضرین سے خطاب کیا اور فرمایا کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل بھی ضروری ہوتے ہیں۔

حالیہ شکست کے اسباب بتاتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اپنے آبائی مذہب اسلام کو پس پُشت ڈال دیا۔ اور اس کے اصول وضوابط کو فراموش کر دیا جس کی پاداش میں ہمیں آج یہ دن دیکھنا پڑا کہ ہم ہندوستان سے شکست کھا گئے اور اپنے دائیں بازو سے محروم ہو گئے۔ لیکن انشاء اللہ ہم اپنے حصہ کو واپس لیں گے اور پاکستان کو مستحکم و مضبوط بنائیں گے ان کی تقریر نہایت بصیرت افروز تھی۔

آج کی تقریب کا آخری پروگرام "تقسیم انعامات" تھا۔ مہمان خصوصی نے اپنے دستِ مبارک سے انعامات تقسیم کئے۔ اور طالبات کی حوصلہ افزائی کی۔ اس سال کی بہترین کھلاڑی شہزادی بدر النساء سال دوم قرار پائیں۔ انہوں نے سب سے زیادہ انعامات حاصل کیے۔

مشق

۱۔ کالج میں یونین کے انتخابات کی مختصر روداد تحریر کیجیے۔

۲۔ کسی میچ کا آنکھوں دیکھا حال تحریر کیجیے۔

۳۔ آپ کے شہر میں ایک سیاسی جلسہ منعقد ہوا۔ اس کی مختصر کارروائی اخبار کے لیے قلمبند کیجیے۔

۴۔ کالج یونین کے زیر اہتمام یوم قائداعظم منایا گیا۔ مقررین نے جن جن خیالات کا اظہار کیا اسے اختصار کے ساتھ پیش کیجیے۔

۵۔ ایک تنقیدی ادبی اجلاس کی مختصر روداد تحریر کیجیے۔

۶۔ آپ کے کالج میں ہفتۂ تقریبات منایا گیا اس کی روداد قلمبند کیجیے۔

۷۔ کسی دلچسپ سفر کی روداد بیان کیجیے۔

۸۔ کالج کی ایک پارٹی تاریخی مقامات کی سیر کے لیے گئی ہے۔ اس پارٹی کے رکن کی حیثیت سے سفر کی رپورٹ تحریر کیجیے۔

باب ۱۶

مکالمہ نویسی

مکالمہ جسے انگریزی میں ڈائیلاگ DIALOGUE کہتے ہیں ایک دلچسپ صنف ہے اس کے لغوی معنی ہم کلام ہونا ہیں۔ اصطلاح میں دو آدمیوں کے درمیاں بات چیت کا نام مکالمہ ہے۔

مکالمہ نویس کے لیے نہ صرف یہ کہ موضوع سے متعلق موافق اور مخالف رائے رکھتا ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو دو مختلف حیثیتیں دے سکتا ہو دو شخص جس طرح بے تکلف گفتگو کرتے ہیں وہی شان مکالمہ نویس کی ہونی چاہیے۔

مکالمہ لکھتے وقت مندرجہ ذیل امور کو مدِ نظر رکھنا چاہیے:۔

ھدایات

۱۔ مکالمہ لکھتے وقت کلام کرنے والوں کے نام واضح طور پر دائیں طرف لکھنے چاہئیں۔

۲۔ بول چال کا انداز اختیار کیا جائے۔

۳۔ مکالمے کی زبان آسان اور عام فہم ہو۔ اندازِ گفتگو فطری معلوم ہو۔ بھاری اور بوجھل الفاظ نہ آنے چاہئیں ورنہ مکالمہ میں اصل کی شان پیدا نہ ہو گی۔

۴۔ جو کچھ کہا جائے مختصر، مدلل اور موضوع کے عین مطابق ہو۔

۵۔ جس موضوع پر مکالمہ لکھنا ہو اس کے بارے میں بنیادی نکات کو ذہن میں رکھ لینا چاہئے یا اشارات لکھ لینے چاہئیں۔ مکالمہ لکھتے وقت ان باتوں کو ترتیب وار پیش کرنا چاہیے۔

۶۔ مکالمہ میں گفتگو کرنے والوں کو تقریباً برابر موقع ملنا چاہئے۔ کوئی کردار لمبی چوڑی تقریر نہ کرنے لگ جائے۔

۷۔ موضوع کے مطابق سنجیدہ یا شگفتہ اندازِ بیان اختیار کیا جائے۔

۸۔ مکالمہ کو اس طرح شروع کرنا چاہیے کہ پڑھنے والے کی توجہ ابتدا ہی سے ادھر ہو جائے۔

۹۔ مکالمہ کسی نتیجے پر ختم ہونا چاہیے یکایک ختم نہ ہو۔
۱۰۔ اگر موزوں اشعار، مصرعے یا کہاوتیں وغیرہ استعمال کر سکیں تو مکالمے میں جان پڑ جائے گی۔

تانگے والے اور مسافر کے درمیان گفتگو

مسافر:۔ اجی او تانگے والے!
تانگے والا:۔ ہاں جناب! کہاں چلیں گے؟
مسافر:۔ لاریوں کے اڈے پر۔
تانگے والا:۔ آئیے! بیٹھیے!
مسافر:۔ کیا کرایہ لو گے؟
تانگے والا:۔ دو روپے۔
مسافر:۔ نہیں یار! روپیہ لے لو۔
تانگے والا:۔ بابو جی! روپیہ کون لیتا ہے۔
مسافر:۔ میں ہمیشہ روپیہ دیتا ہوں۔
تانگے والا:۔ وہ زمانہ چلا گیا۔ اب تو رکشا والا بھی اگر مان جائے تو دو روپے سے کیا کم لے گا۔
مسافر:۔ یار ہر چیز کا نرخ بڑھ گیا۔
تانگے والا:۔ کیا کریں؟ مہنگائی بھی تو دیکھیں، اپنا پیٹ بھرنا ہے، اس گھوڑے کو کھلانا ہے۔
مسافر:۔ اچھا ڈیڑھ روپیہ لے لینا۔
تانگے والا:۔ جیسے آپ کی مرضی!
(مسافر تانگے پر سوار ہو جاتا ہے اور تانگے والا "بچ موڑ توں" کہہ کر رادی

راوی روڈ کی طرف مُڑ جاتا ہے)

تانگے والا ! بابو جی ! رستے میں کوئی سواری مل جائے تو بٹھالوں۔

مسافر:۔ بٹھالینا لیکن ٹھہرنا نہیں مجھے بہت جلدی ہے۔

تانگے والا:۔ بہت اچھا جی !

(اور پھر گھوڑے کو چابک مار کر گنگنانے لگتا ہے

.... میرا پیار یاد رکھنا)

دو دوستوں کے درمیان گفتگو

(امتحان کے بارے میں)

طاہر:۔ تمہارا امتحان کب شروع ہو گا ؟

انور:۔ ہمارا امتحان چھ اپریل سے شروع ہو گا۔

طاہر:۔ تو گویا پندرہ دن باقی رہ گئے۔ اسی لیے آج کل نظر نہیں آتے۔

انور:۔ بھئی کیا بتاؤں، مجھے تو امتحان سے کچھ ڈر سا محسوس ہوتا ہے۔

طاہر:۔ ڈرنے کی کیا وجہ ؟

انور:۔ بس پڑھنے میں زیادہ وقت گزارتا ہوں۔ اچھے نمبر نہ آئے تو کالج کا داخلہ بھی مشکل سے ملے گا۔

طاہر:۔ درست ہے ! لیکن کچھ وقت سیر کے لیے نکال لیا کرو۔

انور:۔ بھئی امتحان کی وجہ سے مجھے تو سب کچھ بھولا ہوا ہے۔

طاہر:۔ امتحان کے قریب بہت زیادہ محنت کرنا بھی اچھا نہیں ہے اگر خدانخواستہ بیمار ہو گئے تو ؟

انور:۔ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اب اس کا کوئی اور علاج نہیں ہے۔ پہلے ہی ہڑتالوں کی وجہ سے کافی وقت ضائع ہوا ہے۔

طاہر:- تمہیں چاہیئے تھا کہ شروع سال سے باقاعدگی سے مطالعہ کرتے۔اگر تمہاری صحت بگڑ گئی تو کیا ہوگا؟

انور:- مجھے اس بات کا احساس ہے کہ کہیں امتحان میں ناکامی کی صورت میں دوستوں اور رشتہ داروں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

طاہر:- لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ پڑھائی میں صحت کا خیال بھی نہ رکھو۔سیر تفریح بھی ضروری ہے۔کبھی کھیل میں حصہ لے لیا کرو، ورزش ہو جاتی ہے۔

انور:- میں تسلیم کرتا ہوں کہ صحت کے لیے ورزش بھی ضروری ہے لیکن کیا کروں؟ اچھا آئندہ میں آپ کے حکم پر عمل کروں گا۔

طاہر:- تو آؤ تھوڑی سی دیر کے لیے کمپنی باغ میں گھوم آئیں۔

انور:- ٹھہریے! میں ابھی چلتا ہوں لیکن زیادہ وقت نہیں ٹھہروں گا۔

ڈاکٹر اور مریض کے درمیان گفتگو

مریض:- السلام علیکم! ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر:- وعلیکم السلام! آؤ بھئی کیسے آئے؟ خیریت تو ہے۔

مریض:- یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔خیریت ہو تو آپ کے پاس کون آئے؟

ڈاکٹر:- کیوں کیا ہو گیا؟

مریض:- میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔خدارا جلد کوئی دوا دیجیے۔درد کی شدت سے مرا جا رہا ہوں۔

ڈاکٹر:- یہاں بنچ پر ذرا لیٹ جائیے۔ابھی دوائی پلاتے ہیں۔ہاں! یہ تو بتاؤ رات کو کیا کھایا تھا؟

مریض:- چنے کی دال اور جلی ہوئی روٹی کا ٹکڑا۔

ڈاکٹر :۔ جلی ہوئی روٹی کا ٹکڑا اور دال ؟

(کمپونڈر سے) اسلم ! ذرا آنکھوں کی دوائی لانا ۔

مریض :۔ (گھبرا کر) ڈاکٹر صاحب ! درد تو میرے پیٹ میں ہے اور آپ دوائی میری آنکھوں میں ڈالنے کا حکم دے رہے ہیں ۔

ڈاکٹر :۔ ہاں بھئی ! میں پہلے تمہاری آنکھوں کا علاج کرنا چاہتا ہوں اگر آنکھیں ٹھیک ہوتیں تو جلی ہوئی روٹی کیوں کھاتے ۔

مریض :۔ ڈاکٹر صاحب ! مذاق کو چھوڑیئے غلطی کر بیٹھا ۔ بھوک لگی تھی اور روٹی ختم ہو چکی تھی ناچار جلی ہوئی روٹی پر گزارہ کیا ۔

ڈاکٹر :۔ کوئی بات نہیں ۔ ابھی دوائی دیتا ہوں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے ۔

مریض :۔ کوئی پرہیز ؟

ڈاکٹر :۔ آج روٹی نہ کھائیے گا ۔ دلیا یا کھچڑی بنوا لیجئے گا ۔

مریض :۔ بہت بہتر جناب ! شکریہ ۔

دو دوستوں کے درمیان گفتگو

(رخصت ہوتے وقت)

ارشد :۔ بھائی انصار ! تو کیا واقعی آج گھر جانے کا ارادہ ہے ؟

انصار :۔ بھائی ایک ہفتہ ہو گیا اب اور کیا چاہتے ہو تم تو کبھی اتنا بھی نہ ٹھہرے اچھا تو سنو میرا سامان بندھوا دو اور کوئی سواری منگوا دو ۔

ارشد :۔ اتنی جلدی کیا ہے ؟ ابھی تو گاڑی آنے میں ایک گھنٹہ باقی ہے ۔

انصار :۔ یار اسٹیشن پہنچنا ہے ۔ ٹکٹ لینا ہے کم از کم پندرہ منٹ تو پہلے پہنچنا چاہیے ۔

ارشد :۔ اچھا تم ناشتہ کرو ! میں سب انتظام کئے دیتا ہوں ۔

انصار :۔ ذرا جلدی ۔

ارشد :۔ فکر نہ کرو! مَیں نے بابر کو گاڑی لینے کے لیے بھیج دیا ہے۔

انصار :۔ ہاں! تو تم کب آ رہے ہو؟

ارشد :۔ ارادہ تو انہی تعطیلات میں آنے کا ہے بشرطیکہ کوئی مجبوری نہ ہوئی۔

انصار :۔ مجبوری کیسی؟

ارشد :۔ شہری دفاع کا تربیتی کورس ہو رہا ہے میرا نام ادھر بھیجا جا چکا ہے۔

انصار :۔ اس کے بعد سہی۔

ارشد :۔ انشاء اللہ! ہاں جاتے ہی میری کتابیں بھیج دیجئے گا۔ مجھے ان کی اشد ضرورت ہے۔

انصار :۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر پہنچ جائیں گی۔

(اتنے میں گاڑی آ جاتی ہے)

ارشد :۔ وہ گاڑی آ گئی۔ لاؤ بستر میں اٹھاتا ہوں۔

انصار :۔ شکریہ! اچھا خدا حافظ!

ارشد :۔ خدا حافظ۔

درزی اور گاہک کے درمیان

گاہک :۔ السلام علیکم!

درزی :۔ وعلیکم السّلام۔

گاہک :۔ مجھے ایک سُوٹ سلوانا ہے! کیا آپ سی دیں گے؟

درزی :۔ آئیے تشریف رکھیے

گاہک :۔ شکریہ! (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

درزی :۔ آجکل کام بہت زیادہ ہے۔ کیا آپ دو ہفتے انتظار کر سکیں گے؟

گاہک :۔ کوئی بات نہیں لیکن سلائی اچھی ہو۔

درزی :- اس بات کی فکر نہ کریں ۔

گاہک :- یہ کپڑا دیکھیے ! سوا تین گز ہے۔ کپڑے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟

درزی :- بہت عمدہ ہے ۔ لارنس پور کا ہے ۔ کس بھاؤ ملا ہے ؟

گاہک :- چالیس روپے گز ۔

درزی :- مہنگائی بڑھ رہی ہے پچھلے دنوں پینتیس (۳۵) روپے گز میں ملتا رہا ہے ۔

گاہک :- ہاں تو سلائی کیا ہوگی ؟

درزی :- نوّے روپے لگیں گے ۔

گاہک :- یہ تو بہت زیادہ ہیں ۔

درزی :- پچاسی روپے دے دیجیے گا ۔ آئیے ماپ لے لوں ۔

گاہک :- کب تیار ہو جائے گا ؟

درزی :- (کیلنڈر کی طرف دیکھ کر) ۲۱ تاریخ کو تیار ہو جائے گا ۔

گاہک :- لیکن یونہی چکر نہ پڑے ۔

درزی :- نہیں ! ایسا نہیں ہوگا ۔ ہم وعدے کے مطابق کام کرتے ہیں ۔

گاہک :- ہاں ! ذرا خیال رکھیے گا کہ زیادہ تنگ نہ ہو میں ذرا کھلا (LOOSE) پہننا پسند کرتا ہوں ۔

درزی :- انشاءاللہ ! آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا ۔

گاہک :- اچھا میں اجازت چاہتا ہوں ۔

درزی :- خدا حافظ ۔

اُستاد اور شاگرد کے درمیان مکالمہ

اُستاد: ارے ارے بھئی تم کون ہو۔ یہ کیا کر رہے ہو؟

کمال: پروفیسر صاحب آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ مَیں ہوں آپ کا خادم۔ آپ کا شاگرد۔

اُستاد: آہا کمال (گلے لگا لیتا ہے) برسوں بعد دیکھا۔ مَیں نے تو بالکل نہیں پہچانا۔

کمال: جی ہاں۔ پندرہ سولہ برس بعد آپ کے درشن نصیب ہوئے ہیں۔ بی۔ اے کے بعد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس کے بعد ولایت چلا گیا۔

اُستاد: کہو اچھے تو رہے۔ کرتے کیا ہو؟

کمال: پروفیسر صاحب! آپ کی دعا سے خوب مزے میں ہوں۔ ولایت میں مَیں نے ایم۔ اے کے بعد 'لا' میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہاں آکر کچھ دن تو مَیں ایک کالج میں لیکچرار رہا مگر ابا جان کا اصرار تھا کہ میں پریکٹس کروں۔ آپ جانتے ہیں تعلیمی کام میں تو ترقی کا موقع بہت کم ہوتا ہے۔

اُستاد: پریکٹس کیسی ہے۔

کمال: خوب کام چل رہا ہے۔

اُستاد: کہو بال بچے ہیں۔

کمال: جی ہاں شادی ولایت جانے سے پہلے ہو گئی تھی۔ بیوی بی۔ اے پاس ہے۔ بہت ذہین سمجھدار ہے۔ ایک لڑکا ہے بڑا ضدی اور شریر۔

اُستاد: تم سے مل کر اور تمہیں خوش و خرم دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔

کمال: مَیں کس قابل تھا۔ یہ سب آپ کی خوبیوں کا طفیل ہے۔

اُستاد : ارے بھئی یہ سب تمہاری محنت اور کوشش کا پھل ہے -

کمال : نہیں پروفیسر! یہ آپ کی شفقت، آپ کی تربیت اور تعلیم کا فیض ہے میں ابھی تک نہیں بھولا کہ میں کتنا شریر کاہل اور بدشوق تھا۔ آپ ہی تھے جنہوں نے مجھے سیدھے راستے پر ڈالا۔ مجھ میں تعلیم کا شوق پیدا کیا اور محنت و کام کی قدر اور اہمیت میرے دل میں بٹھائی۔ میں جو کچھ ہوں آپ ہی کا بنایا ہوا ہوں -

اُستاد : بھئی یہ تو میرا فرض تھا۔ میرا کام ہی یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کے دل میں تعلیم و محنت کا شوق اور جذبہ اُبھاروں - (صالحہ عابد حسین)

(ڈرامہ امتحان)

نیکی اور بدی کا مکالمہ

بدی : میں ہوں جہان کی خوشی - میں ہوں -

نیکی : دنیا کی مصیبت خدا اور انسان کے بیچ میں دیوار -

بدی : دنیا کی قسمت میرے داہنے ہاتھ میں ہے اور اس کی کنجی میرے بائیں ہاتھ میں ہے - تم جو بہشت کی امیدیں دنیا کو دوزخ بنائے ہوئے ہو میری طرف آؤ اور میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ - میری سخاوت کے بال موتی برسائیں گے اور میرے دامن کو بھی مالامال کردیں گے -

نیکی : تو جھوٹی ہے تو آدمی کی ذات کو مصیبت اور خوفناک موت کے سوا کچھ نہیں دے سکی -

بدی : چپ تو ہی میری طرف آنے والوں کو روکتی ہے -

نیکی : اور تو نیک راہ چلنے والوں کو جہنم کے اندھیرے غار میں گراتی ہے -

بدی : تو نہ ہوتی تو دنیا میں بہشت کا مزہ آتا -

نیکی: بدی! تُو نہ ہوتی تو خدا جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا۔

بدی: نیکی! لڑائی چھوڑ۔

نیکی: بدی! بُرائی چھوڑ۔

بدی: اری دنیا عاشقوں کا بازار ہے۔ اس میں کوئی تیرا خریدار ہے کوئی میرا طلبگار ہے۔

نیکی:
جو آج جانتے ہیں دنیا کی حور تجھ کو
دے بیٹھے ہیں جو دل سے عقل و شعور تجھ کو
جس روز روشنی میں دیکھیں گے شکل تیری
نفرت کی ٹھوکروں سے پھینکیں گے دُور تجھ کو

بدی: نادان کبھی ایسا نہ ہوگا۔ کیا تو نہیں جانتی کہ دنیا کی مٹی خود غرض اور لالچ کے پانی سے گوندھی گئی ہے۔

نیکی: جھوٹی۔ تیرا ہر لفظ عداوت سے بھرا ہے۔ دنیا کا چمن بس میری کوشش سے ہرا ہے۔

(آغا حشر)

جزوششم

آپ بیتی۔خط۔عرضی

(۱۵نمبر)

باب ۱۷

آپ بیتی

اُردو زبان کی آپ بیتی

میرا نام اردو ہے۔ میں اس وقت پاکستان کی ملکہ ہوں۔ یہ اعزاز قومی زبان کے نام سے مجھے بانیٔ پاکستان قائداعظم نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء بمقام ڈھاکہ عطا فرمایا تھا۔ آپ نے اعلان کیا تھا "پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی"۔

میرا سن پیدائش صحیح طور پر کیا ہے۔ اس پر تو میرے آباؤ اجداد بھی متفق نہیں۔ البتہ میرے وجود میں آنے کے بعد مجھے جن حالات سے گزرنا پڑا اور جن لوگوں کے سہارے میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ادوار گزرے وہ مجھے یاد ہیں۔

میری تخلیق میں بے شمار زبانوں کے اجزا شامل ہیں جن میں بڑا حصہ عربی، فارسی اور سنسکرت کا ہے۔ ترکی، بنگالی، برج بھاشا اور پنجابی بھی خاصا دخل رکھتی ہیں۔ میری عالی ظرفی نے انگریزی کو بھی قبول کر لیا۔ میرا سابقہ جس زبان سے بھی پڑتا ہے وہ پہلی ملاقات ہی میں مانوس ہو جاتی ہے۔

ہاں تو میرا بچپن حضرت امیر خسرو کے میٹھے بول اور سہانی لوریاں سنتے گزرا۔ پھر آگے چل کر بھگت کبیر، بابا گرونانک نے میرے لیے جھولنے تیار کیے پھر میرے خدوخال ابھرنے لگے یہاں تک کہ شاہجہان کے دور میں ایک ہونہار بچی کی شکل میں شاہی محلات میں پرورش پانے لگی۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے زندگی کے ہر دور میں مددگار میسر آتے رہے۔ جب میں پیروں چلنے کے قابل ہوئی تو میر، مظہر جانِ جاناں، سودا جیسے بالغ نظر شاعر ادبی

محفلوں میں انگلی پکڑ کر لے جانے لگے۔ احسان فراموشی ہوگی اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ اس دور میں انگریزوں نے بھی میری پرورش میں ضرورتاً یا مصلحتاً بہرحال خاصہ حصہ لیا۔ اس طرح بچپن سے بلوغت تک ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھی کی لاڈلی بنی رہی۔

جب میں بات کرنے کے قابل ہوئی تو علماء نے مجھے قرآن پاک کا ترجمان بنا کر دینی خدمت پر مامور کر دیا۔ اب میں ذہین اور ہوش مند لڑکی کی مانند حکومت اور عوام میں مقبول ہو گئی اور وہ وقت آیا کہ میری ذہانت و قابلیت کے سبب ۱۸۳۵ء میں سرکاری دفاتر کی کارکردگی بھی مجھے سونپ دی گئی۔ سرکاری ذمہ داریوں کو بطریق احسن سرانجام دینے کی خوشی میں مجھے اخبارات کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ اور مجھے تمام علاقائی بولیوں کی سرپرست اور مربی تسلیم کیا جانے لگا۔ مجھے یہ مقام دلانے والوں میں انشاؔ، ناسخؔ، آتشؔ مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ، انیسؔ، دبیرؔ، نسیمؔ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ کسی نے میرے رخ زیبا کے لیے غازہ تیار کیا، کسی نے گیسو سنوارے، کسی نے فصاحت و بلاغت کے پھول مہیا کیے، کسی نے جڑاؤ زیورات پہنائے۔ میرے لیے زیبائش کا سامان تیار کرنے کے لیے انگریزوں نے ایک کارخانہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم کیا جہاں گلکرسٹ کی سرپرستی میں میرامن حیدر بخش حیدری وغیرہ دن رات کام کرتے رہے یہ کارخانہ بند ہوا تو سرسید نے علی گڑھ میں میرے لیے سادگی و سلاست کا سامان وقت کی ضروریات کے مطابق بنانا شروع کر دیا۔ حالی، نذیر احمد، شبلی نے ان کا ہاتھ بٹایا اور میں اس طرح انگریزی کے مقابلے میں بیٹھنے کے قابل ہو گئی۔ حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، اقبالؔ، خواجہ حسن نظامی جیسے مزاج شناس بزرگوں نے میرے لیے نئے نئے نثری اور نظمی مرصع لباس تیار کیے اور میں دلہن اور باوقار ملکہ بننے کے قابل ہو گئی۔ اور میری شہرت ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک میں بھی پھیل گئی اور میرے شیدائی پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ آج یہ کیفیت ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں میرا تیسرا نمبر ہے۔

انگریزوں نے میرے ساتھ فریب کیا اور مجھے انگریزی کی کنیز بنا کر رکھ دیا۔ شروع

میں تو مجھے پتہ نہ چلا کیونکہ حملہ بڑی ہوشیاری سے کیا گیا تھا۔ علمی اداروں میں مجھے نظر انداز کر دیا گیا۔ سرکاری دفتروں سے نکال دیا گیا۔ یہاں تک کہ تقسیم ہند کے وقت میری سوکن انگریزی زبان ہر جگہ چھا چکی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد ڈھارس بندھی کہ اب یقیناً دن پھر جائیں گے اور میں اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لونگی۔ قائد اعظم نے یہ کہہ کر کہ پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ میرے سر سہرا باندھ دیا۔ اس وقت پنجابی، پشتو، انگریزی، بنگالی اور سندھی نے مجھے مبارکباد دی اور ہر طرح تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن قائد اعظم مجھے یتیم چھوڑ کر جلد ہی اگلی دنیا چلے گئے اب میرے سرپرست وہ لوگ تھے جو انگریزی کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔ ہندوستان نے مجھے وہاں سے دیس نکالا دے دیا تھا بنگالیوں نے میری سوتیلی بہن بنگالی کو میرے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ یہ دیکھ کر سندھی بہن بھی آنکھیں دکھانے لگی سوتیلی بہن نے تو وہ چکر چلایا کہ بنگال میں الگ محل بنا لیا۔ سندھی بہن سے صلح ہو چکی ہے۔ پنجابی بہن تو شروع سے میری غمگسار رہی ہے اور اب بھی مجھے ہر طرح سہارا دے رہی ہے۔ موجودہ حکومت بھی میرے گنوں سے آگاہ ہے اور مجھے قومی زبان، سرکاری اور دفتری زبان بنانے کا اعلان کر چکی ہے۔ لیکن مجھے سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت سے کب تاج پہنایا جائیگا۔ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔ البتہ میں مایوس نہیں ہوں اور قائد اعظم کے یہ الفاظ میری ڈھارس بندھا رہے ہیں۔

"میں آپ کو واضح الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی"

ع

نمایاں میرا جوہر صورت شمشیر ہو جائے
تمنا ہے کہ اردو لفظ عالمگیر ہو جائے

(ماخوذ و ترمیم)

ایک پھول کی آپ بیتی

میں آج سے پانچ روز قبل پیدا ہوا۔ دو روز تک تو نیچر نے بچے کی طرح ہری ہری پتیوں میں لپیٹ رکھا تھا اور چھوٹے چھوٹے کانٹے میری حفاظت کے لیے مقرر کر دیے تھے۔ انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے، چلاتا ہے اور ہاتھ پیر پٹکتا ہے مگر میں کچھ ایسا سہما ہوا تھا کہ چپ چاپ انہیں نازک نازک پتیوں میں لپٹا ہوا پڑا رہا۔ نہ آنکھیں کھولیں، نہ کچھ دیکھا۔ اکثر نہ جانے کیا ہو جاتا تھا کہ میں خوب زور زور سے ہلنے لگتا۔ گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا ہے۔ اس ہلنے سے تو میری روح کانپ اٹھتی اور میں اور زیادہ سہم جاتا۔ جب میں دو روز کا ہوا اس وقت مجھے باہر کی کچھ کچھ آواز سنائی دینے لگی۔ باہر میرے بھائی مجھ پر ہنستے، قہقہہ لگاتے اور کہتے تھے کہ تو بھی کیا ڈرپوک ہے، ذرا باہر نکل اور دیکھ ہم کس مزے میں ہیں۔ لوگ ہماری کیسی تعریفیں کرتے ہیں اور کیسی قدر ہوتی ہے۔ کوئی ہماری خوشبو سونگھتا ہے تو کوئی ہمیں چومتا ہے۔ کبھی کسی کے سر پر بندھتے ہیں تو کبھی کسی کے گلے کا ہار ہو رہتے ہیں۔ غرض ہم بڑے چین کرتے ہیں۔ ایک تو ہے کہ سہمے ہوئے، لپٹے ہوئے، دبکے ہوئے پڑا ہے۔ یہ سن کر مجھے بھی کچھ گدگدی سی معلوم ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ چہرے سے سبز نقاب کو الٹ دوں، باہر نکل آؤں، کچھ دکھاؤں اور اپنے دوستوں کی چھیڑ چھاڑ میں شریک ہو جاؤں۔ مگر ادھر حیا روک رہی تھی، ادھر خوف غالب آ رہا تھا۔ عجیب کشمکش تھی۔ دو دن تو اسی بے چینی میں گزر گئے۔ پھر تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنے بھائیوں کی باتیں سن سن کر طبیعت بے اختیار ہو گئی اور شوق نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی اب ٹھان ہی لی کہ "تنگ نائے عدم سے فراخ نائے ہستی کی سیر کرنے نکل آؤں۔ مگر دن کی روشنی میں تو اس کی ہمت نہ پڑی۔ علی الصبح کوئی چار بجے کے قریب میں اپنے ہرے ہرے نقاب

میں سوراخ کرنے لگا۔ مگر یہ کچھ ایسا مضبوط تھا اور کچھ میں ایسا نازک کہ مجھ سے سوراخ نہ ہو سکا۔ مگر دنیا کی سیر کے خیال نے مجھے ایسا بے قرار کر دیا کہ میں جھنجھلا کر، تڑپ کر، مچل کر، پھیل کر غرض کئی ترکیبوں سے اپنے نقاب کو اور اپنی پوشاک کو پھاڑنے لگا۔ آخرش ایک دھیمی آواز سے جسے لوگ چٹخنا کہتے ہیں، میرا نقاب اٹھ گیا۔ ادھر اس کا اٹھنا ہی تھا کہ ادھر میری باچھیں کھل گئیں، چہرہ تمتما اٹھا، ایک رنگ آتا تھا، اور ایک جاتا تھا، غرض خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ شرمیلے چہرے پہ ایک ہلکی سی گلابی رنگت چھا گئی تھی اور میں چپکے سے باہر جھانکنے لگا۔ واقعی یہاں عجیب دلچسپی تھی۔ اطراف میں چھوٹے بڑے خوشنما درخت اُگے ہوئے تھے، زمین پہ سبز فرش بچھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پودوں میں خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ سین دیکھ کر خوش ہوا مگر حیا نے یہاں بھی میرا دامن نہ چھوڑا میں نہایت شرمایا ہوا تھا۔ اپنی گردن جھکائے ہوئے اور منہ چھپائے ہوئے تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس تاک جھانک میں مجھے مزا آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں نسیم سحر چلنے لگی تو میں بہت گھبرایا اور ڈر گیا۔ مگر میرے دوستوں کو کچھ ایسا مزا آیا کہ مست ہو کر جھومنے لگے، ایک دوسرے کو چومنے لگے۔ ادھر تو یہ شرارت ہو رہی تھی اور ادھر جھینپ کے مارے میری بری حالت تھی، پسینہ میں شرابور ہو گیا۔ اتنے میں میرے ایک بزرگ دوست نے چلا کر کہا۔ بیٹا! اس وقت تو تمہارا حسن عجیب بہار دکھا رہا ہے۔ وہ تمہارے گلابی چہرے کی جھلک، ان ہری ہری پتیوں میں سے ایک ایک انداز کے ساتھ تمہارا جھانکنا، اس پہ شبنم کے قطرے تو عجیب ستم ڈھا رہے ہیں۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ تمہاری بڑی قدر ہوگی۔ یہ سن کر میں اور بھی جھینپ گیا۔ کچھ عرصے میں مشرق کی جانب سے روشنی دکھائی دی۔ پرندوں نے اپنی راگنیاں شروع کر دیں، تھوڑی دیر میں آفتاب بھی نکل آیا۔ اس کی تیز تیز کرنیں گو مجھے ناگوار گزرتی تھیں مگر ان کا اثر مجھ پر مفید ثابت ہوا۔ میں ڈیل ڈول میں بڑھنے لگا۔ ادھر تو آفتاب کی شعاعیں ستانے لگیں اور ادھر ایک غضب ٹوٹ رہا تھا۔ وہ یہ کہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں مجھے دق کرنے لگیں۔ مجھ پر آ کر بیٹھ جاتیں اور ٹھونگیں

مارتی تھیں۔ غرض یہ دن تو عجیب مشکل سے کٹا۔ کہیں یہ چڑیاں پریشان کر رہی تھیں اور کہیں یہ تند ہوا ستا رہی تھیں۔ آخر شام ہو گئی۔ ہر چیز خوش نظر آنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں نے اپنی رنگینیوں سے پھر ہمیں مست کرنا شروع کیا۔ آفتاب بھی اس وقت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری سنہری کرنیں عجیب بہار دکھا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں لوگ بھی جوق در جوق آنے لگے۔ کوئی ہمیں دیکھ کر تعریف کرتا تو کوئی ہمارے پودے تلے کی گھاس کے سبز فرش پر بیٹھ جاتا۔ غرض عجیب چہل پہل تھی۔ تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا، لوگ جانے لگے، پرند خاموش ہو گئے۔ اندھیرا چھانے لگا کہ ناگہاں مجھے کچھ شور سنائی دیا۔ میں گھبرا کر اپنے خواب مست سے چونک پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میرے دوست آپس میں مذاق کر رہے تھے۔ میں ہوشیار ہو گیا۔ آج تو واقعی میرا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ کبھی میں اپنی مہک سے مست ہو جاتا تو کبھی اپنے رنگ و روپ دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ اپنے حسن کی آپ ہی تعریف کر رہا تھا کہ میرے اسی دوست نے پھر چل کر کہا، بیٹا! آج تو تم اپنی جوانی پر ہو۔ یہ سن کر میں شرما کر مسکرایا۔ اس کو دیکھ کر اس نے کہا، آف! یہ تبسم تو غضب کر رہا ہے۔ میں بہت ہی جھینپ گیا۔ ایسی حالت میں مجھے دیکھ کر میرے دوستوں نے مجھے دق کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں پو پھٹ آئی، اجالا ہو گیا۔ پھر وہی اگلے دن کے لطف آنے لگے۔ بلبلوں کی آواز کان میں پڑنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بلبلیں آ کر پھر مجھے دق کرنے لگیں۔ مگر ایمان کی تو یہ ہے کہ اس ستانے میں مجھے بڑا لطف آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک آواز سے جی خوش ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک آ کر مجھے چمٹ گئی اور اپنی سریلی آواز سے مجھے اپنی رام کہانی سنانے لگی۔ میں نے بھی کچھ اس کی سنی کچھ اپنی سنائی۔ اسے تسلی دی، منایا، سمجھایا اور وہ خوش ہو کر پھر سے اڑ گئی۔ اس چہل پہل میں یہ چوتھا دن بھی گزر گیا۔ شام بھی ہو گئی۔ اس شام کا مجھے بڑا انتظار تھا کیونکہ اب تو مجھے شوق ہو چلا تھا کہ ذرا میں اپنا حسن دکھاؤں اور لوگوں سے کچھ تعریفیں سنوں۔ شام کے وہی لطف آنے لگے اور لوگ جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا میری طرف

بڑھا۔ مجھے غور سے دیکھا اور ہنس دیا۔ پھر کہنے لگا افسوس! ع

جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے

پھر مجھے غور سے دیکھا، ہنس دیا اور چلا گیا۔ اس کی باتیں سن کر میرا رنگ فق ہو گیا اور میں کانپ اٹھا اور یہی خیالات آنے لگے کہ میں کیوں پیدا ہوا۔ چار دن کے لطف کے بعد پھر بربادی! اس سے بہتر تھا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ ان خیالات میں شام ہو گئی، رات ہو گئی اور میں سو گیا۔ دوسرا دن نکل آیا۔ مگر میں انہیں خیالات میں پریشان تھا۔ بدن میں چستی نہ رہی۔ پنکھڑیاں کچھ الگ معلوم ہوتی تھیں اور میں پریشان تھا۔ اتنے میں میرے کان میں کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ میں چونک پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ یہ ایک نوجوان میری طرف آ رہا ہے۔ قریب آیا، اور یہ کہہ کر کہ یہ پھول اچھا ہے، مجھے توڑ لیا۔ آف! اس وقت میری عجیب حالت ہو گئی۔ سب خوشیاں خاک میں مل گئیں، سب مزے کرکرے ہو گئے۔ اپنوں دوستوں سے چھٹ گیا۔ وطن سے الگ ہو گیا۔ اس نے مجھے ایک رومال میں لپیٹ لیا اور لے چلا۔ بہت دیر کے بعد ایک جگہ آکر ٹھہر گیا اور مجھے رومال سے باہر نکالا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں ایک قبرستان میں آگیا ہوں۔ تھوڑی دیر میں یہ ایک قبر پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ پڑھنے لگا۔ پھر جانے اُسے کس چیز نے ستایا کہ ؎

دل میں ایک درد اٹھا اور آنکھ میں آنسو بھر آئے

بیٹھے بیٹھے اُسے کیا جانیئے کیا یاد آیا

پھر مجھے اس قبر پہ رکھ کر کہنے لگا، اے پھول! واقعی تجھ پہ میں نے بڑا ظلم کیا۔ مگر یہاں میں تجھے اس قبر میں سونے والے کے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ یہ بھی تیری طرح ستم رسیدہ ہے۔ اجل نے اسے بھی اپنے دوستوں سے الگ کیا۔ عزیزوں سے چھڑا دیا۔ وطن سے بے وطن کیا۔ تو اس کے پاس رہ۔ اس سے باتیں کر۔ اس کا دل بہلا۔ کچھ اس کی سن کچھ اپنی سنا اور اپنے دن گزار۔

ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ ہاں اگر میری نسبت کچھ پوچھے تو کہہ دیجیو کہ میں یہاں آتا ہوں۔ تیری یاد میں آنسو بہا جاتا ہوں اور تیری زندہ تصویر جو میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے اُسی سے اپنے روتے ہوئے دل کو تسلی دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر چلا گیا۔ میں نے اُس سونے والے کو جگانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ پھر میں چلایا، پکارا، جھنجھلایا، چیخا مگر وہاں اف تک نہیں پھر میں نے اُسے ہلایا، جھنجھوڑا، مگر اس ظالم نے کروٹ تک نہ بدلی۔ سہ

ہوائیں غفلت کی چل رہی ہیں اُمنڈ رہی ہیں بلا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

میں سخت پریشان ہوا اور اس بے چارے کی ایسی حالت دیکھ کر مجھے سخت قلق ہوا۔ یہ کون ہے، کیسا ہے، کہاں سے آیا ہے۔ ان خیالات میں غرق تھا کہ مجھے اس بوڑھے کی باتیں یاد آئیں۔ واقعی اس نے سچ کہا ہے کہ اس دنیا میں بیکار کھا ہے اور یہاں آنے کا شوق کیوں ہوتا ہے انہی خیالات میں میں پریشان تھا کہ میری نظر ناگہاں اپنے جسم پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ نہ مجھ میں وہ خوبصورتی رہی نہ وہ مہک۔ بدن ٹوٹ رہا ہے، پنکھڑیاں گر رہی ہیں۔ رگیں کھینچ رہی ہیں۔ میں گھل رہا ہوں، بکھر رہا ہوں اور خاک میں مل رہا ہوں۔

اُردو غزل کی آپ بیتی

لحسن کچھ بھی کہے خود اپنے خیال میں میری سب سے سچی تصویر یہ ہے جو میرے ایک پرستار نے کی ہے۔

ع میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جی ہاں جہاں تک پہنچے۔ میں عشق مجازی کی زبان بھی ہوں اور عشق حقیقی کی ترجمان بھی کاملوں اور عارفوں کے دل کی آواز بننے کا شرف بھی مجھے حاصل رہا ہے اور علم، حکمت اور فلسفہ بھی کبھی کبھی مجھے اپنا لیتا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

؎ فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا

میرا شجرہ نسب عربی زباں کے قصیدوں کی تشبیب تک پہنچتا ہے لیکن اصل میں میرے آباؤ اجداد ایران میں ہی بس گئے تھے۔ وہیں فارسی زبان کی گود میں میری پرورش اور نشو و نما ہوئی وہیں جوانی اور نکھار آیا اور پھر ہندوستان آگئی ایک عرصے تک میرے فارسی روپ کی پرستش ہوتی رہی پھر اردو زبان نے مجھے اپنا لیا۔ یوں کہئے دوسرا جنم ملا۔ میرا پہلا پرستار محمد قلی قطب شاہ تھا لیکن جس عاشق کی بدولت مجھے ہندوستان بھر شہرت حاصل ہوئی وہ ولی دکنی تھا۔ وہی ولی جس نے کہا تھا۔

؎ تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

دکن میں بے شمار چاہنے والے پیدا ہوئے۔ میری شہرت شمالی ہند پہنچی اور پھر میں خود یہاں آگئی۔ اگر یوں کہوں کہ دلی آکر شباب کی رعنائیاں آئیں تو بے جا نہ ہوگا حسن کی کرشمہ سازیاں دلکشی، محبوبیت کی ادائیں میں نے یہیں سیکھیں۔ یوں تو ہزاروں چاہنے والے تھے لیکن جنھوں نے مجھے حسن کا ادراک اور عشق کی کسک بخشی، ان میں میر، سودا، درد مشہور ہیں۔ سودا نے شان و شکوہ غمزہ و ادا سکھائے، درد نے [illegible] جذبات عشق سے روشناس کیا۔ میر نے محبت کا سوز و گداز دیا جس نے مجھے زندگی جاوید عطا کردی

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

پھر دلی تباہ ہوگئی تہذیب و تمدن کا مرکز لکھنؤ بن گیا۔ صاحب دل ہجرت کرکے ادھر آنے لگے اور مجھے بھی ساتھ کھینچ لائے۔ یہاں ہر دلعزیزی میں تو کمی نہ آئی لیکن یہاں میری قدرتی سادگی، حقیقت پسندی خوش ادائی کی قدر نہ رہی۔ جھوٹے زیورں اور بھڑکیلے لباس سے سجا بنا کر دربار کی لونڈی بنا دیا۔ نقلی جواہرات کو دیکھ کر یہ بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا اصلی حسن ماند پڑ گیا۔

اودھ میں عرصے تک میری پرستش ہوتی رہی۔ وقتی حالات سے جب دلی سنبھلی تو میری لاج رکھ لی اور مجھے عشق، حکمت، فلسفہ اور درد و سوز کا ایک نیا حسین پیکر عطا کیا۔ ذوقؔ نے میری زبان کو نئے سرے سے سنوارا۔ ظفرؔ غمِ جاناں میں غمِ دوراں سمو دیا۔ غالبؔ نے صرف مجھے نیا رنگ و روپ ہی نہ دیا بلکہ میری روح کی گہرائیوں میں اتر کر تصوف، فلسفہ، حقائقِ زندگی، ظرافت، معنی آفرینی، نازک خیالی کا رس گھول دیا۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

مومن جیسا نازک خیال میرا پرستار بنا اور نیا انداز دلکشی بخشا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ بعض کو اصلاح کی دھن سوار ہوئی۔ بعض سرے سے مٹانے پر تل گئے، مگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئیں۔ میرا سب سے بڑا نکتہ چیں حالیؔ بھی میری محبت سے اپنا دامن نہ چھڑا سکا۔ اس کا دماغ نظم کی پرستاری ضرور کرتا رہا مگر دل کی آواز میں ہی تھی۔

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

داغؔ نے دلّی کی ٹکسالی زبان میں عشقِ مجازی کی کہانیاں اس طرح بیان کیں کہ لوگ پھڑک اٹھے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

اور وہ فلسفی و حکیم شاعر جسے دنیا اقبالؔ کے نام سے پکارتی ہے، اس نے بھی اپنی وارداتِ قلب کے بیان کے لیے میرا ہی انتخاب کیا۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

پھر زمانے کے ساتھ میرا رنگ بدلنے لگا۔ تصوف، حکمت اور عشق سے آگے بڑھ کر لوگوں نے سیاست اور پروپیگنڈا کا کام بھی مجھ سے لینا شروع کیا۔ بعض ستم ظریفوں نے تو اس کوشش میں میری صورت ہی مسخ ڈالی۔ مگر اس زمانہ میں بھی میرے ایسے پرستار پیدا ہوئے جنہوں نے میری ظاہری اور معنوی خصوصیات کو باقی رکھا اور میرے دل کو تازہ خون پہنچاتے رہے۔ ان میں مشہور فانی، حسرت، اور جگر ہیں۔ جگر تو میرا وہ عاشق جانباز ہے جس نے میرے سوا کسی اور کے در پر جبہ سائی نہ کی۔ نئے معنی نیا انداز بخشا کہ نئے دور کے مادہ پرست لوگوں کے دلوں کے تار تک جھنجھنا اٹھے۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اس وقت ان پرستاروں کا ذکر نہیں کروں گی جو خدا کے فضل سے زندہ ہیں اور میری رگوں میں تازہ خون پہنچانے اور میری نوک پلک سنوارنے کا کام سرانجام دے رہے ہیں بہرحال اتنا تو آپ نے جان ہی لیا ہوگا کہ میں صدیوں سے اردو ادب کی جان اور اردو شاعری کے پرستاروں کی دل کی ملکہ ہوں اور اپنی ہر دلعزیزی دیکھتے ہوئے اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ مستقبل میں بھی میری پرستش ہوتی رہے گی اور اردو شاعری کی ملکہ کا تاج میرے ہی سر ہوگا تو اسے تعلّی یا مبالغہ نہ سمجھیے۔

(صالحہ عابد حسین سے استفادہ)

کرسی کی آپ بیتی

قصہ درد سناتی ہوں کہ مجبور ہوں میں
تو میری کہانی سنو اور میری زبانی سنو

میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی ہوں۔ پاؤں زخمی ہیں۔ بازو سلامت ہیں۔ ایک زمانہ تھا لوگ مجھے سلام کرتے تھے اور اب۔ ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

ہائے گذرا ہوا زمانہ یاد آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کشمیر کی سرسبز وادیاں میرا مسکن تھیں اور پہاڑوں کی ڈھلانیں میری سیر گاہ۔ . . . بہار کی ایک خوشگوار صبح کو میں نرم و نازک پودے کی صورت میں زمین سے پھوٹی۔ پتھریلی چٹانوں کے سینے کو چیرا۔ بادِ نسیم کے جھونکوں نے لوری دی۔ شبنم منہ دھلاتی رہی۔ ننھی ننھی بدلیوں نے تمازتِ آفتاب سے بچایا۔ کالی گھٹاؤں کے دامن میں پروان چڑھی ایسے خوشگوار ماحول میں جب میں نے سجدۂ شکر ادا کیا تو خدا نے مجھے سربلندی عطا فرمائی چند ہی دنوں میں قد و قامت میں تبدیلی آگئی۔ اب کمسنی کے باوجود میں تیز ہواؤں کو چھیڑتی۔ چشموں کے پانی میں چھیڑ چھاڑ ہوتی حتیٰ کہ میں کئی فٹ کی بلندی پر پہنچ گئی۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے باتیں کر رہی ہوں اس وقت ماحول کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سرسبز جھاڑیاں لہرا رہی تھیں۔ دور دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ برسات کا موسم کتنا اچھا تھا۔ کالی گھٹائیں جھوم جھوم کر اٹھتیں اور چھم چھم مینہ برساتیں میری رگوں میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی۔ میں خوشی میں جھوم جھوم جاتی۔ اپنی سہیلیوں سے سرگوشیاں کرتی اور شکر ادا کرتی کہ خدا نے مجھے کشمیرِ جنت نظیر میں پیدا کیا ہے۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی بے جان پڑے ہیں معلوم ہوا کہ انہیں کسی نے کاٹ گرایا ہے۔ اب نہ سہانی صبح تھی نہ مسرت افزا شام۔ . . . چنانچہ ایک صبح مجھ پر بھی وہی بیتی جو میرے ساتھیوں کے ساتھ بیت چکی تھی۔ مجھے سخت تکلیف ہوئی لیکن ظالم انسان

نے میرے گلے کو کاٹ دیا۔ ٹنڈ منڈ اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ خوبصورتی جاتی رہی آہا، چلتی رہی چیخ و پکار کی مگر بے سود رگیں کٹتی رہیں مگر کوئی امداد کو نہ پہنچا۔ سچ ہے کسی کا کوئی نہیں زمانے میں۔ پھر مجھے ایک گاڑی میں ڈال کر وطن سے دور پہنچا دیا گیا۔ وہی وطن جہاں بچپن گزرا۔ جوانی بیتی۔ جہاں دن کو سورج کی کرنوں اور ہواؤں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ چاندنی راتوں میں میٹھے میٹھے خواب دیکھے لیکن اب وہ ہمیشہ کے لئے آنکھ سے اوجھل . . . اب مجھے دریا کی سرکش موجوں کے سپرد کر دیا گیا۔ ہچکولے کھانے لگی مگر قسمت میں زندہ رہنا لکھا تھا۔ ساحل سے ٹکراتی موجِ حوادث کا سامنا کرتی پانی کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ چند دنوں کے بعد ایک آدمی نے مجھے پکڑ لیا اور ایک سٹور میں لے گیا۔ وہاں میری برادری کی اور بھی بہت سی جمع تھیں۔ امید تھی مصیبت کے دن ٹل جائیں گے مگر وہاں تو میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا پھر رندے سے صاف کیا گیا۔ ایک فرنیچر ہاؤس میں پہنچی۔ کاریگروں نے مجھے جوڑ کر ایک کرسی کے روپ میں ڈھال دیا۔ میری قسمت میں کسی کے گھر کی کرسی ہونا لکھا تھا۔ بید کا جامہ پہنا۔ پالش سے میک اپ کیا۔ اب مجھے شوروم میں جگہ ملی مگر سے

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں

رلدو محمد دین کی فرم کے کارندے پہنچے اور مجھے ٹرک میں ڈال کر سرکلر روڈ لاہور پہنچا دیا۔ لیکن دوسرے ہی دن یونیورسٹی گراؤنڈ میں لا پھینکا۔ اب میں کرسی صدارت تھی۔ کبھی کوئی گورنر بیٹھتا کبھی کوئی وزیر، کبھی کسی پارٹی کا صدر استعمال کرتا اور کبھی کوئی دولہا۔ چنانچہ مجھ ہرجائی کو دس ہزار داماد بنانا پڑا۔ میں نے اس پیشے سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ قسمت میں در در کی ٹھوکریں کھانا لکھا تھا۔ ایک دن جلسے میں اچانک گڑبڑ شروع ہو گئی۔ پہلے زبان چلی جوتیاں چلیں اور پھر کرسیاں چلنے لگیں ایک غنڈے نے مجھے پکڑا اور زمین پر دے مارا۔ بری طرح زخمی ہوئی۔ میرے مالک نے علاج کرا کے مجھے تندرست بنا دیا۔ مگر اب میری صورت بگڑ چکی تھی کوئی بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ آخر ایک دن نیلامی میں ایک پان فروش کی دکان پر پہنچی اب پبلک اور پان بکتے اور میں، گاہکوں کی کثرت نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ ایک دن اچانک لرزہ طاری ہوا۔

پاؤں میں لغزش آئی۔ دوسرے ہی لمحے زمین پر تھی۔ مالک اٹھا اور مجھے چھت پر ڈال دیا۔ دھوپ برداشت کی۔ بارش میں خراب ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ راوی میں سیلاب آیا۔ پانی کی بپھری ہوئی موجوں نے شہر کا رخ کیا۔ دکان بھی پانی کی زد میں آگئی۔ اور میں موجوں کے سینے پر بے مقصد چلنے لگی اب دریا کی موجیں مجھے بہائے ہوئے لیے جا رہی ہیں۔ ارد گرد کے سرسبز درخت نظر آ رہے ہیں۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئی ہیں ہائے وہ کتنا اچھا زمانہ تھا جب میں۔ مگر ؎

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ایک روپے کی آپ بیتی

؎ امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

لو میری کہانی سنو اور میری زبانی سنو

میں ایک پُرانا گھِسا ہوا روپیہ ہوں۔ میرے اوپر لکھے ہوئے حروف بالکل مدھم پڑھ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ انہیں پڑھنا بھی دشوار ہے۔ رنگ بدل چکا ہے۔ اب وہ چمک دمک نہیں رہی۔ کتنا اچھا زمانہ تھا۔ جب میں نیا نیا ٹیکسال سے باہر نکلا تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا کودتا تھا اور کتنی دلکش جھنکار پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اُس داستان پارینہ کو دہرانے سے کیا حاصل؟

ع کسے اب یاد ہے اک خواب دیکھا تھا جوانی میں

کچھ دِن ٹیکسال میں پڑا رہا۔ اس کے بعد مجھے خزانے میں پہنچا دیا گیا۔ قسمت میں دربدر ٹھوکریں کھانا لکھا تھا۔ لہٰذا ایک بنک میں جا پہنچا۔ کلرک نے مجھے میرے ساتھیوں کے ساتھ قطاروں میں کھڑا کر دیا۔ لوگ آتے مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور میں اپنے حسن اور چمک دمک پر اترانے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد خزانچی نے اٹھایا اور ایک پروفیسر کے حوالے کر دیا اُس نے مجھے ایک بیگ میں ڈال لیا۔ وہ بڑا خوش تھا کیونکہ چھ مہینے کے بعد تنخواہ ملی تھی۔ خیال تھا شاید کچھ دن آرام مل جائے گا مگر

ع اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اُس نے کوئی چیز خریدی اور پھر مجھے دکاندار کے حوالے کر دیا۔ وہاں

ایک گاہک آیا پہلے تو اُس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا پھر جیب میں ڈال لیا اور گھر جا کر بیوی بچوں کو بلا کر کہا۔ دیکھئے یہ ہے نیا روپیہ۔ چاند تارے والا روپیہ۔ اُس کی بیوی نے مجھے ایک بکس میں محفوظ کر دیا۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ ایک قرض خواہ آ پہنچا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس نے مجھے ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ وہاں میری برادری کے اور بھی بہت سے روپے پیسے آنے موجود تھے لیکن تھے سب پرانے۔ احساس برتری کی وجہ سے میں پھولا نہ سماتا تھا اور ان سے بات کرنا بھی توہین سمجھتا تھا۔ لیکن

ع سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

اِن کی صحبت راس نہ آئی۔ اور مجھے ایک حلوائی کے حوالے کر دیا گیا۔ غرض کیا کہوں میرے ساتھ کیا بیتی!۔ کئی ہاتھوں اور جیبوں میں گردش کرتا رہا۔ اور آوارہ گردی میں کئی سال گزر گئے لیکن راحت نصیب نہ ہوئی۔ آخر ایک دن ایک دیہاتی نے مجھے مٹی کے ایک برتن میں بند کر دیا۔ تاریک جگہ میں سخت گھٹن سی محسوس ہوتی تھی چیخا چلایا کہ مجھے حبس بے جا میں رکھا گیا ہے۔ لیکن کسی نے کان نہ دھرے۔ غریبوں کی کون سنتا ہے۔ تاریک جگہ میں صرف ساتھیوں کا سہارا تھا۔ وہ تسلی دیتے رہے کہ گھبراؤ نہیں۔ ابھی تو تم جوان ہو اور جب دم گھٹنے لگتا تو وہ ڈھارس بندھاتے

ے یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر

ہائے کتنے اچھے ساتھی تھے

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اس ماحول سے مانوس ہو چلا تھا لیکن بقول حالی "فرصت غم کو بھی ثبات نہیں" ایک روز اس دیہاتی کے لڑکے نے زمین کھود دی اور ہمیں باہر نکال دیا۔ اس دن وہ بڑا خوش تھا اور گنگناتا پھر رہا تھا "سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد" ہماری بُری حالت تھی۔ رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ صحت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے رگڑ رگڑ کر ہمیں صاف کیا گویا بقیہ حروف بھی مدھم پڑ گئے۔ مقدر میں چکر لکھے تھے چنانچہ اسی شہر میں پھر گردش کرنے لگے۔

ع اس بے وفا کا شہر تھا اور ہم تھے دوستو

کبھی کسی کی جیب میں کسی کی جیب میں۔ کئی دنوں تک رہین ستم ہائے روزگار رہا صحت بگڑنے لگی۔ اب تو لوگ ٹھوک بجا کر دیکھتے تھے بعض تو شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں عالی نسب نہیں ہوں یعنی جعلی ہوں۔ یہ سب مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کرتا رہا۔ آخر پھرتا پھراتا ایک دن تصویر محل سینما جا پہنچا اور زندگی کے چند دن اسی ماحول میں کاٹے۔ نورجہاں اور مہدی حسن کے گانے سُن کر مزا آ گیا اور کبھی کبھی تو موڈ میں آ کر ان کے ساتھ گنگنانے لگتا ہے۔

حال میرے دل کا تمام لکھ دے

وہاں سے ریزگاری میں ایک کالج سٹوڈنٹ نے حاصل کیا۔ اس نے ایک گائیڈ خریدی تاکہ کاغذ پھاڑ کر امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کرے۔ کتاب فروش نے مجھے خزانے میں پہنچا دیا اور پھر اسی پروفیسر کے بیگ میں جا رہا ہوں۔ پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئی ہیں کتنا اچھا زمانہ تھا۔ جب میں ٹکسال سے باہر نکلا تھا۔ وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے

ع آئے ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

زندگی کے دن جوں توں پورے کرتے ہیں۔

ع شمع ہر حال میں جلتی ہے سحر ہونے تک

لیکن میں اپنے حالات سے مایوس نہیں ہوں۔ کبھی تو ان دکھوں سے نجات ملے گی۔ فیض کے الفاظ میرے دِل کو تقویت دیتے ہیں۔

ع سحر قریب ہے دِل سے کہو نہ گھبرائے

آپ بیتی قربانی کے بکرے کی

میں اسی گلی میں رہتا ہوں۔ مجھے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ پہلے میں وادی کاغان کی ہری بھری شاداب چراگاہوں میں رہائش پذیر تھا جب پیارے وطن کی یاد آتی ہے، تو دل میں اک ہوک اُٹھتی ہے اور اس کے ساتھ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ اب تو لاہور کی فضا ہے اور یہ خاکسار ہے۔ اپنا ٹھکانہ مصری شاہ کی اس دھول اڑاتی گلی کے نیم کے درختوں تلے ہے۔ ماسٹر فیروز دین درزی مجھے یہاں لایا ہے۔ وہ میری بڑی خبر گیری کرتا ہے اور سارا دن مجھے گلی میں نیم کے پیڑ تلے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا ہے۔

ماسٹر فیروز دین قربانی کا قائل تو ہے مگر ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ سے اس کا خیال تھا کہ اب کی بار قربانی دینے کی بجائے محض قربانی کا گوشت کھا کر گزارہ کیا جائے مگر اس کی جھگڑالو بیوی نے اعلان کیا اگر اس دفعہ قربانی نہ دی گئی تو ناک کٹ جائے گی۔ اور وہ مصری شاہ کے دو موریہ پل سے چھلانگ لگا کر اپنی دونوں ٹانگیں تڑوا لے گی ماسٹر بے چارہ جو بیوی سے دبتا ہے بے حد پریشان ہو گیا۔ بارو ناچار اپنے ایک دوست سے سو روپے قرض لیے اور دلی دروازے کے باہر سے مجھے خرید لیا۔

جب پہلے پہل یہاں لایا گیا تو خیال تھا محض تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے لاہور لایا جا رہا ہے دلی دروازے کے باہر والے باغ میں رات بھر ہم اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمارا مالک ہمیں لاہور کی ماڈرن زندگی سے روشناس کرانے کے لیے یہاں لایا ہے مگر دوسرے دن جب ہماری سودا بازی

ہونے لگی اور لوگوں نے گز گز بھر کے ہاتھ ہماری پسلیوں میں گھسیڑ گھسیڑ کر ہمیں ٹٹولنا شروع کیا تو سارے ریوڑ میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ہم ایک ایک کر کے جدا ہونے لگے۔ اور میں سوچنے لگا آج وہ کل ہماری باری ہے۔

اس محلے کے لونڈے بڑے شرارتی ہیں۔ مجھے بہت کم آرام کرنے دیتے ہیں کوئی آ کر زنجیر کھینچتا ہے۔ کوئی دال کی کڑاہی دُور رکھ دیتا ہے کوئی ناک میں چھڑی گھسانے کی کوشش کرتا ہے تو کوئی مالک کی نظر بچا کر میرا کان کھینچنا شروع کر دیتا ہے۔ جو لوگ قربانی نہیں دے رہے وہ مجھے صبح شام گھُورتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی پسند کا گوشت منتخب کر لیا ہے۔ مثلاً مولوی قدرت اللہ کی خواہش ہے کہ اسے میری گردن کا گوشت ملے۔ رحمت علی قلی نے میرے سینے پر نظر رکھ چھوڑی ہے۔

جس آدمی کی نگاہوں سے میرے بدن پر لرزا طاری ہو جاتا ہے وہ اس محلے کا قصّاب ہے وہ بھی ہر روز گلی میں سے گزرتے ہوئے مجھے گھُور گھُور کر دیکھتا ہے۔ میری ماں بیچاری کب تک میری خیر منائے گی۔

بقر عید سے ایک روز پہلے میرا مالک میرے اوپر گوٹہ لگی کیسری چنریا ڈال گردن موتیے کے پھولوں سے لاد کر بھاٹی دروازے کی سیر کروائے گا۔ وہاں کئی دوستوں سے ملاقات ہو گی کسی کی پسلیوں پر مالک کا نام مہندی سے لکھا ہو گا۔ کسی پر "عید مبارک" کسی پر "پاکستان زندہ باد" لکھا ہو گا۔

پرسوں عید ہے۔ بچے خوش ہو رہے ہیں ڈاکٹروں اور قصائیوں کے وارے نیارے ہیں۔ میرا مالک ہر روز صبح کو باغ میں سیر کروانے لے جاتا ہے جگہ جگہ اشتہار لگے ہوئے دیکھتا ہوں۔ چند ایک سرخیاں ملاحظہ ہوں۔

اپنی قربانی کی کھالیں یتیم خانہ کو دیں

آپ کی کھال قوم کی امانت ہے

"کھال کہاں لیے جا رہے ہیں۔ مسجد میں جمع کرا دیجیے"۔

ان سرخیوں سے واضح نہیں ہوتا کہ بکروں کو مخاطب کیا گیا ہے یا مالکوں کو مجھے اپنی کھال کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میری کھال یتیم خانے والوں کو دی جائے۔ اب جبکہ زندگی کے چند آخری ایام لاہور کے اس محلے کی اداس گلی میں بسر کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی محبوبہ پیارے پیارے سینگوں اور نیلی آنکھوں والی بکری یاد آتی ہے۔ ہماری آخری ملاقات وادی کاغان کے ایک پہاڑی چشمے پر ہوئی تھی۔ ہم کتنی دیر تک وہاں پیاری پیاری باتیں کرتے ، اور گھاس چرتے رہے تھے۔ اگلے ماہ ہماری شادی ہونے والی تھی۔ ہم نے شادی کے بعد پہاڑ کی دوسری جانب والی وادی میں جا کر "ہنی مون" منانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ مگر دوسرے روز ہمیں ٹرکوں میں لاد کر شہر کی منڈی میں لے جایا گیا وہاں سے یہاں پہنچا دیا گیا۔ خدا جانے میری بکری جان کس حال میں ہو گی۔ یقیناً میرے بعد پھر وہ پرانا پاپی کالی داڑھی والا کاغان بکرا ڈورے ڈالے گا۔ ہائے اس تصور سے دل پر چھریاں چلنے لگتی ہیں۔ لوگ ہمیں جانور خیال کرتے ہیں مگر شاید انہیں معلوم نہیں کہ ہمارے سینے میں بھی دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے

اچھا بکری جان! الوداع۔ اس جنم کا میل ملاپ تو ختم ہوا۔ شاید اگلے جنم میں ملاقات ہو۔ شامی قصائی مجھے گھورتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا ہے۔

(اے حمید کے ایک مضمون سے استفادہ)

تتلی کی سرگزشت

میں چھوٹی سی اک تتلی ہوں

بعض لوگ مجھے تیتری بھی کہتے ہیں لیکن بقول شیکپیئر نام میں کیا رکھا ہے۔ میری زندگی خوشبوؤں اور مسرتوں سے پُر ہے۔ میرے نزدیک زندگی ایک جشن ہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ میں زندگی کا سارا زمانہ کھیل کود اور ہنسی مذاق میں گزار دیتی ہوں۔ انسان اکثر میری بے فکری کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔ ذرا میرے پروں کو تو دیکھیے! ان کو دیکھ کر کیسی حسرت ہوتی ہے۔ گویا آسمان پر چمکنے والی دھنک کے سارے رنگ ان میں موجود ہیں۔ قرمزی اور سیاہ، زرد اور سُرخ — میرے لیے سنہری یا رُوپہلی زیورات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ نہ مجھے بھڑکیلے لباس کی حاجت ہے — میرے پروں پر سونے اور چاندی کی چمک موجود ہے۔ مجھے قدرت نے سب سے زیادہ نازک اور چمکدار سلک کا لباس پہنایا ہے۔ جو آفتاب کی شعاعوں میں چمکتا ہے۔ قدرت کی ان نوازشات پر میں خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں۔

برسات کی ہلکی ہلکی پھوار میں اور موسم بہار کی رنگینیوں میں میرا دل خوشی اور شادمانی سے جھُوم جھُوم اُٹھتا ہے۔ جوش و مسرت کے عالم میں مَیں کبھی گلاب کے پھولوں پر منڈلاتی ہوں اور کبھی کسی خوشبودار پھول کے گرد چکر کاٹتی نظر آتی ہوں۔ رس دار پھولوں سے رس چوس لیتی ہوں اور شبنم کے قطرے بھی جذب کر لیتی ہوں۔ مرجھا جانے والے پھُولوں پر مجھے بے انتہا

صدمہ ہوتا ہے۔ میرے نرم و نازک پروں اور ہلکے پھلکے جسم سے پھولوں یا پودوں کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا بلکہ میرے وجود سے باغ کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے اور دیکھنے والے مجھے دیکھ کر مارے خوشی کے اچھل پڑتے ہیں۔ میں پہاڑوں اور وادیوں میں جنگلوں اور سبزہ زاروں میں اڑتی پھرتی ہوں۔ میں ایک پودے سے دوسرے پودے پر اور ایک پھول سے دوسرے پھول پر جا پہونچتی ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے جھومتے ہوئے پھول اونچے اونچے درخت، گاتے ہوئے پرندوں اور چمکتی ہوئی نہریں ہوتی ہیں۔ اور میں ان مناظر سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ میں آرام سے پر پھیلا کر لیٹ جاتی ہوں اور پھر اپنے پروں کے رنگوں کو گننا شروع کر دیتی ہوں۔ بس اس طرح زندگی کی گھڑیاں گزارتی رہتی ہوں۔

دنیا میں برا وقت سب کے لیے آ ... چنانچہ کبھی کبھی مجھے بھی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اچانک شریر بچوں کی کوئی ٹولی آ پہونچتی اور وہ اپنی ٹوپیاں ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پیچھے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں۔ ہر خوبصورت چیز بچوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ میرے خوبصورت پروں کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتے ہیں اور مجھے پکڑنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔

سچ مچ کی ذرا پری تو دیکھو
ننھی سی یہ تیتری تو دیکھو
ہے نقش پروں پہ کیا سجیلے
اودے نارنجی کالے پیلے

پیاری دِل کش ہے صورت اس کی
اس واسطے ہے ضرورت اس کی

میں نے سُنا ہے کہ بعض شریر بچے مختلف قسم کی تتلیوں کو جمع کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے میں ایسے بچوں کے قبضے میں نہیں آتی۔ میں بڑی تیز رفتاری سے اُڑتی ہوئی ان کے قریب سے گزر جاتی ہوں یا ان کے سر پر منڈلاتی رہتی ہوں اور وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

بچوں ہی کو نہیں میں سب کو ہی اچھی معلوم ہوتی ہوں۔ شاعر میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں ؎

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگ پریدہ ہے
بوئے چکیدہ ہے
آغوشِ گل میں یا کوئی نقش دمیدہ ہے
عکس کشیدہ ہے
موجِ شراب کی اسے اک نقرئی کہوں
ننھی پری کہوں
یا موسم بہار کی اک تیتری کہوں
جو آرمیدہ ہے

مصوّر میری تصویریں بنا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور نیچر سے دلچسپی رکھنے والے میرے جسم کی بناوٹ اور میرے پروں کی رنگ آمیزی کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ غرض یہ کہ ایک طرف تو میں ہر وقت خوشی کے راگ گاتی رہتی ہوں اور دوسری طرف خود میری ہستی دوسروں کے لیے خوشی کا باعث بنی رہتی ہے۔ کون ہے جو نرم و نازک پھولوں کے گرد یا لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں پر رنگ برنگ تتلیوں کو اڑتا دیکھ کر خوش نہ ہوتا ہو اور مارے خوشی کے گنگنانے نہ لگتا ہو۔

باب ۱۸
خط و عرضی

خطوط اور ان کی اہمیت

ادب میں سینکڑوں دلچسپیاں ہیں۔ اس کی بے شمار ادائیں ہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوط میں جو جادو ہے، بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو، وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو، غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ صرف سادگی ہی ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور زمانے میں زوال نہیں بشرطیکہ اس میں صداقت ہو؛ اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ یہ ہمارے ضمیر میں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے جھوٹ بولے۔ یہی وہ فطری تقاضا ہے کہ ہم بعض اوقات ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سے دلکش نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اٹھا کر الگ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری ہر تصنیف و تالیف، ہماری ہر علمی و ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے غیروں کے لئے ہے اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گی۔ اس لیے مصلحت وقت کا بھی خیال ہوتا ہے، عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے، تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں۔ خیال کو صاف صاف لکھنے کی بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے عزیز دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ وہ ہر مسئلے اور ہر شے کے متعلق جیسا کہ اس کا خیال

ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے ۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ نہ دوسروں سے چوکتا نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے ۔ اس وقت نہ اسے خوف ہوتا ہے نہ نکتہ چیں کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے ۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے، اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے ، نہیں بلکہ اپنا دل وہ کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے ۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو ، جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو ، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہو گی ؟"

مولوی عبدالحق مرحوم (بابائے اردو)

"خط نگاری تو بذات خود ایک بڑا فن ہے اور اس میں کامیاب وہی شخص ہو سکتا ہے جو قدرت کی طرف سے اس فن کا فیضان لے کر آیا ہے ۔ خط نگاری کے فن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب سے آسان فن ہے جو اس شخص کے لئے سہل الحصول ہے جو اس کا قصد کرے ، مگر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہی آسان ترین فن نازک ترین فن بھی ہے کیونکہ اس میں فنی نزاکتوں کی نمود کچھ اس طرح کی مشکل شے ہے جیسے کوئی شے عدم سے وجود حاصل کرتی ہے —— ایک نہایت ہی اہم بات خط نگاری کے سلسلے میں یہ ہے کہ ہر اچھے خط کو وہ مقصد ضرور پورا کرنا چاہیے جو اس کے لیے اصلاً محرک ہوا ہے ، یعنی خط نگار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ایسے انداز میں کہے کہ مکتوب الیہ کو پیغام کا قطعی علم ہو جائے۔"

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

"کوئی خط مکمل طور پر حسین تبھی بنتا ہے جب اس میں ملاقات کی جملہ صفات اور اس کے جملہ اثرات موجود ہوں ۔"

"اچھے خطوں کے سلسلے میں بڑی بنیادی چیز ان کی لطافت ہے۔"
(سید عبداللہ)

"بہترین خط وہ ہوتے ہیں جو پڑھ کے پھاڑ دیے جاتے ہیں۔"
(رشید احمد صدیقی)

خط کی قسمیں

خط تین قسم کے ہوتے ہیں : (۱) نجی خطوط (۲) کاروباری خطوط (۳) سرکاری خطوط۔

۱۔ نجی خطوط ان میں عزیزوں، رشتے داروں، اجنبیوں، دوستوں، استادوں وغیرہ کے نام خطوط شامل ہیں۔ دعوتی رقعات بھی نجی خطوط میں شمار کیے جاتے ہیں۔

۲۔ کاروباری خطوط یہ خطوط کارخانہ داروں، دوکانداروں، کاروباری اداروں، گاہکوں، اخبارات کے ایڈیٹروں اور پبلک اداروں کے نام لکھے جاتے ہیں۔ کاروباری خطوط خرید و فروخت اور لین دین کے متعلق ہوتے ہیں۔

۳۔ سرکاری خطوط ان خطوط میں افسروں کے نام درخواستیں، سرکاری افسروں کے درمیان دفتری کام سے متعلق خط و کتابت، رپورٹ، حکم نامے اور سمن وغیرہ شامل ہیں۔

خط کے حصّے

خط کے حسب ذیل حصّے کیے جا سکتے ہیں :

(۱) خط لکھنے والے کا پتہ (۲) تاریخ (۳) القاب (۴) آداب (۵) مضمون خط

(۶) خاتمہ (۷) نام و پتہ مکتوب الیہ۔

۱۔ خط لکھنے والے کا پتہ خط کی پیشانی پر دائیں طرف خط لکھنے والا (جسے کاتب یا فرستندہ بھی کہتے ہیں) اپنا مختصر سا پتہ لکھتا ہے۔ گاؤں کی صورت میں گاؤں کا نام، قصبے کی صورت میں محلہ اور قصبے کا نام اور شہر کی صورت میں مکان، محلہ یا گلی کا نام وغیرہ دیا جاتا ہے۔

۲۔ تاریخ مقام روانگی سے نیچے تاریخ لکھی جاتی ہے۔

۳۔ القاب تاریخ لکھنے کے بعد مکتوب الیہ کے مرتبے کے لحاظ سے القاب لکھا جاتا ہے۔ رشتہ، تعلق، مرتبہ اور عمر کے لحاظ سے القاب مختلف ہوتے ہیں۔

۴۔ آداب القاب کے ساتھ ہی آداب لکھے جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں مبالغہ آمیز الفاظ لکھے جاتے تھے، لیکن اب وہ تمام چیزیں متروک ہو چکی ہیں۔ رسمی جملے آج کل پسند نہیں کیے جاتے۔

۵۔ مضمون خط "بولتے ہوئے خط سب سے عمدہ ہوتے ہیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح روزمرہ بات چیت کی جاتی ہے ایسی ہی سادگی اور بے تکلفی خط کی عبارت میں ہونی چاہیے۔

۶۔ خاتمہ مطلب لکھنے کے بعد دوسری سطر کے بائیں طرف القاب کے مطابق کوئی جملہ لکھا جاتا ہے۔ مثلاً خیر خواہ، دعا گو، فرمانبردار، مخلص، نیازمند، نیاز کیش وغیرہ اور پھر اس کے نیچے لکھنے والے کا نام دیا جاتا ہے۔

۷۔ مکتوب الیہ کا پتہ لفافے یا کارڈ میں مخصوص جگہ پر لکھا جاتا ہے۔ پہلے مکتوب الیہ کا نام، اس کے بعد مکان نمبر اور کوچہ، محلہ وغیرہ اور آخری سطر میں مقام لکھا جاتا ہے۔ مثلاً

ریاض حسین رضوی
سادات منزل بلاک ۳۰
ڈیرہ غازی خاں

بعض اوقات اس سے پہلے بشرفِ نظر، بخدمت اقدس، بخدمت جناب وغیرہ بھی لکھ دیتے ہیں۔

خط کا خاکہ

۱۴۰ - جناح کالونی،
لائل پور
۲۸ر فروری ۱۹۷۳ء

پیارے بھائی جان!

آداب کے بعد عرض ہے کہ ....

نفسِ مضمون

....

آپ کا تابع فرمان
جاوید اقبال

بخدمت اقدس
ملک عبدالرشید صاحب
۱۳ - چوبرجی کوارٹرز، لاہور

القاب و آداب وغیرہ

مکتوب الیہ	القاب و آداب	اختتام
والد	قبلہ والد صاحب ۔ محترم بزرگوار والد صاحب، مکرم و معظم والد صاحب، ابا جان! جناب والد صاحب دام ظلہ۔ آداب ۔ تسلیم	آپ کا فرزند آپ کا تابع فرمان آپ کا فرمانبردار بیٹا
والدہ	پیاری امّی، محترمہ والدہ صاحبہ، آداب، تسلیم، نیاز	آپ کا پیارا بیٹا۔
دادی، نانی خالہ، چچی	مکرمہ و محترمہ ...... صاحبہ، آداب	آپ کا ......
بہن	مکرمہ ہمشیرہ صاحبہ، پیاری بہن، عزیزہ، آپا جان، پیاری باجی وغیرہ۔	آپ کا خادم تمہارا بھائی۔
بھائی	برادرِ محترم، بھائی جان، اخی مکرم، برادر عزیز، برادرِ مکرم، السلام علیکم۔	تمہارا بھائی آپ کا خادم
چچا	محترمی چچا جان، عم محترم، السلام علیکم، تسلیم،	آپ کا فرمانبردار آپ کا بھتیجا۔
اُستاد	جناب قبلہ استاد صاحب، مکرمی پروفیسر صاحب، استاذی المعظم، مکرمی جناب۔ سلام و نیاز، السلام علیکم، آداب شاگردانہ۔	احقر، خادم، آپ کا تابع فرمان فرمانبردار۔ نیازمند، خاکسار
شوہر	میرے سرتاج سلامت باد، مونس و دمساز۔ سلام شوق سلام محبت۔	آپ کی کنیز، غمگسار آپ کی رفیقۂ حیات
بیوی	جان من سلامت باد، میری ہمدم و ہمراز، السلام علیکم	خیر اندیش طالب خیریت

بیٹا	برخوردار نورچشم، عزیزم، راحت جان، دعائے ترقی و درجات کے بعد۔	دعاگو۔
بیٹی	عزیزی، پیاری بیٹی، دختر نیک اختر، دعائے عمر درازی کے بعد واضح ہو۔	دعاگو
دوست	پیارے دوست، میرے شفیق۔ محبی۔ محب صادق۔ جناب من۔ محترمی .... صاحب۔ کرم فرمائے من۔ مکرم بندہ۔ السلام علیکم۔ ہمدم و مونس۔	آپ کا مخلص محب صادق خیر طلب خیر اندیش
سہیلی	پیاری سہیلی، السلام علیکم، جناب من، مکرم بندہ، مکرمی، السلام علیکم، تسلیم۔	آپ کی سہیلی
اجنبی	جناب ایڈیٹر صاحب، جناب مینجر صاحب، مکرمی جناب، محترم ڈاکٹر صاحب، تسلیم، السلام علیکم	نیازکیش، نیازمند خیرخواہ، نیازمند خیراندیش۔
سرکاری افسر	بحضور فیض گنجور جناب، بخدمت جناب، بخدمت عالی جناب۔ عالی جاہ۔	کمترین، فدوی خاکسار۔

خطانگاری کے متعلق چند ضروری باتیں

سب سے پہلے تو اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیجیے کہ خط لکھنا زبانِ قلم سے باتیں کرنا ہے۔ اگر آپ کا کوئی دوست یا عزیز آپ سے باتیں کرتے وقت موٹے موٹے لفظ بول کر اپنی علمیت جتائے تو آپ کو یقیناً ناگوار گزرے گا۔ اسی طرح خط لکھتے وقت تصنع، بناوٹ اور ثقیل الفاظ کا استعمال معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے

خط میں چھوٹے چھوٹے جملے اور آسان الفاظ استعمال کئے جانے چاہئیں۔ نیز مندرجہ ذیل باتوں کا بھی خاص خیال رکھا جائے :

۱۔ شروع میں مقام اور تاریخ لکھنا نہ بھولیے۔

۲۔ القاب کے الفاظ مختصر، عام فہم اور مکتوب الیہ کے مناسب حال ہوں۔ مثلاً قبلہ والد صاحب۔ برادر محترم۔ پیاری بہن وغیرہ۔ بزرگوں کو خط لکھ رہے ہوں تو ایسے الفاظ استعمال کریں جن سے تعظیم و تکریم ظاہر ہو۔

۳۔ رسمیہ جملوں سے حتی الوسع پرہیز کیا جائے۔ مثلاً السلام علیکم کے بعد واضح ہو کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت نیک چاہتا ہوں، صورت احوال یہ ہے کہ وغیرہ۔ صرف آداب کے بعد نفس مضمون شروع کر دیجئے۔ خط کا آغاز اس قسم کے مختصر جملوں سے کیا جا سکتا ہے:

بزرگوں کے لیے :

۱۔ نوازش نامہ نے سرفراز فرمایا۔ یاد آوری کا مؤدبانہ شکریہ بجا لاتا ہوں۔

۲۔ عنایت نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۳۔ الطاف نامہ باعث افتخار ہوا۔

۴۔ عرصے سے جناب کے گرامی نامہ نے شرف نہیں بخشا۔

۵۔ گرامی نامہ صادر ہوا۔

برابر والوں کے لیے :

۱۔ الطاف نامہ موصول ہونے سے وہ خوشی ہوئی جو مخلص دوست کی ملاقات سے ہوتی ہے۔

۲۔ محبت نامہ پہنچا، بے حد خوشی ہوئی ہے۔

۳۔ رقیمۂ نیاز نظر سے گزرا ہوگا۔

چھوٹوں کے لیے :

۱. راحت نامہ ملا، دل کو فرحت ہوئی۔

۲. تمہاری چٹھی ملی، دل کو تسکین ہوئی۔

۳. خط میں موقع محل کے مطابق متانت، سنجیدگی اور شوخی سے کام لینا چاہیے۔ رنج کی بات کرتے ہوئے اسی قسم کا لہجہ اختیار کرنا چاہیے۔ خوشی کی بات لکھتے وقت شوخی سے کام لے سکتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہ لکھیے جس سے مکتوب الیہ کی تضحیک یا دل شکنی ہو۔

۴. "خط میں خاص اسالیب اور موزوں القاب و آداب و تخاطب و کلام کی مختلف صورتوں کا لحاظ ہی خط کو ممتاز بناتا ہے بشرطیکہ ان میں سادگی اور خلوص برتا جائے"۔

۵. "لمبا خط لمبی غزل کی طرح بے کیف ہوتا ہے"۔

نمونے کے خطوط

۱۔ اپنے دوست کو خط لکھیے جس میں کالج کے کسی مباحثے یا ادبی جلسے کی کارروائی تحریر کیجیے۔

اسلامیہ کالج لاہور

۱۰ر جنوری ۱۹۸۶ء

پیارے شوکت ! السلام علیکم۔

محبت نامہ ملا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ معذرت خواہ ہوں کہ مصروفیات کی وجہ سے بروقت جواب نہ دے سکا۔ آپ نے کالج کی سرگرمیوں کے متعلق استفسار کیا ہے تو عرض ہے کہ آج کل بڑی گہما گہمی ہے۔ سیکنڈری بورڈ کے میچ ہو رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری ٹیم نے کرکٹ فائنل جیت لیا ہے۔ ہاکی میں ایک گول سے ہار گئے ہیں۔ پرسوں شام کالج ہال میں ایک دلچسپ مباحثہ منعقد ہوا جس کی کارروائی سنانا چاہتا ہوں۔ اس مباحثہ کا موضوع تھا "اس ایوان کی رائے میں جدید دور کے اخلاقی انحطاط کی ذمہ داری مردوں کی نسبت عورتوں پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔" اس مباحثے میں سولہ مقررین نے شرکت کی۔

قرارداد کو سب سے پہلے شاہباز بخت نے ایوان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ افسوس کی بات ہے کہ ایک عالم گیر سچائی کے لیے ہم کو دلائل و براہین کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ بے شک ہم مرد کو کلی طور پر اخلاقی انحطاط کی ذمہ داری سے نہیں بچا سکتے لیکن شہادتیں ایسی مل جاتی ہیں کہ ہمیں عورت زیادہ قصوروار نظر آتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج کی دوشیزہ کے لباس کو دیکھ کر کچھ ایسی کیفیت ہو جاتی ہے :

تیرے لباس کی چستی کو دیکھ کر دل میں
برہنگی کی تمنا حرام ہوتی ہے

قائد ایوان کی سلجھی ہوئی تقریر کے بعد قائد حزب اختلاف مظہر بخاری قرارداد کو غلط ثابت کرنے کے لیے آئے اور کہا کہ حضرت آدم کو ممنوعہ پھل کھانے پر خدا نے صرف ان کو سزا دی تھی۔ اگر عورتیں ہٹلر اور شاہ فاروق کے زوال کا باعث بنیں تو وہ ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے جنہوں نے ملک و قوم کے لیے بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ مرد خود عورت کو گناہ پر اکساتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج کے علی کاظم نے کہا کہ قائد حزب مخالف مرد ہو کر مردوں کی مخالفت کر رہے ہیں، شاید اس کی کوئی خاص وجہ ہو۔ اس پر ان کا گرم جوش تالیوں سے استقبال ہوا۔ سعادت اللہ نے مخالفت میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ سائنسی ترقی کے باوجود انسان اخلاقی طور پر اندھیرے میں جا گرا ہے۔ عورت جو کچھ بھی کرتی ہے اپنے حاکم مرد کو خوش کرنے کے لیے کرتی ہے، اس لیے مورد الزام مرد ہے۔ لا کالج کے نور احمد نے کہا کہ ہر برائی کے پیچھے ہمیں مرد کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ وحید اطہر اور بشیر پرویز نے بھی حاضرین کو خوب متاثر کیا۔

فاطمہ جناح کالج کی مس یاسمین لودھی نے حق میں بولتے ہوئے کہا کہ سینما کے اشتہاروں میں زیادہ تر تصویریں عورتوں کی ہوتی ہیں جو جاذبیت کا سبب بنتی ہیں۔

اس مباحثے کی صدارت کالج یونین کے صدر انیس عالم نے کی۔ سیکریٹری کے فرائض سلیم بٹ نے سرانجام دیئے۔ منصفین شیر محمد، اختر، ارشاد الحسن اور عابد حسن منٹو کے فیصلے کے مطابق پہلا انعام سعادت اللہ، دوسرا انعام علی کاظم اور تیسرا نور احمد اور انعام خصوصی مس یاسمین لودھی کو ملا۔ ٹرافی گورنمنٹ کالج نے جیتی۔ حاضرین نے اس قرارداد کو بھاری اکثریت سے منظور کر لیا۔

ہمارے کالج میں عنقریب ایک ڈراما سٹیج کیا جائے گا۔ اگر آپ آسکیں تو خوب

لطف رہے گا۔ والد صاحب کو میری طرف سے سلام کہیے گا۔

مخلص

اشرف ندیم

۲۔ اپنے چھوٹے بھائی کے نام خط تحریر کیجیے جس میں ذوق شوق سے پڑھنے کی تلقین کی جائے۔

چک عبدالخالق

جہلم

۱۰ر جنوری ۱۹۸۶ء

برادر عزیز! سلام مسنون۔

کئی دنوں سے تمہارے خط کا انتظار ہے۔ آخر یہ تساہل اور تغافل کیوں؟ دریں حالات تمہاری مستعدی اور انداز فکر کی نسبت رائے قائم کرنا چنداں دشوار نہیں۔

اگلے روز کالج کے ارباب بست و کشاد کی جانب سے تمہارے تعلیمی نتائج کی رپورٹ بھی پہنچی۔ اسلامیات کے سواتم ہر مضمون میں فیل ہو۔ اُردو ادب کا مزاج شناس ہونے کا بھی تمہیں دعویٰ تھا مگر یہ دعویٰ بھی باطل قرار پایا۔

نوجوانی میں ہر نوجوان کو اپنی علمی لیاقت اور دیگر صلاحیتوں کے متعلق غلط فہمی ہوتی ہے۔ ان نتائج سے تمہارے لیل و نہار، تمہاری سہل انگاری اور تمہاری "شبانہ روز محنت" طشت ازبام ہو چکی ہے۔

عزیز من! تم اس وقت ایک تعمیری اور آزمائشی دور سے گزر رہے ہو۔ یہ پامال اور مصدقہ حقیقت ہرگز فراموش نہ کرو کہ آدمی اپنی زندگی کا آپ معمار ہوتا ہے۔ ؎

جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

ہم تمام تمہارے مستقبل کو تابناک اور درخشندہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ والدین نے بہت سی آرزوئیں تمہاری ذات سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ ان امنگوں کو پروان چڑھانا تمہارا کام ہے۔

صدق دل سے کی ہوئی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی ۔ ہر لحظہ اپنی توجہ کو تعلیمی مشاغل پر مرکوز رکھو ۔ تضیع اوقات ناقابل معافی خطا ہوتی ہے ۔ تفریحی مشاغل میں اعتدال برتنے کی ضرورت ہے ۔ لکھنے پڑھنے ، سونے جاگنے اور کھیل تفریح کے اوقات مقرر ہونے چاہئیں ۔ مجھے یقین ہے کہ سالانہ امتحان تک تم اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر لوگے ۔

اگر تم بڑے آدمیوں کی زندگی کا تجزیہ کرو تو یہ حقیقت نکھر کر تمہارے سامنے آجائے گی کہ انہوں نے زندۂ جاوید ہونے کے لئے ان تھک محنت کی ۔ کوئی آدمی ہمت و محنت کے بغیر عظمت و شہرت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا ۔ یہی اصول فطرت ہے ؎

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

تمہارا بھائی

نسیم تقی جعفری

۳ ۔ اخبار کے مدیر کے نام خط لکھیے جس میں اخبار میں فلموں کے عریاں اشتہار چھاپنے کے بارے میں اظہار خیال کیا جاتے ۔

کمرۂ امتحان

. . . .

۲۶ مئی ۱۹۵۵ء

مدیر محترم روزنامہ " مشرق " لاہور

جناب عالی ! کئی روز سے آپ کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں ، آج تکمیل ہو رہی ہے ۔ امید ہے کہ عدم فرصتی کے باوجود ان پر غور فرمائیں گے ۔

مکرمی ! آج ہمارا پیارا ملک پاکستان جن نازک حالات سے گزر رہا ہے ہر باشعور شخص کو اس کا احساس ہے ۔ ہم پر یکے بعد دیگرے جن آفات کا نزول ہوا ہے ہر شہری ان سے متاثر ہے ۔ قوم کو اس زیاں کا احساس ہے جو ہماری غفلت شعاری

کے باعث سقوط مشرقی پاکستان کی سورت میں درپیش آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ احساس زیاں ہی کسی زیاں کی تلافی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ امر خوش آئند ہے کہ قوم میں اس احساس کا فقدان نہیں البتہ ملکی اخبارات کا فرض ہے کہ وہ قوم کے اس احساس کو زندہ رکھیں۔ لیکن مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ کا جریدہ قوم کو خواب غفلت سے جگانے کی بجائے اسے تھپکیاں دے دے کر سلانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ میری مراد آپ کے اخبار میں چھپنے والے فلموں کے انتہائی فحش اور عریاں اشتہارات سے ہے۔ یہ عریاں اشتہارات قوم کو اپنے زخموں کا مداوا کرنے پر غور و فکر کے لیے آمادہ تو نہیں کر سکتے، البتہ اس کے نتیجے میں قوم کے افراد اپنے حقیقی مسائل سے ناواقف رہتے ہوئے کچھ اور طرح سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ان کی سوچ کے دھارے اسی رُخ پر چل دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی قوم اس فحاشی کے افیون سے یوں بدمست ہو جاتی ہے کہ اسے ہوش میں لانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اخبار گھر کے تمام افراد پڑھتے ہیں۔ کیا آپ گھریلو خواتین اور بچوں تک کو ان اخلاق کش کاموں میں شامل ہونے کی بالواسطہ ترغیب نہیں دیتے؟ خدارا غور تو کیجیے کہ فحش فلمی اشتہارات قوم کے اخلاق کو کس طرح دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

کیا میں توقع رکھوں کہ آپ اپنے جریدے کو بیہودگیوں کی اس اخلاق کش سازش کا آلۂ کار نہیں بننے دیں گے؟

والسلام

رول نمبر

۴ - اپنے دوست کے نام خط لکھیے اور اس سے پوچھیے کہ پرچے کیسے ہوئے ہیں۔ نیز اسے مشورہ دیجیے کہ وہ تعلیم جاری رکھے۔

....

۱۸ اپریل ۱۹۸۵ء

پیارے جاوید! السلام علیکم۔

کئی دنوں سے تمہاری یاد دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ آج اس یاد نے الفاظ کا روپ دھار لیا۔ آج آپ کی عافیت طلبی نے کچھ زیادہ بے قرار کر دیا۔

اس سے قبل میں قصداً خاموش رہا کہ آپ امتحان سالانہ میں مصروف ہوں گے اور میں آپ کے تعلیمی انہماک میں خلل انداز ہونا مصلحت وقت کے منافی سمجھتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ امتحان کے دنوں میں دنیا و مافیہا کو بھول کر اپنی توجہ متعلقہ اسباق پر مرکوز رکھتے ہیں۔ آپ نے جس تواتر اور باقاعدگی کو عہد طالب علمی میں مدنظر رکھا ہے وہ قابل ستائش ہے اور بنا بریں مجھے یقین ہے کہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ ایک صبح زرنگار طلوع ہونے والی ہے۔ متوقع ہوں کہ آپ مضمون وار کامیابی کے روشن امکانات سے مطلع کریں تاکہ دل کو اطمینان ہو۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟ میری دلی خواہش ہے کہ تم تعلیم جاری رکھو۔ تمہاری ذہانت و فطانت کا اقتضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرو۔ ہر چند کہ مالی دشواریاں تمہاری راہ میں حائل ہیں مگر جوں توں مزید دو سال بھی گزر جائیں گے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد نئی منزل متعین کی جائے گی۔ ادھوری تعلیم کس کام کی۔ ہمت سے کام لو اور اپنی منزل کی جانب غیر متزلزل ایمان و ایقان سے قدم بڑھائے جاؤ۔ قادر مطلق پر بھروسہ رکھو۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔

مجھے اپنے عزائم اور امنگوں سے مطلع کرو۔ اس عبوری دور میں جب کہ تم نتیجے کا انتظار کر رہے ہو میرے پاس آ جاؤ۔ لطف رفاقت رہے گا۔ یہاں کا رومانی ماحول تمہارے مضمحل قویٰ کو ایک تازگی، ایک بشاشت بخشے گا۔

مجھے امید ہے کہ کوئی عذر تمہارے آنے میں حائل نہ ہوگا۔ جواب کا

منتظر رہوں گا۔

مخلص

نعیم تقی جعفری

۵۔ اپنی بہن کو خط تحریر کیجیے جس میں ایک پکنک کے حالات لکھیے۔

طارق آباد ، فیصل آباد

۱۸ اپریل ۱۹۸۵ء

پیاری باجی ! السلام علیکم !

الطاف نامہ موصول ہوا لیکن امتحانات کی وجہ سے جلد جواب نہ دے سکی۔ امتحانات ختم ہوئے تو پکنک کا پروگرام بنا۔ تمام کام میرے سپرد کر دیا گیا۔ ذرا سوچیے ہر چیز کا انتظام کرنا تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء بھی خریدنا تھیں، سپیشل بس کا بندوبست کرنا تھا، اس لیے پل بھر بھی فرصت نہ مل سکی۔

اتوار کو صبح سویرے تقریباً تیس طالبات کالج میں پہنچ گئیں۔ بس پہلے ہی موجود تھی۔ ایک چپڑاسی کو ساتھ لیا اور پروفیسر مس ملک کی سرکردگی میں، ہم تریموں ہیڈورکس کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ مس شیخ، مس جعفری اور مس درانی بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ راستے میں خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا۔

تقریباً دس بجے ہم منزل مقصود پر پہنچ گیے۔ سب سے پہلے ہم نے نہر حویلی دیکھی۔ اس کے بعد پل کی طرف بڑھے۔ بڑی پر رونق جگہ ہے۔ پل پر سے لاریاں، موٹریں، تانگے گزر رہے تھے اس لیے ہم پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ دریا میں پانی بہت کم تھا۔ مغرب کی جانب دریا بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح نظر آ رہا تھا۔ سب لڑکیاں دوڑتی بھاگتی کبھی ادھر جاتی تھیں کبھی ادھر۔ اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن اور نائیلون کے رنگ دار دوپٹے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہم نے ایک آم کے پیڑ کے نیچے ڈیرہ لگایا۔ کچھ لڑکیاں تو کھانے پکانے کے بندوبست میں مصروف ہوگئیں اور کچھ اِدھر اُدھر گھومنے چل نکلیں۔ جی چاہتا تھا خوب دوڑیں بھاگیں مگر پروفیسر صاحبہ نے ناک میں دم کر دیا۔ کہتی تھیں اری اس طرف نہ جاؤ، آرام سے بیٹھ جاؤ، شور نہ مچاؤ، یہ کرو وہ کرو، لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ میں تو پروین اور کوثر کو لے کر بند کی طرف چلی گئی اور خوب سیر کی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر چلنے میں خوب لطف آتا ہے۔ پانی بڑا ٹھنڈا اور صاف شفاف تھا۔ تقریباً بارہ بجے کے قریب موٹر لانچ پر سوار ہوئیں اور دور تک چلی گئیں۔ ہاں تو جب موٹر دریا کے درمیان پہنچی تو پروین ڈر کے مارے چیخنے لگی۔ کہتی تھی مجھے گھر پہنچاؤ ورنہ ڈوب جاؤں گی۔ اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔ ویسے دل تو میرا بھی دھڑکتا رہا۔ ہائے اس وقت کتنا ڈر لگتا تھا! تقریباً ایک گھنٹے کے بعد واپسی ہوئی۔ کھانا تیار تھا اور سخت بھوک لگی تھی، چنانچہ جی بھر کے کھایا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی چیز سنائے۔ کسی نے کوئی شعر سنایا، کسی نے لطیفہ سنایا، کسی نے گانا سنایا اور آپ سن کر حیران ہوں گی کہ مس جعفری نے ایک پنجابی گیت بڑی سریلی آواز میں سنایا جسے سُن کر ہم سب محظوظ ہوئے۔

شام ہو رہی تھی لہٰذا واپسی کی ٹھانی اور تقریباً چھ بجے شام گھر پہنچ گئے۔ بھائی جان کو تمام سفرنامہ سنایا۔ وہ کہہ رہے تھے کسی دن باجی کے ساتھ وہاں چلیں گے۔ فرمائیے کب تشریف لا رہی ہیں تاکہ پروگرام بنایا جا سکے۔ اگر سویٹر تیار ہو گئی ہو تو کسی کے ہاتھ بھیج دینا۔ ننھی سلام کہتی ہے۔

آپ کی بہن

شمیم اختر

۶۔ آپ کے چھوٹے بھائی نے کالج میں نیا نیا داخلہ لیا ہے، اُسے ایک خط کے ذریعے کالج کے متعلق ہدایات دیجیے۔

بورڈنگ محلہ
جہلم
۱۰ . . . . ۱۹۸۵ء

برادرِ عزیز!

السلام علیکم ۔ کالج میں داخلہ لیے تمہیں ایک ہفتہ گزر چکا ہے ۔ کالج اور سکول کی فضا میں جو ایک بین تفاوت ہے وہ تم سمجھ چکے ہو گے ۔ کالج کی زندگی عہدِ طالب علمی کا ایک زرّیں دور ہوتا ہے ۔ ایک حاصل زندگی کا زمانہ ۔ کالج ایک ایسا مرکز ہوتا ہے کہ جہاں سے تعمیر و تخریب کی دو پگڈنڈیاں پھوٹتی ہیں ۔ لہٰذا پند و نصیحت کے طور پر چند ایک باتیں تمہارے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں تاکہ اس سے استفادہ کر سکو ۔

کالج کی زندگی ہر طالب علم کو ایسے سنہری مواقع بہم پہنچاتی ہے کہ ایک طالب علم اپنے کردار و اعمال کو نکھار اور سنوار سکتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتا ہے ۔ کھیل کا میدان اور کمرۂ امتحان دونوں یکساں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ۔

بعض نوجوان کالج میں پہنچ کر بے راہ رو ہو جاتے ہیں ۔ لہو و لعب اور آوارہ گردی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں ۔ کچھ امیر زادے نمود و امتیاز کے غلط تصور کا شکار ہو کر ننگ خاندان ، ننگ قوم اور ننگ وطن بن جاتے ہیں اور بدنامی کو سرمایۂ افتخار جانتے ہیں ۔ اس روش سے اجتناب کی ضرورت ہے ۔ بُری سوسائٹی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے ۔ اس سے پرہیز لازم ہے ۔ صرف محنت کے شائق ہم جماعتوں سے ربط و ضبط بڑھانا چاہیے اور وہ بھی حدِ اعتدال کے اندر اندر ۔ سحر خیزی کو اپنی عادت ثانیہ بنا لو ۔ صبح اٹھ کر سیر کو نکل گئے ، واپس آئے ، غسل کے بعد ناشتہ کیا ، آموختہ پر سرسری سی نظر ڈالی اور کالج چل دئیے ۔ یہ تمہارا معمول ہونا چاہیے ۔

کالجوں میں علمی مذاکرے اور مباحثے اکثر ہوتے رہتے ہیں ، ان میں حصّہ لے کر غیر ضروری شرم و حجاب کو دور کرنے کی کوشش کرو ۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ

بعض ذہین طالب علم انٹرویو میں علمی لیاقت کے باوجود غیر ضروری جھجک کے باعث اپنے مافی الضمیر کو بے دھڑک بیان نہیں کر سکتے اور نتیجتاً ناکام ہوتے ہیں۔

تم ایک معروف خاندان کے چشم وچراغ ہو۔ عزیز و اقارب نے بے شمار امنگوں کو تم سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اُمید کے ان خاکوں میں تمہیں دلآویز رنگ بھرنا ہے۔

کالج سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر کے بھیجو۔

تمہاری خیریت کا طالب

افتخار حسین

۷۔ تم فوج میں بھرتی ہو کر میدان جہاد میں پہنچ چکے ہو، ایک مجاہد کی حیثیت سے اپنی والدہ کو خط لکھو۔

محاذِ جنگ

۱۲ر ستمبر ۱۹۶۵ء

پیاری امّی ! آداب

ماں تم مجھے معاف کر دینا، میں چند لمحوں کے لیے میدان جنگ سے ہٹ کر تمہیں خط لکھنے میں مصروف ہوں۔ مجھے اپنے فرائض کا پورا پورا احساس ہے لیکن صورت حال سے آگاہ کرنا بھی تو ضروری ہے۔

۶ر ستمبر کو دشمن کی بزدل فوجوں نے اعلانِ جنگ کیے بغیر ہماری سرحدوں پر حملہ کر دیا اور ہمارے نہتے مسلمانوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بنایا لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔ چنانچہ جب ہماری افواج سامنے آئیں تو بھارتی فوجیوں کی قلعی کھُل گئی۔ ان کے ٹینک اور بھاری توپیں مجاہدوں کو پیچھے ہٹانے میں ناکام رہیں اور اب دشمن کے قدم برابر پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔ سنا ہے سیالکوٹ کے محاذ پر بھارتی فوجوں کو شکست فاش ہوئی ہے اور ہمارے ہوابازوں نے بھی دشمن کے اڈوں کو تباہ کر دیا ہے۔

میں کم سن اور ناتجربہ کار ہوں مگر میری رگوں میں ایک جری اور بہادر باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ میں نے تم جیسی غیور ماں کا دودھ پیا ہے۔ میرے قدم ہمیشہ آگے ہی بڑھیں گے اور اپنے پیارے وطن کے لیے مسکراتا ہوا گولیوں کے دہانوں میں کود جاؤں گا۔

امی! تم میرے لیے دُعا کرنا کہ خدا مجھے استقلال اور استقامت بخشے اور وطن کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کا شرف حاصل کروں۔ وقت کی پکار کچھ اور ہے لہٰذا تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ وہ سامنے سے دشمن کے ہوائی جہاز آرہے ہیں اور ادھر سے ہمارے ہوائی جہاز بھی آپہنچے ہیں۔ ایک کو تو ہماری توپوں ہی نے مار گرایا۔ دوسرے دونوں کو ہمارے ہوابازوں نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ دیکھیے ایک اور گرا اور تیسرا جہاز زخمی ہو کر بھاگ نکلا ہے۔ اب ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ دشمن نے چوکیاں خالی کر دی ہیں۔

میری بہنوں کو تسلی دینا اور میرے لیے دعا کرنا۔ خدا حافظ

تمہارا مجاہد بیٹا

نثار احمد

۸۔ اپنے دوست کو خط لکھیے اور اسے دعوت دیجیے کہ امتحان سے فارغ ہو کر وہ آپ کے ساتھ کسی مشہور مقام کی سیر کو چلے۔

کمرۂ امتحان

۵ رمئی ۱۹۸۵ء

پیارے دوست! السلام علیکم

محبت نامہ ملا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ سالانہ امتحانات کی وجہ سے بروقت جواب نہ دے سکا۔ اب امتحان ہو چکا ہے۔ پرسوں پریکٹیکل کے امتحانات بھی ختم

ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہر طرح فارغ ہوں۔ میرے چند دوستوں کا ارادہ ہے کہ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد کسی تاریخی مقام کی سیر کو چلیں۔ آپ کو اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ؎ :

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

لاہور پاکستان کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ میرے چند دوستوں کو لاہور جانے کا اتفاق نہیں ہوا، لہٰذا وہ لاہور دیکھنے کے متمنی ہیں۔ آپ بھی لاہور چلیں تو خوب وقت گزرے گا۔ ہم آٹھ تاریخ کو صبح کے وقت یہاں سے روانہ ہوں گے۔ بارہ بجے کے قریب لاہور پہنچیں گے۔ آپ یہاں آجائیں یا راستے میں ملنے کا پروگرام لکھ بھیجیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم عجائب گھر، شالامار باغ، شاہی مسجد، قلعہ اور جہانگیر کا مقبرہ دیکھیں۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر کے مقبرے سے شاہی مسجد کے صرف تین مینار نظر آتے ہیں، ہم یہ منظر بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔

آپ کا دوست

رول نمبر ......

۹ - کسی اخبار کے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھ کر حکومت کو توجہ دلائیے کہ آپ کے محلے میں عوام کی سہولت کے لیے ایک ڈاک خانہ کھولا جائے۔

غازی آباد، جھنگ

۱۹ اپریل ۱۹۸۵ء

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب روزنامہ ' امروز ' لاہور

السلام علیکم۔ ہمارے محلہ میں کوئی ڈاکخانہ نہیں جس سے عوام کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں چند سطور بھیج رہا ہوں اپنے موقر اخبار میں شائع فرما کر ممنون فرمائیں۔

میں ارباب اقتدار کی توجہ بستی غازی آباد (جھنگ صدر) کی ایک فوری ضرورت یعنی ڈاک خانہ کے قیام کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کئی بار درخواستیں دی جا چکی ہیں لیکن ابھی تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اس محلے کی آبادی تقریباً چھ ہزار افراد پر مشتمل ہے لیکن افسوس ہے کہ اتنی آبادی کے لیے ڈاکخانہ کی کوئی شاخ نہیں۔

یہاں سے ڈاکخانہ تقریباً ڈیڑھ میل دور ہے۔ لفافے کارڈ خریدنے کے لیے یا منی آرڈر، پارسل وغیرہ کے سلسلے میں کافی فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور بے فائدہ تکلیف بھی اٹھانا پڑتی ہے۔ اگر عمارت کے سلسلے میں کوئی خاطر خواہ بندوبست نہیں ہو سکتا تو ہم محلے والے اس کے لیے مکان مہیا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر محکمہ زیادہ اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تو مقامی پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر کو انچارج بنا دیا جائے۔ اس طرح سے عوام کی یہ تکلیف رفع ہو جائے گی۔

افسران بالا سے استدعا ہے کہ وہ اس معاملے میں اہل محلہ کے جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مناسب اقدامات اٹھائیں۔

نیاز مند

عبد الحمید

ممبر یونین کمیٹی

۱۰ - اپنے کسی غیر ملکی قلمی دوست کو خط لکھیے اور پاکستان سے متعلق کسی اہم واقعہ کی تفصیلات بہم پہنچائیے۔

سمن آباد - لاہور

۶ رمارچ ۱۹۸۵ء

محبی آقائی صادق فراز! السلام علیکم

آپ کا محبت نامہ ملا۔ شاہِ ایران کی سالگرہ کے متعلق تقریبات کا حال بہت ہی دلچسپ

تھا۔ میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنی مصروفیات کے باوجود مجھے ان تقریبات کا حال اور چند خوبصورت رسائل ارسال کیے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ہم یہاں ۲۳ مارچ کو پاکستان ڈے مناتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آج سے کئی سال پہلے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے منٹو پارک میں جسے اقبال پارک کہتے ہیں، مسلم لیگ نے قائداعظم کی رہنمائی میں پاکستان کی قرارداد پاس کی تھی اور پھر اس قرارداد کے مطابق آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی اسلامی ریاست قائم ہو گئی۔ اس طرح دنیا کے نقشے پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا وجود اُبھر آیا

لاہور میں ۲۳ مارچ کا دن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ امسال بھی یہ دن حسب معمول بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ اس دن بڑی چہل پہل رہی۔ تمام اہم عمارتوں کو رنگا رنگ جھنڈیوں اور سبز پرچموں سے آراستہ کیا گیا۔ دکانیں اور دیگر کاروباری اداروں کی آرائش قابل دید تھی۔

صبح سویرے لاکھوں مسلمانوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس کے بعد مختلف تقریبات شروع ہوئیں۔ سب سے بڑی تقریب لاہور چھاؤنی میں تھی جہاں گورنر نے سلامی لینی تھی۔ بری، بحری اور ہوائی فوج کی پریڈ ہوئی۔ چاق و چوبند نوجوانوں کی مارچ پاسٹ قابل دید تھی۔ پاکستان فضائیہ نے بھی اپنی مہارت کا مظاہرہ کیا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔

اس کے علاوہ سکاؤٹوں، گرل گائڈز کا رنگارنگ پروگرام اور دیگر تقریبات اس قدر زیادہ تھیں کہ تحریر نہیں کی جا سکتیں۔ رات کو مختلف عمارات پر چراغاں کا منظر بے حد دلکش اور دلفریب تھا۔ میں عنقریب آپ کو اس سلسلے کی چند تصاویر بھی بھیجوں گا۔ آپ کا مطلوبہ رسالہ بھیج دیا گیا ہے، ایک ہفتے تک آپ کو پہنچ جائے گا۔ آپ نے ملکہ فرح دیبا کا فوٹو بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، ابھی تک انتظار ہے۔

تمہارا قلبی دوست

ممتاز رضا

۱۱- کوئی ادبی ماہ نامہ جاری کرانے کے لیے ایڈیٹر کو خط لکھیے۔

گورنمنٹ کالج

....

۱۸؍اپریل ۱۹۸۵ء

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب!

تسلیم! کل ایک دوست نے مجھے اُردو ڈائجسٹ دیکھنے کو دیا۔ میں نے پہلے تو عام رسالوں کی طرح سرسری طور پر اسے شروع سے آخر تک دیکھ ڈالا، پھر غور سے پڑھا تو اس میں کچھ ایسی معلومات افزا باتیں نظر آئیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا اور ساتھ ہی آپ کی محنت اور ادبی کاوش کا قائل ہونا پڑا۔

میں نے اُردو ڈائجسٹ پہلی دفعہ دیکھا ہے اور یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے اپنے نام جاری کرالوں۔ چنانچہ سال بھر کا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیا گیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر رسالہ میرے نام جاری کر دیں۔

اس میں خاص بات یہ ہے کہ یہ کسی مخصوص طبقے کا رسالہ نہیں۔ اس میں نہ صرف افسانے ہیں کہ افسانہ سے دلچسپی رکھنے والے ہی پڑھیں، نہ صرف غزل اور نظم پر زور دیا گیا ہے تاکہ شعر دوست ہی استفادہ کریں بلکہ اس میں تو ہر مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق مواد موجود ہے۔

علاوہ ازیں آپ کے رسالے کی گٹ اپ نہایت عمدہ ہے۔ کاغذ بڑا نفیس ہے اور سرورق میں بلا کی کشش اور جاذبیت ہوتی ہے۔

نیاز مند

ظفر اقبال۔

۱۲ - آپ کو علم ہوا ہے کہ آپ کا چھوٹا بھائی سگریٹ پینے لگا ہے؛ اسے خط لکھ کر سگریٹ نوشی کے نقصانات سے آگاہ کیجیے۔

نور منزل
چنیوٹ
۱۱، اپریل ۱۹۸۵ء

برادر عزیز!

دعا اور پیار۔ کل تمہارا دوست ارشد یہاں آیا تھا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ تم آج کل سگریٹ پینے لگے ہو۔ مجھے یہ سن کر بے حد دکھ ہوا۔ کیا کالج میں داخل ہو کر تم نے یہی کچھ سیکھا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ تم فی الحال شوقیہ سگریٹ پی رہے ہو گے لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے کہ عادت پڑ جانے پر اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

سگریٹ نوشی سے بہت سے نقصانات ہیں۔ یہ صحت کے لیے بھی مضر ہے اور دولت کو بھی برباد کرتی ہے۔ جو لوگ سگریٹ کے عادی ہو جاتے ہیں اُن کی انگلیاں اور ہونٹ دھوئیں سے سیاہ پڑ جاتے ہیں۔ دانت الگ خراب ہو جاتے ہیں۔ سگریٹ کا دھواں پھیپھڑوں کے لیے بے حد مضر ہے۔ انسان قسم قسم کے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالیہ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ سگریٹ نوشی سے سرطان کا مرض بھی ہو جاتا ہے۔

کیا تم کوئی فائدہ بھی بتا سکتے ہو؟ اگر نہیں تو پھر اس بُری عادت کو فوراً ترک کرو اور مجھے اطلاع دو تاکہ دل کو خوشی اور راحت حاصل ہو۔

میں نے تمہارے لیے کچھ کتابیں خریدی ہیں، کل بذریعہ پارسل بھیج دوں گا۔

تمہارا بھائی

محمد حنیف

۱۲۔ ایک طالبہ کسی مخلوط تعلیمی ادارے میں داخل ہوئی ہے؛ اس کی طرف سے کالج کی کسی سابقہ طالبہ کو خط لکھیے جس میں نئے کالج کے ماحول کا جائزہ لیا جائے۔

جوہر آباد

۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء

پیاری عذرا!

کیا بتاؤں کہ اس دور دراز علاقے میں آکر پھنس گئی ہوں۔ اب تو مجھے تمہاری رنگارنگ زندگی پر رشک آتا ہے مگر حالات کے آگے کس کی چلتی ہے؛ مجبوری کا نام شکر ہے۔ تم نے پوچھا ہے نیا ماحول کیسا ہے، سو میری بہن بس یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس علاقے کا ایک ہاتھ شہر کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا گاؤں کے۔ یہاں جس شان کے ساتھ کاریں اور سکوٹر نظر آتے ہیں، تانگے دوڑتے ہیں، اسی طرح اپنی عظمت قدیم کے پورے وقار کے ساتھ اونٹوں کی قطاریں بھی سرگرم نظر آتی ہیں اور ان پر محملوں میں بیٹھی ہوئی دوشیزائیں دیکھ کر مجھے اکثر فارسی کا ایک مصرع یاد آجاتا ہے۔ ؏

اے ساربان آہستہ راں کہ آرام جانم می رود

ملتان کے چار تحفے تو آپ نے سنے ہوں گے، یہاں کے تحفے بھی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں اور چار سے بھی زیادہ ہیں۔

اپنے خط میں تم نے گارڈن کالج کی تازہ ادبی و سماجی سرگرمیوں کا ذکر کرکے دل پر ایک تیر سا مار دیا ہے۔ آہ کیا کالج تھا۔ رونقوں کا شہر، علم کا گہوارہ۔ سچ کہتی ہوں کوئی لڑکی جو کھلی فضا والے مخلوط تعلیمی ادارے سے آئی ہو یہاں خوش نہیں رہ سکتی۔ وہاں پیریڈ ختم ہوتے ہی کلاسوں سے رنگ و نور کا طوفان اور قہقہوں کا کیف اُبلتا ہوا معلوم ہوتا ہے یہاں اس کے برعکس لڑکیوں کے برقعوں کا جلوس سا نکلتا ہے۔ یا کم از کم مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ تازہ وارد ہوں، ورنہ دیکھتی ہوں کہ یہاں پردے کی پابند بلکہ عادی لڑکیاں اپنی حالت پر مطمئن سی ہیں، جیسے پرانا قیدی پرندہ قید سے مانوس ہو جاتا ہے، اس لیے یہاں بھی ہلکے ہلکے قہقہوں کے فوارے چھوٹتے معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ کلاسوں میں جو گھٹن سی محسوس ہوتی ہے وہ بڑی جان لیوا ہے۔ تم شاید خیال بھی نہ کرسکو۔

پروفیسر صاحبان براہ راست لڑکوں سے مخاطب ہو کر پڑھاتے ہیں اور ہم دیوار کے ساتھ بیٹھی تھوڑا بہت سنتی رہتی ہیں۔ کوئی بات سمجھ نہ آئے تو پوچھنا مشکل۔ اس پر بھی ہم جماعت لڑکوں کی نگاہیں ہماری ہر حرکت کا تنقیدی جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ ہاں البتہ ایک بات یہاں اچھی ہے کہ ہر طرح سے عافیت اور حفاظت کا احساس ہے۔ زیادہ تر لڑکے بے نیاز سے رہتے ہیں، اپنے ہی خیالوں میں گم، جیسے کہہ رہے ہوں ؏

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

بہرحال میرا اپنا خیال ہے کہ کالج میں اگر مخلوط تعلیم ہو تو روایتی پردہ بھی نہیں ہونا چاہیے تاکہ کالج کی زندگی کا صحیح لطف حاصل ہو سکے، ورنہ لڑکیوں کے الگ کالج ہی اس گھٹن کا حل ہے۔ یوں جس کے دیدے ہوائی ہوتے ہیں وہ ہر جگہ سے تاڑ سکتی ہے اور باحیا لڑکی غنڈوں کے درمیان باعزت رہتی ہے۔ پردہ آنکھ میں ہوتا ہے چہرے میں نہیں۔

امید ہے کہ بہار کی چھٹیوں میں ملنے آؤ گی۔ ننھی ناہید کو پیار کرنا۔ امی جان کو سلام۔

تمہاری سہیلی

ناصرہ

۱۴۔ آپ کے دوست نے آپ سے دریافت کیا ہے کہ آپ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا بننا چاہتے ہیں، اُسے جواب تحریر کیجیے۔

....

۱۸ اپریل ۱۹۸۵ء

برادرِ عزیز! سلام مسنون۔

آپ کا عنایت نامہ ملا بشکریہ! آپ نے دریافت فرمایا ہے کہ میں نے زندگی کے لیے کون سا راستہ انتخاب کیا ہے۔

سوال بڑا ٹیڑھا ہے۔ اس کا جواب مستقبل کے حالات کے پاس ہے۔ انسان سوچتا

کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ کالج کا زمانہ تصورات کا دور ہوتا ہے۔ انسان ایسے حسین خواب دیکھتا ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔ تصورات کے شیش محل تیار کرتا ہے مگر پہلی ٹھوکر میں وہ سب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں ؎

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں

ہر شخص کی اپنی اپنی افتادِ طبع ہوتی ہے جس کے مطابق وہ اپنے نصب العین کا تعین کرتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے کہ جس میں انسان مخلوقِ خدا کی خدمت کر سکے۔ چنانچہ اس نظریے کے پیشِ نظر میں نے دو پیشوں کا انتخاب کیا ہے: ڈاکٹری اور تدریس۔

دونوں پیشے بڑے معزز ہیں۔ ہمارے ملک کو ڈاکٹروں کی بڑی ضرورت ہے تاکہ آئے دن کی بیماریوں کی روک تھام ہو سکے۔ غریب غربا کی مدد کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ ایک ڈاکٹر دکھی انسانوں کی خدمت کر کے ان کی دلی دعائیں حاصل کر سکتا ہے۔ پھر ڈاکٹری میں اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ انسان خوشحال زندگی بسر کر سکتا ہے۔

تدریس کا پیشہ بھی بڑا معزز پیشہ ہے۔ یہ قول حقیقت پر مبنی ہے کہ اُستاد معمارِ قوم ہوتا ہے۔ اس کا کام تعمیرِ انسانیت ہے۔ ایک اچھا اُستاد قوم کے مستقبل کو سنوار سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ پروفیسر بن کر یہ شوق کماحقہ پورا ہو سکتا ہے۔

اب ان دو پیشوں میں سے کسی ایک کا انتخاب میرے نتیجے پر منحصر ہے۔ اگر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا تو میڈیکل کالج میں داخلہ لے لوں گا اور اگر خدانخواستہ اچھے نمبر نہ آسکے تو ایم۔ ایس سی کرنے کے بعد لیکچرار بننا پسند کروں گا۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟ کچھ تو کہیے۔

مخلص

....

۱۵۔ کسی اخبار کے ایڈیٹر کے نام خط لکھیے جس میں کسی اہم موضوع پر اظہار خیال کیا جائے۔

گورنمنٹ کالج،
۔۔۔۔۔۔۔
۲۰ را پریل ۱۹۸۵ء

مدیر محترم! تسلیم۔

گداگری کے موضوع پر چند سطور بھیج رہا ہوں، اپنے مؤقر جریدے میں شائع فرما کر شکر گزاری کا موقع دیجیے۔

آج کل گداگروں نے ہر جگہ جال بچھا رکھا ہے۔ سفر ہو یا حضر کبھی چین نہیں لینے دیتے۔ اس طرح یہ لوگ صرف ہماری پریشانی کا سبب ہی نہیں بنتے بلکہ معاشرے کے لیے بھی بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔

گداگری کو کوئی شخص بھی اچھا نہیں سمجھتا، بلکہ اسلام نے تو اسے ایک لعنت قرار دیا ہے جو عزت نفس، غیرت اور خودداری کے منافی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے محتاج لوگوں کی امداد کے لیے بیت المال قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ جہاں زکوٰۃ، صدقات، خیرات وغیرہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اب بھی اگر اسی طریق پر سوچنے کی کوشش کی جائے تو یہ لعنت دور ہو سکتی ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی تمام گداگر غریب اور امداد کے مستحق ہیں۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ گداگروں کی ایک بھاری تعداد تنو مند لوگوں پر مشتمل ہے جن میں اکثر بھنگ و چرس پینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ بھیک مانگ مانگ کر وہ کافی روپیہ کما لیتے ہیں اور پھر تعیش کی زندگی گزارتے ہیں۔

حکومت کو چاہیے کہ گداگری کے اسباب کی تشخیص کرے اور پھر ایسی تدابیر عمل میں لائے کہ صحت مند اور تندرست لوگ اس ذلیل پیشے کو چھوڑ کر تن پروری کے ذرائع اختیار کر سکیں اور خود ان کا ضمیر ایسے پیشے سے انہیں ندامت دلائے۔ نیز

ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو ان کے لیے کام مہیا کریں۔

آج کل آئے دن سننے میں آتا ہے کہ کئی غنڈے فقیروں کے لباس میں معصوم بچوں کو اغوا کرتے رہتے ہیں اور اس طرح ہزاروں کی زندگی تباہ کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے گداگری کی روک تھام ایک قومی مسئلہ بن گیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ حکومت اس اہم مسئلہ پر غور کرے۔ ایسے لوگوں کی سخت نگرانی کرے اور مشتبہ لوگوں سے معاشرے کو پاک کرے۔

نیازمند

رئیس عباسی

ایڈیٹر روزنامہ "مشرق" لاہور

۱۶۔ اپنے بھائی کے نام خط میں بیان کیجیے کہ کالج میں پہلے روز آپ کو کن ناخوشگوار حادثات کا سامنا کرنا پڑا۔

میونسپل کالج

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۸۵ء

برادر محترم!

السلام علیکم۔ والا نامہ ملا۔ آپ کی ترقی کی خبر سن کر نہایت مسرت ہوئی۔ آپ کے مشورے کے مطابق میں نے نان میڈیکل میں داخلہ لے لیا ہے۔ کالج سے متعلق آپ نے جن چیزوں کا ذکر فرمایا ہے اور جو ہدایات دی ہیں ان سے کماحقہٗ استفادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر آپ کا خط ذرا پہلے پہنچ جاتا تو میں ان ناخوشگوار حادثات سے بچ جاتا جن کا مجھے پہلے دن سامنا کرنا پڑا۔

کالج ۲۷ تاریخ کو کھلنا تھا، میں حسب معمول علی الصبح اٹھا اور ایک کاپی لے کر کالج چل دیا - میرا خیال تھا سکول کا سا ماحول ہوگا، بڑے آرام سے ٹہلتا ٹہلتا کالج پہنچا۔ گیٹ کے باہر چند لڑکے مل گئے - بڑے مشفقانہ لہجے میں مجھے ہدایات دینے لگے۔ مضامین کے بارے میں پوچھتے رہے اور پھر رہنمائی کرتے ہوئے اندر داخل ہونے کا مشورہ دیا - ایک صاحب جو ذرا سنجیدہ معلوم ہوتے تھے تھپکیاں دیتے رہے اور مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ انہوں نے پشت پر "فرسٹ ایئر فول" کی مہر بھی لگا دی۔

اب کالج کے اندر گیا تو کچھ اور لڑکے نظر آئے - مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے - میں جھینپ گیا کہ نہ جانے ان کے ہنسنے کی وجہ کیا ہے - ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک لڑکا سوٹ پہنے آ پہنچا اور مجھے حکم دیا کہ میں ان کے ساتھ جا کر اپنا نام رجسٹر میں درج کروالوں - باقی لڑکوں نے کہا کہ یہ پروفیسر صاحب ہیں لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ سال چہارم کے طالب علم تھے - وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے اور اندر بند کر دیا - وہاں میرے دوست اسلم بھی گرفتار بلا تھے - کچھ لڑکوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا اور مختلف سوالات کرنے لگے - دو کا پہاڑہ سناؤ - استاد امام دین کا کوئی شعر سناؤ - کوئی فلمی گیت سنا دو - چلو رو کر دکھا دو - میں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن بے سود - اس کوشش میں بشرٹ بھی پھٹ گیا - پھر کچھ اور لڑکے آئے اور ہمیں پکڑ کر پرنسپل صاحب کی طرف لے گئے لیکن حقیقت میں یہ بھی نقلی پرنسپل تھا - ہم بڑے سٹ پٹائے اور لڑنے پر تل گئے لیکن نئے ماحول میں ہم کر ہی کیا سکتے تھے - ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ کچھ دیر کے لیے مجھے بیت الخلا میں بھی بند رہنا پڑا۔

اتنے میں میرے کچھ اور ہم جماعت بھی آگئے اور ہم دور ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے اور نئے مصائب کا انتظار کرنے لگے - اتنے میں ایک اور صاحب آئے اور کہا کہ فرسٹ ایئر کے تمام طلبہ ہال میں چلیں - چنانچہ ہم ہال میں چلے گئے - ایک پروفیسر صاحب نے کالج سے متعلق ضروری باتیں بتائیں اور ٹائم ٹیبل بھی لکھوایا - اس کے بعد

ہمیں چھٹی مل گئی اور ہم خوشی اور غم کے مشترکہ جذبات کے ساتھ گھر لوٹے۔ بہر حال کالج کا پہلا دن بھی عجیب دن ہوتا ہے۔

کالج کے پرنسپل نے سختی سے سب لڑکوں کو منع کر دیا ہے کہ فرسٹ ایئر کے طلبہ کو کچھ نہ کہا جائے۔ چنانچہ آج کل کسی کو چھیڑنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

والد صاحب کی خدمت میں مؤدبانہ سلام۔

ممتاز رضا

۱۷ - آپ کے ایک دوست نے آپ کو شادی پر مدعو کیا ہے۔ آپ بعض وجوہات کی بنا پر شرکت نہیں کر سکتے۔ ایک خط کے ذریعے معذرت کیجیے۔

بہاول پور

۲۱ ستمبر ۱۹۸۵ء

پیارے اشرف! سلام شوق۔

آپ کا دعوت نامہ اپنے جلو میں مسرتوں کی ایک دنیا لے کر آیا۔ میں آپ کی محبت، خلوص اور دوست نوازی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری دلی خواہش تھی کہ آپ کی شادی میں شریک ہوتا، اگر چند ضروری امور مانع نہ ہوتے۔ ان دنوں ہمارے امتحان شروع ہیں۔ ڈرامے کی مشق جاری ہے۔ نیز بھائی صاحب بیمار ہیں اور مجھے ان کی تیمار داری کے لیے دفتاً فوقتاً جانا پڑتا ہے۔ ان حالات میں معذرت خواہ ہوں۔

دعا ہے کہ آپ کی اس نئی زندگی کا آغاز مسرتوں اور خوشیوں کا پیش خیمہ ہو۔ البتہ سہرے کے چند شعر لکھ چکا ہوں شادی کے موقعہ پر بھیج دوں گا۔

شریک مسرت

سہیل اختر

۱۸ - دوست کے نام ایک تعزیتی خط قلم بند کیجیے۔

فیاض منزل

. . . . .

۲۹ر فروری ۱۹۸۵ء

مونس وہمدم ! السلام علیکم ۔

آج کی ڈاک سے آپ کا مکتوب ملا۔ آپ کی والدہ محترمہ کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع پاکر میرے دل پر اچانک بجلی سی گری۔

مرنا میراث آدم ہے اور اس سے مفر نہیں۔ طلوع وغروب ، بہار وخزاں اور حیات وممات کا سلسلہ ازلی وابدی ہے۔ ہر ذی روح کو جادۂ فنا پر چل کرانجامِ کار موت کی پراسرار وادی میں کھو جانا ہے۔

والدہ کی دعائیں ، ان کا سایۂ عاطفت اولاد کے لیے پُر عافیت گنج بہاراں سے کم نہیں ہوتا۔ ماں کا مقدس وجود نعمت غیر مترقبہ ہے۔ میں تمہارے اس مہیب صدمے کے درد واثر کا پورا احساس رکھتا ہوں۔ ہر چند کہ یہ ناقابل تلافی نقصان ، روح فرسا اور حوصلہ شکن ہے ، تاہم میں تلقینِ صبر کروں گا۔ تسلیم ورضا باری تعالیٰ کو بہت مرغوب ہیں۔ مصلحت ربانی کب کوئی سمجھا ہے ؟

غم سے نباہ کرنا ہی شیوۂ مردانگی ہے۔ گردش دوراں کو ایک پر وقار تبسم اور نشۂ خوداعتمادی سے ٹال دو۔ ذہنی پریشانی اور اضمحلال کی پرچھائیاں چھٹ جائیں گی اور تمہارے فکری افق سے اطمینان افروز صبح طلوع ہوگی ۔

اس صدمۂ جانکاہ میں مجھے اپنا غمگسار جانیے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو خلد آشیاں کرے اور آپ کو صبر جمیل کی توفیق بخشے ۔

شریک غم

سید فیاض حسین

۱۹- اپنے دوست کے نام خط میں کسی ایسے میچ کا حال لکھیے جس میں آپ نے خود شرکت کی ہو۔

گورنمنٹ کالج ، بہاولپور

۲۲ر دسمبر ۱۹۸۵ء

پیارے دوست ! السلام علیکم۔

بھئی آپ بھی کہتے ہوں گے عجیب آدمی سے واسطہ پڑا ہے ۔ ایک خط لکھا ، ہضم کر گیا ، دوسرا لکھا جواب ندارد۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھتے کیا ؟ اب لکھنے کی بات ملی ہے تو لکھ رہا ہوں ۔

میں آج ہی لاہور سے واپس آیا ہوں ۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری فٹ بال ٹیم نے امسال بھی زونل چیمپئن شپ جیت لیا تھا ۔ چنانچہ اب میچ کھیلنے کے لیے لاہور جانا تھا ۔ ہمارا پہلا میچ انٹرمیڈیٹ کالج جہلم سے ہوا جو ہم نے دو گول سے جیت لیا ۔ دوسرا میچ سیکنڈری بورڈ کی سابقہ چیمپئن ٹیم یعنی اسلامیہ کالج لاہور سے کھیلنا تھا ۔ یہ میچ ٹھیک تین بجے شام اقبال پارک میں شروع ہوا ۔ ریفری کے فرائض مسٹر دارا نے سرانجام دیئے ۔

شروع میں اسلامیہ کالج کی ٹیم نے بڑے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا اور خوب دباؤ ڈالا ۔ دراصل 'ہوٹنگ' کی وجہ سے ہمارے کچھ کھلاڑی گھبرا گئے تھے ۔ لیکن ہم جلد ہی سنبھل گئے اور متحد ہو کر کھیلنے لگے ۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس دن ہمارے گول کیپر نے بڑے شاندار خیال کا مظاہرہ کیا ورنہ کئی گول ہو جاتے ۔ میں سنٹر ہاف کھیل رہا تھا ۔ داؤد رائٹ فل اور نصیر لفٹ فل بیک تھا ۔ ہماری فارورڈ لائن بڑی مضبوط تھی ۔ کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ اسلامیہ کالج کے سنٹر فارورڈ نے ایک خطرناک کِک لگائی ۔ لیکن ہمارے گول کیپر نے اسے بڑی پھرتی سے بچا لیا ۔ تماشائیوں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے خوشی کے نعرے بلند کیے ۔ ان کا سنٹر ہاف لاہور کا مشہور و معروف کھلاڑی تھا اور ہمارے فارورڈ کے لیے آہنی دیوار بنا کھڑا تھا ۔ پہلے میں رائٹ ان عمار کی طرف بال پھینکتا رہا

لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اب میں نے لفٹ ان ربانی کو آزمایا۔ ربانی بڑی پھرتی سے کھیل رہا تھا اور کئی بار گیند ان کے گول ایریا میں لے جا چکا تھا لیکن وہ بھی کوئی اچھا نشانچی ثابت نہ ہوا۔

انہوں نے کئی بار خطرناک حملہ کیا لیکن ہم نے جان کی بازی لگا کر ہر حملے کو ناکام بنا دیا۔ بیسویں منٹ میں مخالف ٹیم کے سنٹر فارورڈ نے اپنے رائٹ آؤٹ کو پاس دیا۔ اس نے ایک خوبصورت کراس پھینکا اور لفٹ اِن نے ہیڈ لگا کر گول کر دیا۔ اب ان کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ ہم نے بھی سر توڑ کوشش کی لیکن گول نہ اتار سکے۔

پانچ منٹ کا وقفہ ہوا اور میں نے اپنی ٹیم کو مناسب ہدایات دیں۔ وقفے کے بعد میں نے تراب کو سنٹر ہاف کر دیا اور خود سنٹر فارورڈ کھیلنے لگا۔ کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ داؤد نے ایک لمبی کک لگائی۔ میں نے گیند کو سینے پر روکا اور ربانی کی طرف پھینک دیا۔ اس نے ایک دو کھلاڑیوں سے گیند نکال کر اختر کے پاس پہنچا دیا اور اس دفعہ اختر نے غلطی نہیں کی۔ گیند جال میں تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے خوشی کے نعرے بلند کیے۔ تالیاں بجائیں۔ ٹوپیاں اچھالیں۔ اب ہمارے حوصلے بڑھ گئے۔ مخالف ٹیم بھی جان توڑ کر کھیل رہی تھی۔ میچ میں بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ تماشائی کھیل میں کھو گئے۔ اب یہ حالت تھی کہ بال ابھی اس گول کے پاس ہے تو ابھی دوسرے گول کے قریب پہنچ گیا۔ کھلاڑیوں میں بے حد جوش و خروش پیدا ہو گیا۔

تقریباً سات منٹ رہتے ہوں گے کہ ان کے سنٹر ہاف نے 'پینلٹی ایریا' کے قریب سے ایک فری کِک لگائی۔ گول کیپر نے بال کو پول کے اوپر سے گزارنے کی کوشش کی لیکن یہ ٹکرا کر پھر میدان میں پہنچ گیا۔ سامنے ہی ان کا رائٹ اِن کھڑا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے بال کو جال کے ایک کونے میں پہنچا دیا۔ گول کیپر نے روکنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ وقت بہت تھوڑا تھا لیکن ہم نے حوصلہ نہ ہارا اور برابر حملہ کرتے رہے۔ بہرحال مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔ یہ میچ بڑا دلچسپ تھا۔ میں

کہوں گا کہ اسلامیہ کالج کی ٹیم کا کھیل قابلِ تعریف تھا اور وہ اس اعزاز کے مستحق تھے۔
آپ کی ہاکی ٹیم کب آ رہی ہے ؟

مخلص

ناصر حیات

۲۰ - کسی روزنامے کے ایڈیٹر کو خط لکھیے جس میں اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر بسوں کی تیز رفتاری کے ہولناک نتائج بیان کر کے اس کے انسداد کی تجاویز پیش کیجیے۔

کمرۂ امتحان

....

۲۸ رمئی ۱۹۸۵ء مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب روزنامہ 'مشرق'، لاہور

سلام مسنون۔ آپ کے مؤقر روزنامہ مشرق میں ٹریفک کے حادثات کے بارے میں خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بعض اہلِ قلم نے ان حادثات کے انسداد کے لیے تجاویز بھی پیش کی ہیں، میں بھی اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ شائع فرما کر ممنون کریں گے۔

آئے دن اخبارات میں بسوں کے حادثات کی خبریں دیکھنے میں آتی رہتی ہیں، بلکہ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوگا جس دن کہیں نہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہوا ہوگا۔ کہیں بس اور سکوٹر ٹکرا جاتے ہیں، کہیں ٹرک اور بس کی ٹکر ہو جاتی ہے اور کبھی کوئی معصوم بچہ کسی تیز رفتار کار یا ٹرک کی زد میں آ کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ایسی ہولناک خبریں پڑھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے۔ کیا یہ مشینی دور کا المیہ نہیں ؟ انسان کا خون اتنا ارزاں کیوں ؟

آپ اداریے لکھتے ہیں۔ حادثات کی روک تھام کے لیے کمیٹیاں رپورٹیں تیار کرتی ہیں۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ یہ درست ہے کہ ٹریفک کا مسئلہ پیچیدہ ہے لیکن

لاینحل تو نہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہم لوگوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کریں کہ وہ اپنا فرض دیانت داری سے ادا کریں۔ مادیت پرستی کے دور میں ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا چاہتا ہے، چاہے بسوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو۔ ڈرائیور آگے بڑھنے کی فکر میں بیسیوں سواریوں کی جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اور پچاس میل سے کم رفتار پر چلنے والی بس کو تو چھکڑا سمجھتا ہے۔ جب دو بسیں مقابلے پر آجاتی ہیں تو ساٹھ میل کی رفتار تک لے اڑتے ہیں۔ سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ گرد و غبار بلند ہوا اور سواریوں کے دل دھڑکنے لگے۔ ہر ڈرائیور کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بس سڑک پر رہے اور سامنے سے آنے والا ٹرک یا بس راستہ دے دے اور اسی کوشش میں حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

چند دن ہوتے میں لاہور سے لائل پور جا رہا تھا۔ پچاس میل کی رفتار پر بس دوڑ رہی تھی۔ ایک اور بس آگے نکل گئی۔ ڈرائیور نے مقابلہ کرنا چاہا مگر سواریوں کے شور مچانے پر وہ باز رہا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ پہلی بس تیز رفتاری کی وجہ سے ایک درخت سے ٹکرا گئی اور بہت سے مسافر شدید طور پر زخمی ہوئے۔ مسافروں نے بتایا کہ سمجھانے کے باوجود ڈرائیور اپنی ضد پر قائم رہا۔ ایک اور بس کو کراس کیا۔ سامنے سے ایک بیل گاڑی آ رہی تھی اس سے بچنے کے لیے تیزی سے بس کو چھوڑا۔ بس کنٹرول میں نہ رہی اور درخت سے جا ٹکرائی۔ ایسی ہی بے احتیاطی حادثات کا سبب بنتی ہے۔

میرے خیال میں حادثات کی روک تھام کے لیے تین تجاویز پر عمل ضروری ہے: سڑکیں پختہ اور کشادہ ہونی چاہئیں تاکہ بیک وقت دو بسیں گزر سکیں۔ بسوں کی وقتاً فوقتاً پڑتال ہونی چاہیے تاکہ ان میں کوئی ایسی خرابی نہ ہو جس سے حادثہ رونما ہو سکے۔ رفتار پر پابندی ہونی چاہیے اور جو ڈرائیور خلاف ورزی کرے اس کا لائسنس ضبط کر لیا جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ اگر ٹریفک کا سپاہی بھی دیانت داری سے محاسبہ کرے

تو کوئی وجہ نہیں کہ بسوں کی تیز رفتاری کے ہولناک نتائج میں خاطر خواہ کمی نہ آجائے۔

نیاز مند

اطہر جاوید

۲۱ - مالک مکان کو مکان کی مرمت کی بابت ایک خط تحریر کیجیے۔

۲۶- چھوٹی روڈ

اٹک شہر

۲۰ اپریل ۱۹۸۵ء

مکرمی جناب ! سلام مسنون ۔

گزشتہ بار جب آپ یہاں تشریف لاتے تھے تو میں نے مکان کی مرمت کے بارے میں عرض کیا تھا - آپ نے وعدہ کیا تھا کہ عنقریب کوئی بندوبست کر دیا جائیگا لیکن اب تک اس اشد ضرورت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ۔

آپ کو معلوم ہی ہے کہ مکان کی حالت بڑی خراب ہے ۔ فرش اکھڑے پڑے ہیں، پلستر غائب ہے۔ ذرا بارش ہو تو چھت ٹپکنے لگتی ہے۔ پچھلی دیوار اتنی شکستہ اور بوسیدہ ہو گئی ہے کہ یہ معمولی بارش کی بھی متحمل نہیں ہوگی۔ بقول میر ؎

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
چار دیواری سو جگہ سے خم
تر تنک ہو تو سو کھتے ہیں ہم

برسات کا موسم شروع ہونے والا ہے۔ اگر عدم توجہی کا یہی سلسلہ جاری رہا تو مکان کے گرنے کا اندیشہ ہے۔

مرمت کے علاوہ تمام مکان کی سفیدی کرانا بھی ضروری ہے۔ نیز برآمدے میں بجلی کا بندوبست نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیڑھیوں پر چڑھتے وقت گھٹا ٹوپ

اندھیرے میں راستہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ پرسوں چھوٹے بھائی کا پاؤں پھسل گیا جس کی وجہ سے ٹانگ پر سخت چوٹ آئی ہے۔

براہ کرم مکان کی مرمت اور سفیدی کا فوری طور پر بندوبست کیجیے۔ اگر خود نہیں آسکتے تو کسی ملازم کو بھیج دیجیے۔ امید ہے اب یاد دہانی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

نیازمند

مختار احمد

۲۲۔ آپ کا ایک قلمی دوست انڈونیشیا میں رہتا ہے، اُسے پاکستان آنے کی دعوت دیجیے اور سیر و تفریح کے پروگرام کی اطلاع دیجیے۔

گورنمنٹ کالج

فیصل آباد

۲۴ر مئی ۱۹۸۵ء

پیارے ندیم!

سلام مسنون۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے قلمی دوستی پسند کی ہے۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ہم تو دو اسلامی ملکوں کے رہنے والے ہیں۔ امید ہے ہماری یہ دوستی دیرپا ثابت ہوگی۔

ہمارا امتحان یکم جون کو ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد ہم فارغ ہوں گے۔ آپ کا کالج بھی جون کے آخر میں بند ہو رہا ہے۔ اس لیے آپ جون کے آخری ہفتے میں پاکستان آنے کا پروگرام بنائیے، میں چشم براہ ہوں گا۔ میرے بڑے بھائی لاہور میں ملازم ہیں اور میں تعطیلات میں ان کے یہاں قیام پذیر ہوتا ہوں۔ امتحانات ختم ہوتے ہی وہاں چلا جاؤں گا۔ آپ دو تین ہفتوں کے لیے تشریف لائیں تو خوب وقت گزرے گا۔ میں نے سیر و تفریح کا بڑا دلچسپ پروگرام بنالیا ہے۔ آپ جکارتہ سے بذریعہ ہوائی جہاز

لاہور پہنچ جائیں۔ ہم ہوائی اڈے پر استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ آپ کو معلوم ہے لاہور پاکستان کا دل ہے۔ اپنی تاریخی عمارات اور پرشکوہ مناظر کی وجہ سے پاکستان کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ شالامار باغ، شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد۔ جہانگیر کا مقبرہ قابل دید مقامات ہیں۔ آپ پاکستان کے اس قدیم شہر کو دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے۔ کچھ عرصے کے لیے ہم صحت افزا مقام مری میں قیام کریں گے۔ اس کے بعد پاکستان کے نئے دارالحکومت اسلام آباد جائیں گے اور وہاں سے چند احباب کو ساتھ لے کر پاکستان کی حسین وادی کاغان کی سیر کریں گے۔ اس وادی کو دیکھنے کے لیے دور دراز ملکوں کے سیاح آتے ہیں۔ یہاں کے دلفریب قدرتی مناظر اپنی مثال نہیں رکھتے۔

امید ہے آپ اس پروگرام کو پسند فرمائیں گے اور اپنے فیصلے سے جلد آگاہ فرمائیں گے۔

آپ کا مخلص دوست

نیاز احمد

۲۳۔ دوست کے نام ایک تہنیت نامہ لکھیے۔

گورنمنٹ کالج مری

۴، دسمبر ۱۹۸۵ء

قیوم بھائی! سلام مسنون۔

توصیف کا خط پہنچا ہے جس میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ خدا نے آپ کو لڑکا عطا فرمایا ہے۔ یہ مسرت انگیز خبر سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ دلی دعا ہے کہ خداوند کریم نومولود کو عمر خضر اور بخت سکندری عطا فرمائے۔

ہاں تھوڑا سا ؏ شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے۔ گزشتہ تعطیلاتِ موسم گرما میں آپ نے شادی رچائی تو اس نیاز مند کو یاد نہ فرمایا اور جب میں نے اس خبر کی

تصدیق چاہی تو آپ حسب معمول صاف مکر گئے اور کہنے لگے۔ ع :

یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہو گی

اب لڑکا پیدا ہوا تو اطلاع تک نہ بھیجی۔ بھلا ہو تو صیف کا، آپ کی باتوں سے مطلع کر دیتا ہے۔

دل چاہتا ہے ننھے کو دیکھوں اور پیار کروں مگر دور ہونے کی وجہ سے فی الحال یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ سردست ننھے کے لیے ایک کھلونا بھیج رہا ہوں۔

بھابی صاحبہ کو میری طرف سے مبارک باد کہیے گا۔

شریک مسرت

عبدالباری عباسی

۲۴۔ کسی تاجر کتب کو خط لکھیے کہ وہ آپ کی مطلوبہ کتابیں بذریعہ وی پی پی ارسال کر دے۔ اس کا جواب بھی تحریر کیجیے۔

امتحان کا کمرہ

۳ر مئی ۱۹۸۵ء

بخدمت جناب منیجر صاحب

نذر سنز پبلشرز۔ لاہور

جناب من! تسلیم۔ آپ کی مطبوعات کی فہرست نظر سے گزری۔ اس میں سے میں نے مندرجہ ذیل کتب کا انتخاب کیا ہے۔ براہ نوازش اپنی اولین فرصت میں مطلوبہ کتابیں بذریعہ وی پی پی ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

۱۔ مطالعہ یلدرم از پروفیسر معین الرحمٰن

۲۔ پریم چہر از محمد حیات خاں سیال

۳۔ احوال و نقد غالب از محمد حیات خاں سیال

۴۔ اسلامی کردار   از صوفی عبدالعزیز

نیاز مند

انور جلال

جواب

نندسنز پبلشرز

سرکر روڈ۔ لاہور

۶۔ مئی ۱۹۸۵ء

مکرمی جناب!

السلام علیکم: آپ کی فرمائش مورخہ ۳ مئی ۱۹۷۳ء کا شکریہ۔ آپ کے ارشاد کے مطابق مطلوبہ کتابیں بذریعہ وی۔ پی۔ پی ارسال کردی گئی ہیں۔ بل ارسال خدمت ہے۔ دیگر کارلائقہ سے یاد فرماتے رہیں۔

نیاز کیش

صغیر حسین

(مینجر)

۲۵۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے نام درخواست لکھیے کہ آپ کے گاؤں میں ایک سکول کھولا جائے۔

بخدمت جناب ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز، شیخوپورہ

جناب عالی

مودبانہ التماس ہے کہ ہمارا گاؤں شاہ کوٹ سے چار میل دور سڑک کے کنارے واقع ہے لیکن اس کے قریب کوئی پرائمری سکول نہیں ہے۔ بچوں کو چار میل کا سفر کر کے شاہ کوٹ جانا پڑتا ہے۔

عالیجاہ! اس دور میں تعلیم حاصل کرنا ہر بچے کے لیے ضروری ہے اور ہمارا قومی اور ملکی مفاد بھی اسی میں ہے کہ تعلیم زیادہ سے زیادہ عام ہو۔ ان حالات میں ہماری تمام تر توجہ تعلیم کی اشاعت پر ہونی چاہیے۔

ہمارا علاقہ پہلے ہی پسماندہ ہے اور سکول قریب نہ ہونے کی وجہ سے بچے تعلیم سے محروم رہتے ہیں کیونکہ روزانہ تین چار میل کا سفر طے کرنا مشکل ہے۔ اس لیے التماس ہے کہ ہمارے گاؤں میں ایک پرائمری سکول کھولا جائے اور ہماری اس جائز خواہش کو پورا کیا جائے۔ امید ہے پہلے ہی سال تقریباً چالیس لڑکے داخل ہو جائیں گے۔ ہماری یونین کونسل مناسب جگہ دینے کے لیے تیار ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے اس سلسلے میں کچھ رقم بھی جمع کر رکھی ہے جو بوقت ضرورت پیش کی جا سکتی ہے۔ امید ہے آپ نئے سال سے یہاں پرائمری سکول جاری فرما کر شکریہ کا موقع بخشیں گے۔

عرضے

....

چیئرمین یونین کونسل نمبر.......

ضلع شیخوپورہ

مورخہ ۲۱ ، جولائی ۱۹۷۳ء

۲۶۔ آپ کی سائیکل چوری ہو گئی ہے، اس کی اطلاع اپنے علاقے کے پولیس آفیسر کو دیجیے۔

بخدمت جناب آفیسر انچارج تھانہ صدر ملتان

جناب عالی

مؤدبانہ التماس ہے کہ میں کل شام سٹیڈیم میں ہاکی میچ دیکھنے کے لیے گیا اور اپنی سائیکل گیٹ کے قریب کھڑی کر دی۔ یہ میچ پاکستان کی قومی ٹیم اور ملتان ڈویژن کی ہاکی ٹیم کے درمیان ہو رہا تھا۔ میچ بڑا دلچسپ تھا لہٰذا میں آخر تک وہیں بیٹھا رہا۔ جب میچ ختم

ہوا تو میں نے دیکھا کہ سائیکل غائب تھی حالانکہ اسے تالا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے چوکیدار سے بھی دریافت کیا مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

یہ سائیکل فلپس کی تیار کردہ ہے اور اس کا نمبر ۳۱۵۴ NB ہے۔ میں نے گزشتہ سال لاہور سے خریدی تھی اور بالکل اچھی حالت میں تھی۔ اس کے ساتھ ڈائنمو بھی لگا ہوا ہے جو بالکل نیا ہے۔ سائیکل کی رسید میرے پاس ہے اور بوقت ضرورت پیش کی جا سکتی ہے۔

براہ کرم رپورٹ درج فرما کر مسروقہ سائیکل کی بازیابی کے لیے مناسب بندوبست فرمائیں۔

عرضے

۲۰/اپریل ۱۹۸۵ محمود اختر ۱۴۴۔ سی گلگشت، ملتان

۲۷۔ پرنسپل صاحب کی خدمت میں فیس معافی کے لیے درخواست لکھیے۔

بخدمت جناب پرنسپل صاحب اسلامیہ کالج، لائل پور

مؤدبانہ التماس ہے کہ میں ایک غریب خاندان کا فرد ہوں۔ میرے والد اسلامیہ ہائی سکول میں چپڑاسی ہیں اور ان کی تنخواہ اس قدر قلیل ہے کہ ان مہنگائی کے دنوں میں گزارا ہونا بھی مشکل ہے۔ علاوہ ازیں میرے دو چھوٹے بھائی بھی زیر تعلیم ہیں۔ ان حالات میں تعلیمی اخراجات کو پورا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

مجھے حصول علم کا بہت شوق ہے۔ میٹرک کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا تھا اور اب بھی حالت تسلی بخش ہے۔ آپ سہ ماہی ٹسٹ میں حاصل کردہ نمبر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں میں ہاکی کا اچھا کھلاڑی ہوں اور کالج ہاکی ٹیم کا کیپٹن ہوں۔ اگر آپ کی عنایت سے فیس معاف ہو گئی تو تعلیم جاری رکھ سکوں گا۔ امید ہے کہ آپ میری درخواست پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے اور ایک غریب اور نادار طالب علم کو

تعلیم حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچائیں گے۔

عرضے

ظفر علی رول نمبر ۱۳۲ - سال اول

اسلامیہ کالج فیصل آباد

فیصل آباد
۱۰ رمئی ۱۹۸۵ء

۲۸ - ڈپٹی کمشنر صاحب کی خدمت میں ملازمت کے لیے درخواست تحریر کیجیے۔

بخدمت جناب ڈپٹی کمشنر صاحب/ ضلع سرگودہا

جناب عالیٰ

مؤدبانہ التماس ہے کہ فدوی کو روزنامہ امروز، مطبوعہ ۱۲ مارچ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ جناب کے دفتر میں کلرکوں کی چند اسامیاں خالی ہیں۔ بندہ ان میں سے ایک کے لیے اپنی خدمات بطور امیدوار پیش کرتا ہے۔

عالیجاہ! بندہ نے ۱۹۰۲ء میں ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور سے میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور ضلع بھر میں اول رہا۔ اس کے بعد ایف۔ اے میں داخلہ لیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔ بندہ کالج کے جملہ کھیلوں میں حصہ لیتا رہا ہے اور ہاکی ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے کئی انعامات حاصل کر چکا ہے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری رکھنا مشکل تھا لہٰذا ایک سال کے لیے 'کوہ نور ملز' لائل پور میں کلرک بھرتی ہو گیا اور اس دوران میں ٹائپ بھی سیکھی۔

فدوی اسی ضلع کے معزز سید خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت عمر اکیس سال ہے اور صحت بحمد اللہ بہت اچھی ہے۔

مندرجہ بالا کوائف کے پیش نظر امید کرتا ہوں کہ حضور میری درخواست پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔

تمام سندات کی مصدقہ نقول لف ہذا ہیں۔

عرضے

فدوی عزیز الحسن مکان نمبر ۱۲۶

بلاک نمبر ۵ سرگودھا

۲۵۔ اپریل ۱۹۸۲ء

۲۹۔ اپنے علاقہ کے ہیلتھ آفیسر کی خدمت میں درخواست لکھیے جس میں محلہ کی صفائی کی طرف توجہ دلائی جائے۔

بخدمت جناب ہیلتھ آفیسر صاحب میونسپل کمیٹی، فیصل آباد

جناب عالی

ہم باشندگان محلہ منصور آباد بڑے ادب سے عرض پرداز ہیں کہ ہمارے علاقے میں صفائی کا انتظام بالکل ناقص ہے۔ گلی کوچوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ملازمین کمیٹی کئی کئی دنوں تک صفائی نہیں کرتے جس کی وجہ سے پانی کے نکاس میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے نیز گلیوں میں جا بجا کوڑا کرکٹ اور غلاظت کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔

پچھلے دنوں بارش ہونے کی وجہ سے بہت سا پانی نشیبی علاقوں میں جمع ہو گیا ہے اور اب اس قدر تعفن اور بدبو پھیلی ہوئی ہے کہ وہاں سے گزرنا دشوار ہے۔ نیز گندہ پانی ٹھہرنے کی وجہ سے بہت زیادہ مچھر پیدا ہو گیا ہے اور وبائی بیماریاں پھیلنے کا سخت اندیشہ ہے۔

براہ کرم محلے کی اس صورت حال پر جلد توجہ فرمائیے۔ پانی کے نکاس کا مناسب بندوبست فرمایا جائے۔ اس کے علاوہ خاکروبوں کو تنبیہہ کی جائے کہ وہ باقاعدہ طور پر اپنے فرائض سرانجام دیں۔

عرضے

فدویان باشندگان محلہ منصور آباد

فیصل آباد

۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ء

۳۰۔ کسی جلسے وغیرہ میں شرکت کے لیے دعوت نامہ

محترمی جناب ....

السلام علیکم ۔

بزم ادب گورنمنٹ کالج رحیم یار خاں کے زیر اہتمام ۲۲ر فروری ۱۹۸۵ء کو 'غالب ڈے' منایا جا رہا ہے۔ عالی جناب .... وزیر تعلیم حکومت مغربی پاکستان صدارت فرمائیں گے۔ ملک کے نامور ادبا اور شعرا شرکت فرما رہے ہیں۔

آپ سے استدعا ہے کہ وقت مقررہ پر تشریف لا کر ممنون فرمائیں۔

مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۸۵ء

منجانب

نعیم جاوید سیکرٹری بزم ادب

دعوت نامہ برائے شادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی جناب ....

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

برادر عزیز غلام محمد ملک کی شادی خانہ آبادی ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۵ء مطابق ۱۱ صفر بروز منگل قرار پائی ہے۔ ملتمس ہوں کہ اس تقریب سعید میں شرکت فرما کر ممنون فرمائیں۔ آپ کی شمولیت موجب صد افتخار ہوگی۔

منجانب

غلام مصطفےٰ پیپلز کالونی فیصل آباد

پروگرام

رسم سہرابندی	۲۹ر دسمبر ۸ بجے صبح
روانگی برات	" " ۹ "
واپسی برات	" " ۷ " شام
دعوت ولیمہ	۳۰ر دسمبر ۱۱ بجے قبل دوپہر

(نوٹ: پروگرام دعوت نامہ بھیجنے والے کے نام سے پہلے بھی آسکتا ہے۔)

دعوت نامے کا جواب

گورنمنٹ کالج سرگودھا

۲۱ر دسمبر ۱۹۸۵ء

محبی! السلام علیکم

دعوت نامے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی دعوت کو بہ خوشی منظور کرنا باعث فخر سمجھتا ہوں۔ اس مبارک تقریب میں شرکت سے اور زیادہ مسرت میرے لیے کیا ہو سکتی ہے۔ میں ضرور حاضر خدمت ہوں گا اور ہدیۂ تبریک پیش کروں گا۔

مخلص

مختار حسین طاہر

رسید فروخت

مبلغ دو سو چالیس روپے نصف جن کے مبلغ ایک سو بیس روپے ہوتے ہیں، بابت قیمت ایک عدد سائیکل ریلے نمبر R.151 مع ڈائنمو، ازاں ظہور احمد وصول پا کر رسید لکھ دی کہ سند رہے اور بوقت ضرورت

کام آئے۔

تاریخ تحریر : ۳۱ ر جنوری ۱۹۸۵ء

گواہ شد	العبد	گواہ شد
ظفر اعجاز	محمد یعقوب چوہدری	ایس - ایم - شفیق
دجی روڈ جھنگ	محلہ سلطان والا جھنگ صدر	جھنگ بازار جھنگ

چیلنج میچ

جناب کیپٹن صاحب فرینڈز والی بال کلب ملتان

تسلیم ! ہم مورخہ ۹ ، فروری ۱۹۸۵ء بروز ہفتہ آپ کے گراؤنڈ میں آپ سے دوستانہ والی بال میچ کھیلنا چاہتے ہیں - براہ کرم چیلنج منظور فرما کر مطلع فرمایئے۔ ہم تاریخ مذکورہ کو صبح آٹھ بجے کی گاڑی آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

مورخہ ۲ ، فروری ۱۹۸۵ء

نیاز مند

محمد سلیم کیپٹن والی بال ٹیم

گورنمنٹ اسلامیہ کالج خانیوال

نوٹس

(بنام بشیر احمد ولد اصغر علی سکنہ جناح کالونی فیصل آباد)

واضح ہو کہ آپ میرے مکان واقع جناح کالونی میں عرصہ ایک سال سے مقیم ہیں، لیکن آپ نے آج تک کسی ماہ کا بھی کرایہ ادا نہیں کیا۔ آپ کے ذمہ ۱۲ روپے واجب الادا ہیں۔ میں نے کئی دفعہ آپ سے مطالبہ کیا لیکن آپ نے ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا۔

اس لیے بذریعہ نوٹس ہذا آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ دو ہفتے کے اندر اندر

اپنا تمام کرایہ ادا کر دیں ورنہ میں قانونی چارہ جوئی کرنے پر مجبور ہوں گا۔ اس صورت میں تمام خرچہ عدالت آپ کے ذمہ ہوگا۔

تاریخ تحریر

۲۱ر جولائی ۱۹۸۵ء

نوٹس دہندہ

نذیر احمد ولد عبدالرحیم قوم راجپوت جناح کالونی فیصل آباد

اطلاع

کالج یونین کے زیر اہتمام ۲۲ر مارچ ۱۹۸۵ء کو ۶ بجے شام ایک اردو مباحثہ ہال میں منعقد ہوگا۔ موضوع زیر بحث یہ ہے:

اس ایوان کی رائے میں "موجودہ تعلیم انسان کو بزدل بنا دیتی ہے"

مندرجہ ذیل مقررین حصہ لیں گے:

موافقت میں	مخالفت میں
۱۔ عابد حسین (قائد ایوان)	۱۔ نصیر احمد (قائد حزب مخالف)
۲۔ ارشد منیر	۲۔ سجاد انور
۳۔ صفدر ملک	۳۔ نسیم بخاری
۴۔ سعادت علی خان	۴۔ قمر جاوید

جناب ڈپٹی کمشنر صاحب مہمان خصوصی ہوں گے۔

طلبہ سے استدعا ہے کہ وقت مقررہ پر کالج پہنچ جائیں۔

اسد جعفری

سیکرٹری کالج یونین

گورنمنٹ کالج۔ علی پور۔

مشاہیر کے چند خطوط

غالبؔ کا خط بنام میر مہدی مجروحؔ

میر مہدی! جیتے رہو! آفرین صد آفرین! اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے ....

اس وقت تمہارا خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا ہے۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میرن صاحب، میر سرفراز حسین، میر نصیر الدین کو دعا۔ غالبؔ

میر مہدی مجروحؔ کا جواب

قبلہ و کعبہ آداب بجالاتا ہوں۔ بھلا آپ یہ حضرت کیا فرماتے ہیں۔ آپ کے طرز پر لکھ سکوں، توبہ، استغفر اللہ

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

مہر عالم افروز کے سامنے ذرۂ ناچیز کی کیا نمود اور بحر بیکراں کے روبر قطرۂ تنگ فطرت کا کیا وجود۔ یہ دعویٰ میاں ظہوری کریں۔ یہ اندیشہ نظیری کو ہووے۔ میں بیچارہ کس حساب سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات منبع کمالات کو اس فن میں یکتا پیدا کیا ہے۔ ہاں اگر دو چار برس قدموں میں پڑا رہوں اور فضل و کمال کی طرح دروازے پر حاضر رہوں تو البتہ

کچھ راہ پر آؤں۔ سو یہ چرخ تفرقہ پرداز کب کسی کو اپنی مراد پر پہنچاتا ہے اور کب چاہتا ہے کہ دو آدمی حسب دل خواہ ایک جگہ مل بیٹھیں۔ کچھ ان دنوں میں آپ ہی آپ جی گھبراتا ہے اور شوق قدم بوسی اگر حضرت یہی صورت ہے تو دو چار دن میں حاضر ہوتا ہوں. یہ دلولہ افگن ہے کہ چل اور خاک قدم کو صندل پیشانی کر اور اختصاص قدم بوسی پاتا ہوں۔

زیادہ حد آداب

میر مہدی مجروح

سر سیّد احمد خان کا خط بنام الطاف حسین حالیؔ

جناب مخدوم و مکرم من! عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی، خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعراء و شاعری ہے، بالکل مبرا ہے کیوں کر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے کہ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو چشم نم بغیر پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق یہ ہے جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہہ دوں گا "حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔" خدا آپ کو

جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔

والسلام

خاکسار آپ کا احسان مند

سیّد احمد

غلام عباس کا ایڈیٹر 'نیا دور' کے نام خط

السلام علیکم۔ میں سخت نادم ہوں کہ اس سے قبل آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے دل میں عہد کر رکھا ہے کہ خط جبھی لکھوں گا جب افسانہ بھیجوں گا۔ اس سے افسانہ لکھنے کی تحریک ہوگی مگر آپ کے خط نے مجھے اس عہد کو توڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں جب سے لندن آیا ہوں بی۔بی۔سی کے کاموں میں اس قدر منہمک رہا ہوں کہ ایک سطر تک نہ لکھ سکا۔ میرے سارے احباب مجھ سے ناراض ہو گئے ہوں گے اور غالباً آپ بھی۔ اگر ایسا ہے تو از راہ کرم آپ مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ کی ناراضی میرے لیے سخت تکلیف کا باعث ہے کیوں کہ آپ نہ صرف میرے عزیز و محترم دوست ہیں بلکہ محسن بھی۔

تین چار روز سے میں نے آپ کے لیے ایک چیز لکھنی شروع کی ہے۔ امید ہے اس سال کے ختم ہونے سے پہلے پہلے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ خدا کرے کہ اب کے میں اس وعدے کو نبھا سکوں۔

لندن میں آکر مجھے زیادہ تر مایوسی ہوئی ہے۔ البتہ کتابوں کی بہتات ہے اور کوڑیوں کے دام۔ صرف یہی ایک جاذبیت ہے جو مجھے لندن رہنے پر اکساتی رہتی ہے ورنہ میں اب تک واپس آگیا ہوتا۔

"نیا دور" کا پرچہ مل گیا۔ بہت بہت شکریہ۔ یہاں بہت سے لوگوں نے اسے ذوق و شوق سے پڑھا۔ منیب الرحمان اکثر بی۔بی۔سی میں آتے رہتے

ہیں اور کام بھی کرتے ہیں۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔

والسلام

غلام عباس۔

علامہ اقبال کا خط مولانا احسن مارہروی کے نام

مکرم بندہ جناب میر صاحب! السلام علیکم۔

دونوں رسالے پہنچے، سبحان اللہ! نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے 'گلدستے' کو کوئی غزل نہیں دی، انشاء اللہ تعالیٰ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں، اگر آپ کے پاس استاذی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمائیے گا؛ بہت ممنون ہوں گا۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمائیے گا کہ کہاں سے مل سکتی ہے۔ میں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعراء کے فوٹو کے لیے امریکہ لکھا ہے۔ غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو از راہ عنایت جلد مطلع فرمائیے۔ حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔ والسلام۔

خاکسار

محمد اقبال

از لاہور۔ گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس

۲۸، فروری ۱۸۹۹ء

داغ دہلوی کا خط حکیم قمرالدین کے نام

حکیم صاحب مسیحائے زماں! سلمہ الرحمان۔

سلام و مسنون کے بعد دعا نگار ہوں۔ آپ کا کارڈ پہنچا۔ آپ کی عبارت مصفٰی کس قدر بلیغ ہے۔ آپ نے میرے انتقال کی جو خبر سنی میں بھی اس کو سچ سمجھتا ہوں ؎

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں
زندگی کا کوئی حساب نہیں

آپ نے ایک مرتبہ میرے مرنے کی خبر سنی، میں ہر سال سنتا ہوں اور اسی کو اپنی سال گرہ سمجھتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ جن رئیس نے میرے زندہ ہونے کی تصدیق کی تھی وہ چل بسے۔ خدا ان کو جنت نصیب کرے اور مجھے اور آپ کو بھی۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اس دلسوزی سے داغ کو یاد فرمایا۔ ع

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

داغ دہلوی

چکبست کا خط لالہ سری رام کے نام

جناب والا! تسلیم۔

آپ نیاز مند کے سوانحی حالات دریافت کرتے ہیں؛ حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ اوّل تو میں باضابطہ شاعر ہی نہیں ہوں۔ تخلص کا بھی گناہ گار ہی ہوں۔ چکبست میرا عرف ہے نہ کہ تخلص۔ سولہ سترہ برس سے شعر و سخن کا مذاق ضرور ہے، لیکن ایک دیوان بھی تیار نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں مجھے باضابطہ شاعروں کے زمرے میں داخل کرنا ہی بیکار ہے۔ مگر خیر مجموعہ میں تو میرا نام آ ہی گیا۔ اب آپ کو زندگی کے حالات کیا لکھوں۔ لکھنؤ وطن ہے۔ عمر تقریباً اٹھائیس سال ہے۔ اپنے دوستوں کا دل بہلانے کو کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہوں۔

پرانے رنگ کی شاعری یعنی غزل گوئی سے ناآشنا ہوں، لیکن اس کے ساتھ میرا عقیدہ یہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ مروڑ کر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے۔ لیکن میں پھر آپ کو لکھتا ہوں کہ میں قدر دان سخن ہوں سخنور نہیں ہوں۔ جس کا نام شاعری ہے وہ اور چیز ہے جو بہر حال مجھے نصیب نہیں۔

(چکبست)

صفیہ کا خط اپنے خاوند جاں نثار اختر کے نام

نینی تال

۱۴؍جون ۱۹ء

اختر میرے!

خط ملے۔ میں دو دن سے وعدے کے باوجود خط نہ لکھ سکی۔ بارش نے عجیب بدمزگی پیدا کر رکھی ہے۔ پھر چونکہ عثمان کھانا پکاتا ہے اس لیے بچوں کی پوری نگرانی میرے ہی سر آجاتی ہے۔ بُری طرح تھک کر رہ جاتی ہوں۔

تمہاری محبت کتنی راحت افزا اور ساتھ ہی کتنی اذیت انگیز ہے۔ تم نینی تال کی سرد ہواؤں کو شک کی نظر سے نہ دیکھو یہاں تو "چھٹے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں" والا عالم ہے۔ یہاں کتنے شادی شدہ جوڑے دکھائی دیتے ہیں مگر مجھے تو کہیں بھی وہ رنگ، وہ گرمی، وہ گداز اور وہ والہانہ پن نہ دکھائی دیا جو ان سات سالوں نے ہم دونوں کے درمیان پیدا کر دیا ہے۔

میری زندگی میں تمہاری مرکزیت تسلیم ہو چکی ہے۔ یقین کرو ایک شام بھرے بازار میں راستہ طے کرتے کرتے نہ جانے طبیعت پر کیسا اثر ہوا کہ آنسو اُمڈنے شروع ہو گئے اور کسی طرح نہ رک سکے تو بہانہ بنا کر ایک پانی کے نل پر جا کر منہ دھونا پڑا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تم بیمار تھے۔

اختر میرے لیے یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں اس امید اور یقین پر خوش ہوں کہ میری زندگی ایک دن پھر تمہارے قدموں کے سائے میں گزرے گی۔

تمہاری تنہائی کے خیال سے جی کس بری طرح کڑھتا ہے۔ ہر لمحہ خیال دوڑاتی ہوں کہ نہ جانے اس وقت کیا کر رہے ہو گے۔ تمہاری راحت اور آسائش کے لیے دور سے کیا کروں؟ کھانے کے تم شوقین نہیں، پہننے کی طرف سے تم بے خبر ہو، پھر اور کیا رہ گیا ہے؟ بہرحال تمہارے لیے کشمیری سلک ضرور لوں گی۔

رات بڑی شدید بارش ہوئی، کمبل میں سردی لگتی رہی اور تمہارے آغوش کا تصور آرام دیتا رہا۔

اور کیا لکھوں؟ کتنی بے شمار اور بے حساب باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یاد کرو ہفتوں ہماری گفتگو ختم نہیں ہوا کرتی تھی۔

اس وقت پلنگ پر کمبل لپیٹے، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی خط لکھ رہی ہوں۔ ایک طرف جادو لیٹا ہے دوسری طرف اولیس۔ دونوں رہ رہ کر جھٹکا دیتے ہیں، میں ہل جاتی ہوں۔ جادو اُٹھ کر خط پڑھنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اولیس اس سے بے نیاز ہے۔ آؤ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دو۔ میری دنیا جگمگا اُٹھے گی۔

تمہاری اپنی

صفیہ

بابائے اُردو کا ایک خط

اورنگ آباد

۲ ر نومبر ۱۹۸۵ء

میرے شفیق اور مکرم!

اس عرصے میں آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے اپنا قاعدہ بذریعہ رجسٹری آپ

کی خدمت میں بھیجا تھا اس کی بھی رسید نہیں آئی۔ اس سے کس قدر تشویش ہے۔ خدا کرے آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہو۔

۲۵ - ۲۶ ر اکتوبر ہمارا کالج ڈے تھا۔ مسٹر حیدری مسعود اور عثمانیہ کالج کے اکثر پروفیسر اور بہت سے لوگ آئے تھے۔ ۱۲۶۱ھ کا مشاعرہ جو بہادر شاہ کے زمانے میں ہوا تھا اور جس میں غالب، مومن، ذوق اور دوسرے بڑے بڑے شعرا شریک تھے سب اسی صورت اور لباس میں دکھائے گئے تھے۔ اسے دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے علمی اور تفریحی مشاغل تھے۔ سب لوگ بہت خوش اور مداح تھے۔

نیازمند
عبدالحق (بابائے اُردو)

خط کے مطالعہ کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیے:

مکاتیب غالب، اقبال نامہ، مکتوبات نیاز، مشاہیر کے خطوط، خطوط افضل حق، مکاتیب نمبر نقوش، غبار خاطر (ابوالکلام آزاد)، لیلیٰ کے خطوط (عبدالغفار)، گویا دبستان کھل گیا، (محمد علی ردولوی)، بار خاطر (شوکت تھانوی)، روح مکاتیب (ساغر نظامی)، نقوش زنداں (سجاد ظہیر)، زیر لب (صفیہ اختر)، حرف آشنا (صفیہ اختر)، باتیں ہماریاں (عصمت شکیل)۔

جزو ہفتم

مضمون نگاری

(۳۰ نمبر)

باب ۱۹

مضمون نگاری

کسی موضوع کو دلیلوں، مثالوں اور حوالوں سے تشریح و توضیح کے ساتھ مناسب ترتیب اور موزوں الفاظ میں پیش کرنا مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون کئی طرح کے ہو سکتے ہیں :

۱۔ ادبی مضامین جیسے اقبال کی شاعری، زندگی اور ادب۔ حالی کی قومی شاعری۔ میرا محبوب شاعر۔

۲۔ سیاسی مضامین جیسے طلبہ اور سیاست۔ بنیادی جمہوریتیں۔

۳۔ مجلسی مضامین مثلاً رسم و رواج۔ جہیز کی رسم۔ عورتوں کے حقوق۔

۴۔ تعلیمی مضامین جیسے تعلیم نسواں۔ مخلوط تعلیم۔ ہمارا نظامِ تعلیم۔

۵۔ مذہبی و اخلاقی جیسے اسلامی طرزِ زندگی۔ اسلام اور مساوات۔

۶۔ تخیلی مضامین جیسے ایک خواب۔ اگر میں شاعر ہوتا، ایک کرسی کی آپ بیتی۔

۷۔ متفرق مضامین جیسے موسم گرما کی ایک رات۔ صحت افزا مقام کی سیر۔ سینما بینی وغیرہ۔

نفس مضمون کے لحاظ سے مضمون کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں :

۱۔ بیانیہ : سوانح، تاریخی واقعات، حادثات وغیرہ جیسے قائداعظم، ایک حادثہ۔

۲۔ فکریہ : فکری اور استدلالی موضوعات، اخلاقیات، مباحثے، موازنہ و مقابلہ وغیرہ جیسے حب وطن۔

۳۔ تعریفیہ : کسی جگہ یا چیز یا مناظر قدرت سے متعلق جیسے چاندنی رات۔

مضمون لکھنے کے لئے ضروری ہدایات

۱۔ مضمون لکھنے کے لئے عموماً چار پانچ موضوع دیئے جاتے ہیں۔ آپ ہمیشہ اس موضوع کو منتخب کریں جس کے متعلق آپ کی معلومات وسیع ہوں۔

۲۔ موضوع کے انتخاب کے بعد غور سے دیکھیں کہ کس پہلو پر بحث کرنی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ موضوع کو اچھی طرح نہ سمجھیں اور غیر متعلق چیزیں لکھتے رہیں۔ مثال کے طور پر حالی کی غزل پر مضمون لکھنا ہو تو اس بات کی ضرورت نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ، حالی کے مفصل حالات زندگی، حالی کی تنقید نگاری، سوانح نگاری اور نظم گوئی پر بحث کرتے رہیں، بلکہ براہ راست حالی کی غزل پر لکھنا چاہئے۔ اگر آپ کو پاکستانی بازار کا حال لکھنا ہو اور آپ ملک کی تجارتی اور صنعتی پالیسی پر تنقید کرتے رہیں۔ مضمون اصل موضوع ہی سے متعلق ہونا چاہیے۔

۳۔ مضمون لکھنے سے پہلے اس کا خاکہ تیار کر لینا چاہیئے۔ یہ خاکہ ذہن میں تیار کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان خیالات کو مناسب ترتیب دیں اور ان کی ضمنی سرخیاں قائم کریں۔ مثلاً شبلی کی ادبی خدمات پر مضمون لکھنا ہے تو یہ سرخیاں بنائی جا سکتی ہیں:۔ سرسید اور شبلی، شبلی بحیثیت تنقید نگار، شبلی بحیثیت سوانح نگار، شبلی کی سیرت نگاری، شبلی ایک شاعر وغیرہ یا قائداعظم پر مضمون لکھنا ہے تو یہ عنوانات قائم کئے جا سکتے ہیں:۔ پیدائش، بچپن، تعلیم، ذاتی خوبیاں، سیاست میں دلچسپی، کارنامے، ایک عظیم راہنما، معمار پاکستان وغیرہ۔

۴۔ مضمون کے تین حصے ہوتے ہیں:۔ (۱) تمہید (۲) نفس مضمون (۳) اختتام۔ ایک اچھی تمہید اور مناسب اختتام سے مضمون کی قدر و قیمت بہت بڑھ جایا کرتی ہے۔ جس قدر تمہید اعلیٰ درجہ کی ہوگی پڑھنے والے پر اچھا اثر ڈالے گی۔ اسی طرح مناسب اختتام سے دیرپا اثر پیدا ہوتا ہے۔ تمہید مختصر اور

موزوں ہونی چاہیے۔ طویل تمہید تضیع اوقات ہے۔ مضمون کی ابتدا کسی شعر، مصرع یا مقولہ سے کی جا سکتی ہے۔ بعض موضوعات میں براہِ راست نفسِ مضمون کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔

۵۔ تمہید اور اختتام کے درمیانی حصہ کو اصل موضوع پر مفصل بحث کے لئے وقف کر دینا چاہیے۔ ضمنی عنوانات پر پیراگراف ہونے چاہئیں اور ان کا آپس میں گہرا ربط ہونا چاہیے۔ ضرورت سے زیادہ طوالت بھی بیکار ہوتی ہے۔ وقت [illegible] کی پابندی کو ہمیشہ مدنظر رکھ کر لکھنا چاہیے۔ اگر مضمون [illegible] کی پابندی ہے تو تجاوز کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

۶۔ اگر مضمون میں گنجائش ہو تو ذاتی تجربات و مشاہدات سے فائدہ اٹھائیے اس سے مضمون [illegible]

۷۔ [illegible] موقع ضرب المثل، شعر، مصرع، مقولہ وغیرہ لکھ سکتے ہیں۔ اس سے عبارت میں زور پیدا ہوتا ہے اور مضمون نگار کی قابلیت اور معلومات کا بھی پتہ چل جاتا ہے لیکن طویل تاریخی قصے کہانیاں لکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ شعر یا مصرع عبارت کے بعد نئی سطر پر لکھنا چاہیے۔

۸۔ ہر مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مناسب زبان استعمال کرنی چاہیے۔ ثقیل اور مشکل الفاظ استعمال کرنا کوئی اچھا اثر پیدا نہیں کرتا بلکہ عبارت کا لطف جاتا رہتا ہے۔ زبان سادہ، عام فہم اور واضح ہونی چاہیے۔ البتہ موقع محل کے مطابق محاورات و تشبیہات وغیرہ مضمون کی افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

جس موضوع پر مضمون لکھا جا رہا ہو اس سے گہری واقفیت ضروری ہے ورنہ غلطی کا امکان ہے۔ کوئی چیز مشاہدے کے خلاف نہیں ہونی چاہیے مثلاً

آپ ہاکی کے میچ پر مضمون لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک کھلاڑی نے سنٹر سے کک لگائی اور گول ہو گیا، حالانکہ ہاکی میں ہٹ لگائی جاتی ہے اور سنٹر سے گول نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اصطلاحات اور محاورات کے استعمال پر بھی پورا پورا عبور حاصل ہونا چاہیے۔

۹۔ آپ بلا تامل اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہ نہ سوچیے کہ شاید ممتحن آپ کے خیالات سے اتفاق نہ رکھتا ہو۔ ممتحن تو یہ دیکھتا ہے کہ آپ نے اپنے خیالات کی تائید کس طرح کی ہے اور ان کے اظہار کے لئے کیسی زبان استعمال کی ہے۔ البتہ کسی پر نکتہ چینی کرتے وقت اعتدال کی حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ نیز مذہبی جھگڑوں پر بحث کرنے سے پرہیز ضروری ہے۔

۱۰۔ مضمون لکھتے وقت خوشخطی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اگر آپ زیادہ خوشخط نہیں لکھ سکتے تو کم از کم اس بات کا خیال رکھیے کہ عبارت صاف ہو اور آسانی سے پڑھی جا سکے۔

۱۱۔ مضمون لکھ کر اس پر نظرِ ثانی کرنا نہایت ضروری ہے بلکہ آپ کو کہیں عبارت بے جوڑ معلوم ہو گی، کہیں املا کی غلطیاں ہوں گی، کہیں قواعدِ زبان کے خلاف الفاظ یا مرکبات لکھے گئے ہوں گے۔ کہیں بلا ضرورت کوئی لفظ مکرر لکھا گیا ہو گا۔ نظرِ ثانی سے ان باتوں کی تصحیح ہو جاتی ہے۔

۱۲۔ رموزِ اوقاف سے واقفیت ضروری ہے۔ اوقاف ان علامتوں کو کہتے ہیں جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے، یا کسی جملے کے ایک حصے کو دوسرے حصوں سے علیحدہ کریں۔ ان اوقاف کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اول تو ان کی وجہ سے نظر کو سکون ملتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ذہن ہر جملے یا جزوِ جملہ کی اصلی اہمیت کو جان لیتا ہے اور مطلب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً اس جملے کو پڑھیے "رو کو مت آنے دو" اور (۲) "رو کو مت، آنے دو۔" محض ، وقف سے معنی

بدل گئے ہیں۔

رموزِ اوقاف PUNCTUATION

وقفوں کے اظہار کے لیے مندرجہ ذیل علامتیں استعمال کی جاتی ہیں :

۱۔ سکتہ یا چھوٹا ٹھہراؤ (COMMA) [،] : یہ سب سے چھوٹا وقفہ ہے جو فقرے کے اندر توقف کے لئے لگایا جاتا ہے۔ مثلاً

(ا) ایسے الفاظ و محاورات کے درمیان جو حرف عطف کے ذریعے مربوط نہ ہوں جیسے "آتش ، آب ، خاک ، باد ، بجلی ، گرج وغیرہ کے لئے ایک ایک دیوتا تھا۔" اگر آخری لفظ کے قبل "اور" واقع ہو تو اس سے پہلے سکتہ نہیں آتا۔

(ب) مخاطب کو خطاب سے ممیز کرنے کیلئے جیسے "دوستو ، میری بات سنو۔"

(ج) نفی ، تاکید اور تنبیہہ کے لئے جیسے "نہیں ، میں نہیں جاسکتا۔"

(د) الفاظ کے ہر گروہ کے بعد یا فقرے کے تشریحی اجزا کے بعد جیسے لڑائی جھگڑا ، عشق و محبت ، حسد اور نفرت ، دشمن کا خوف ، یہ سب عقلِ حیوانی کے تقاضے ہیں۔

لائی حیات ، آئے ، قضا لے چلی ، چلے
اپنی خوشی نہ آئے ، نہ اپنی خوشی چلے

جب مطلع صاف ہوگیا اور سورج نکل آیا ، تو میں اپنے گھر سے نکلا۔

(ہ) عبارت اور خصوصاً شعر کی تعقید دور کرنے کے لئے۔ ع

نہیں بہار کو فرصت ، نہ ہو ، بہار تو ہے

۲۔ وقفہ (SEMI-COLON) [؛] : جب سکتے سے زیادہ ٹھہراؤ کی ضرورت پڑے تو وقفہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

آنا ، تو خفا آنا ؛ جانا تو رلا جانا۔

تم روئے اور ہمارا دل بے چین ہوا ؛ تمہاری انگلی دکھی تو ہمارے دل پر چوٹ لگی ؛ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہم بیٹھے ؛ کندھے سے لگایا ، چمکارا ، لوریاں سنائیں ؛ غرض کہ

جان، مال، آرام سب کچھ تمہارے لئے تج دیا۔ کیا اس کا یہی صلہ ہے ؟

۳۔ رابطہ (COLON) [:] اس کا ٹھہراؤ وقفے کے ٹھہراؤ سے زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے کسی حکیم کا قول ہے : آپ کاج مہا کاج۔

رپورٹ کے آٹھویں صفحے پر لکھا ہے : "........"

بعض اوقات رابطہ کے آگے چھوٹا سا خط بھی کھینچ دیتے ہیں (:-) لیکن اس صورت میں کہ عبارت نئے پیرے سے شروع ہو۔

۴۔ ختمہ (FULL STOP) [-] :- اردو میں پورا وقف نقطے (٠) کی بجائے چھوٹے سے خط سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ علامت وہاں لگائی جاتی ہے جہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ جملہ ختم ہو گیا۔ مثلاً ماں باپ کی خدمت کرو۔

انگریزی مخففات کے بعد بھی ختمے کی علامت لگائی جاتی ہے جیسے بی۔ اے، ایم۔ اے، پی۔ سی۔ ایس۔

۵۔ واوین (INVERTED COMMAS) [" "] جب کوئی اقتباس دیا جاتا ہے یا کسی کا قول اسی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے تو اس کے اوّل آخر یہ علامت لگائی جاتی ہے۔ مثلاً

اس نے جواب دیا "میں کل لاہور جاؤں گا"۔

۶۔ قوسین (BRACKETS) [( )] : یہ علامتیں ایسے الفاظ کو علیحدہ کرنے کے لئے لگائی جاتی ہیں جو ایک فقرے کے اندر ہونے کے باوجود اس کا جزو نہ سمجھی جائیں۔ مثلاً مبارک علی میاں (جو کل آپ سے ملنے آئے تھے) کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی بندوق ہے۔

خضر (بہ فتح ثانی) بھی صحیح ہے اور خضر (بہ سکون ثانی) بھی۔

بہت سے لکھنے والے قوسین کو استعمال نہیں کرتے۔

۷۔ ندائیہ۔ فجائیہ (NOTE OF EXCLAMATION) [!] ندائیہ جملے میں،

جیسے اجی حضرت ! اجی قبلہ !
کسی جذبے کے اظہار کے لئے جیسے افوہ ! کتنی گرمی ہے۔ سبحان اللہ !
کبھی تنبیہہ کے لئے مثلاً خبردار ! تمیز سے بیٹھو۔

۸۔ سوالیہ (NOTE OF INTERROGATION) [?]

سوالیہ جملے کے آخر میں یہ علامت لگائی جاتی ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ؟

۹۔ خط (DASH) [—] ۔ یہ علامت جملہ معترضہ کے بعد آتی ہے۔

جب ہم لورالائی پہنچے —— لورالائی بلوچستان ہی میں نہیں جرمنی میں بھی ہے —— تو سورج غروب ہو چکا تھا۔

اُردو زبان کا ارتقاء

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اُردو ہماری قومی زبان ہے جو پاکستان کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس کی عمر بہت کم ہے۔ بولی کی حیثیت سے اس کا آغاز گیارہویں صدی کے بعد آہستہ آہستہ ہوا اور کئی سو سال میں یہ بولی کی حد سے نکل کر علمی و ادبی زبان بنی۔

اب سے کوئی پانچ ہزار سال پہلے وسط ایشیا سے ایک بہادر قوم اٹھی اور پنجاب کی راہ سے برصغیر پاکستان و ہند میں داخل ہوگئی۔ اس قوم کا نام آریہ تھا۔ انہوں نے اپنے نام پر ہندوستان کا نام آریہ ورت رکھا جس کے معنی آریاؤں کے وطن کے ہیں۔ اس طاقتور قوم نے یہاں کے اصل باشندوں، کول دراوڑ وغیرہ کو جنوب کی طرف بھگا دیا اور بعض کو غلام بنا لیا۔ یہ لوگ پنجاب اور گنگا جمنا کے زرخیز و شاداب علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ان آریوں کی زبان سنسکرت تھی جس کے معنی آراستہ پیراستہ اور مقدس دیوتاؤں کی زبان کے ہیں۔ یہ زبان بڑی پاکیزہ اور مقدس خیال کی جاتی تھی، حتیٰ کہ کسی غلام وغیرہ کو اس کے سننے اور بولنے کی اجازت نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شودر کسی برہمن کے منہ سے سنسکرت کے الفاظ سن لیتا تھا تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا دیا جاتا تھا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ گمان ہے کہ اس دور میں بولی کی زبان کوئی اور تھی جس کا نام پراکرت یعنی خودرو زبان رکھا گیا۔ آہستہ آہستہ آریوں کی زبان اور دیسی زبان میں میل جول شروع ہوا اور دونوں زبانوں کے الفاظ سے مل کر مختلف بولیاں رائج ہوگئیں جو عام لوگ کاروبار اور لین دین میں استعمال کرتے تھے جس طرح آج ہم اپنے اپنے

صوبوں میں اپنی اپنی علاقائی زبانیں کام میں لاتے ہیں۔ سنسکرت کا استعمال آہستہ آہستہ محدود ہوتا گیا یہاں تک کہ اس کے سمجھنے اور بولنے والے صرف چند برہمن یا پنڈت رہ گئے۔

رفتہ رفتہ ہر علاقے کی پراکرت میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا اور ان کے نام بھی بدل گئے۔ مثلاً مگدھ کے علاقے میں ماگدھی، میرٹھ کے علاقے میں مہاراشٹری اور متھرا کے علاقے میں برج یا شورسینی پراکرتیں رائج تھیں۔ برج کو برج بھاشا یا برج بھاکا بھی کہا جاتا ہے جسے محققین کا ایک گروہ اردو کا ماخذ قرار دیتا ہے۔

بعض پراکرتوں نے ترقی کی اور بولی کی حد سے نکل کر ادبی صورت اختیار کر لی۔ مثلاً ماگدھی پراکرت نے 'پالی' کا روپ دھارا جسے مہاتما بدھ نے اپنے مذہب کے پرچار کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح شورسینی کی ایک صورت مغربی ہندی بنی۔ ایسی بولیوں کی عوامی صورت بھی قائم رہی۔ اس کو پراکرت کا 'اپ بھرنش' روپ کہتے ہیں یعنی ماگدھی پراکرت کا ادبی روپ، پالی اور عوامی صورت ماگدھی اپ بھرنش ہے۔

راجہ بکرماجیت نے سنسکرت کو پھر زندہ کرنے کی کوشش کی مگر اسے عروج حاصل نہ ہو سکا۔ عوام پراکرتیں بولتے رہے۔

غیر ملکی حملہ آوروں نے ان بولیوں کو متاثر کیا۔ چنانچہ بے شمار الفاظ عربی، یونانی اور ترکی کے یہاں کی زبان میں شامل ہو گئے۔ آخر بدلتے بدلتے یہاں کی بولیوں میں سے برج بھاشا نے ترقی کر لی اور شمالی ہندوستان کے ایک وسیع علاقے میں بولی جانے لگی۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا تو اس اسلامی حملے سے مسلمانوں کی زبان اور تہذیب و معاشرت کا اثر سندھ پر پڑا۔ پھر سلطان محمود غزنوی نے حملے کئے تو اس دوران میں فارسی زبان ہندوستانی زبان پر برابر اثر انداز ہوتی رہی۔ شہاب الدین غوری حملہ آور ہوا تو اس وقت یہاں کا زبردست راجہ پرتھوی راج تھا۔ اس کے درباری شاعر چندر بردے نے اس کے عہد حکومت کے

بارے میں ایک کتاب " پرتھوی راج راسو " بھاشا زبان میں لکھی۔ اس میں عربی فارسی کے بہت سے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔

شہاب الدین غوری کے بعد قطب الدین ایبک نے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی اور فارسی کو فاتحانہ حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس وقت سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا آپس میں مستقل میل جول شروع ہوا اور فارسی، عربی اور ترکی کے الفاظ یہاں کی پراکرتوں میں شامل ہوتے گئے۔ چنانچہ فارسی اور ہندی نہ صرف ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں بلکہ ایک نئی زبان معرض وجود میں آنے لگی۔

لاہور کے بعد جب دہلی دارالحکومت بنا تو پنجاب کے باشندوں کے ساتھ ان کی زبان بھی دہلی پہنچی اور رفتہ رفتہ ترقی کے مراحل طے کرنے لگی۔ دہلی سے مسلمانوں کا سیلاب بنگال، دکن اور گجرات کی طرف بڑھا اور یہ نئی زبان جو اس وقت ابتدائی حالت میں تھی فتوحات کے سیلاب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلنے لگی۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں پہلی مرتبہ یہ دکن پہنچی اور محمد تغلق کے عہد (۵۱ - ۱۳۲۵ء) میں دکن میں پھیلی جب کہ دولت آباد دارالخلافہ بنایا گیا اور اس دور میں حسن نے ۱۳۴۷ء میں بہمنی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان نے اُردو کے ابتدائی دور میں بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔

پٹھانوں کے بعد مغلیہ سلطنت قائم ہوئی۔ ان لوگوں کی بھی زبان فارسی تھی جس میں بہت سے عربی اور ترکی الفاظ ملے ہوئے تھے۔ نیز مغلوں کے عہد میں یورپ کی بعض قومیں ہندوستان میں آئیں اس لیے کچھ پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی الفاظ بھی شامل ہوتے گئے۔ اس طرح یہ زبان ترقی کے مراحل طے کرتی رہی۔ شاہجہان نے جب آگرے سے اپنا پایۂ تخت دہلی منتقل کیا تو پرانے شہر سے باہر ایک نئی بستی بسائی جس میں فوجیوں کے علاوہ دوسرے شہری بھی آباد ہوئے۔ وہاں یہ بولی مقبول ہوئی۔ چونکہ فوجی چھاؤنی کو اردو کہتے ہیں اس لئے اس علاقے کو جس میں شاہی قلعہ بھی تھا

اُردوئے معلیٰ کا نام دیا گیا۔ یہ زبان قدیم شہر دہلی میں بولی جانے والی زبان سے مختلف تھی اس لئے اسے زبان اردوئے معلیٰ کہا گیا۔ مغل شہزادے اور شہزادیاں اردو زبان بولنے اور سمجھنے لگیں۔ شاہجہان خود بھی اردو میں گفتگو کرتا تھا۔ اس شاہی سرپرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو کا نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک میں چرچا ہوگیا۔ جب دہلی اجڑی تو وہاں کے شاعر لکھنؤ پہنچے جہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور اس طرح اس زبان کو پورے ہندوستان نے مکمل طور پر اپنا لیا۔

دراصل بہت عرصہ تک اردو زبان کی رفتار سست رہی کیونکہ دفتری اور عدالتی زبان فارسی تھی اور سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے اس کی عزت اور حیثیت بڑھ گئی تھی۔ گویا قطب الدین ایبک سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک کا زمانہ اُردو کا عبوری دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں اردو صرف عوامی زبان کی حیثیت سے روزمرہ کی ضروریات کے لئے استعمال ہوتی رہی۔ علمی وادبی زبان فارسی ہی رہی البتہ فارسی اور ہندی شاعر کبھی کبھی تفنن طبع کے لئے شعر کہہ لیتے تھے جس میں کوئی لفظ فارسی کا اور کوئی ہندی کا ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایک مصرع فارسی کا اور ایک مصرع ہندی کا ہوتا تھا۔

امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۴ء) جسے اس لحاظ سے اردو زبان کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے، اس قسم کے اشعار کہتا رہا ہے۔ ؎

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

شاہجہاں کے عہد میں یہ زبان جسے اُردوئے معلیٰ یا ہندوستانی کہا جاتا تھا، عام بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ شاہجہاں کے عہد کے شاعر چندربھان برہمن کی اُردو زبان کی غزل کا شعر ہے ؎

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے

برہمن پہلا شاعر ہے جس نے باقاعدہ اُردو زبان استعمال کی ہے۔ اس دور میں نثر کا نام تک نہ تھا صرف نظم ہی نظم تھی۔ اسے ریختہ کہا جاتا تھا۔

ع سعدی کہ گفتار ریختہ در ریختہ در ریختہ

ریختہ سے مراد اُردو شاعری لی جاتی ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ریختہ کے علاوہ اس زبان کے لئے ہندوستانی، کھڑی بولی اور اُردوئے معلیٰ کے بھی نام استعمال ہوتے رہے۔ مصحفی پہلا شخص ہے جس نے اُردو کا لفظ استعمال کیا ہے ؎

خدا رکھے ہم نے سنی ہے میر و میرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے اور انہوں نے بھی ملکی مصلحتوں کی بنا پر اس نوزائیدہ بچے کو سایۂ عاطفت میں لیا اور یہ بڑی تیزی کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔

درحقیقت اُردو کی تخم ریزی غزنوی دور میں پنجاب میں ہوئی۔ دہلی، نواح دہلی اور دکن میں آبیاری ہوئی اور مغلیہ سلطنت کے زوال پر یہ برگ و بار لائی۔

رفتہ رفتہ اُردو نے ترقی کر کے فارسی کی جگہ لے لی۔ ولیؔ، حاتمؔ، میرؔ، سوداؔ میر حسنؔ، دردؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، جراتؔ، ناسخؔ، آتشؔ، نسیمؔ، نظیرؔ، انیسؔ، دبیرؔ، حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ وغیرہ نے اس کا دامن پھولوں سے بھر دیا۔

اُردو نثر لکھنے والوں میں ملاوجہی، فضلی، میرامن، حیدر بخش حیدری، رجب علی سرورؔ،

غالبؔ، سرسیدؔ، حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمدؔ، شررؔ، ذکاءاللہؔ اور آزادؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے طرح طرح کی ادبی اور علمی کتابیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

یہ ان سب لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اردو ایک ایسی زبان بن گئی ہے جو دنیا کی کسی بھی زبان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

"ہمارا فرض ہے کہ اردو بولیں، اُردو پڑھیں اور اُردو لکھیں۔ اُردو ہمارے بزرگوں کا مقدس ورثہ ہے جس کی حفاظت اور ترقی ہمارا اوّلین فرض ہے"۔

پسندیدہ شاعر ——— فیضؔ

انسان جب ادب کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اُسے بعض تحریریں اس قدر پسند آجاتی ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس پسندیدگی میں افتاد طبع اور مزاج کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ پھر یہ انتخاب وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مجھے شروع ہی سے شاعری سے لگاؤ ہے۔ اچھا شعر دل کو موہ لیتا ہے۔ اسی لئے لوگ مجھے رومان پسند کہتے ہیں اور بڑے تو اس کی وجہ میری شاعرانہ طبیعت بتاتے ہیں۔ میں صرف رومان پسند ہی نہیں۔ مجھے انسانیت سے بڑی محبت ہے اور اسی لئے میرا پسندیدہ شاعر فیضؔ ہے کیونکہ فیضؔ کسی خاص طبقے، فرقے یا ایک قوم کا شاعر نہیں بلکہ ساری انسانیت کا شاعر ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔ اس کی سرشت اسے عشق کے ساتھ ہم آہنگ ہونے پر اکساتی ہے لیکن وہ حقیقت کے روزن میں سے زندگی کی برہنگی اور تلخی پر ایک نظر کی ترغیب کو روک نہیں سکتا۔ ؎

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

رومان اور حقیقت کا حسین امتزاج ، رومانی عناصر، احساس کی شدت ، جذبات کا خلوص ، اچھوتا تصورِ حسن ، بیان میں اختصار و جامعیت ، رمزیت و ایمائیت ، اچھوتی تراکیب ، اشارے اور علامات ، انداز بیان کا تیکھا پن، فنکاری اور ندرت تخیل کا حسین امتزاج اور شاعری میں ایک امید افزا آدرش اور نصب العین یہ وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے مجھے فیض کا گرویدہ بنالیا ہے۔ اگرچہ ان کا کلام صرف چند مختصر مجموعوں —— نقش فریادی ، زندان نامہ ، دست صبا ، دست تہ سنگ اور سر وادئ سینا پر مشتمل ہے لیکن دورِ حاضر میں ان سے بڑھ کر کسی اور شاعر کو اتنی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

فیض نے جب میدان شاعری میں قدم رکھا تو حسن و عشق کی دنیا آباد نظر آئی ۔ اس کا نوجوان دل بھی حسن کی کشش سے بچ نہ سکا۔ چنانچہ ابتدائی دور اس کے حسن و عشق کی کشمکش کی داستان ہے ۔ وہ محبوب سے راز و نیاز اور چھیڑ چھاڑ میں اس قدر مگن ہے کہ دنیا کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہیں ۔ وہ کائنات اور تمام مظاہر فطرت کو صرف رخ محبوب کے نور سے دیکھتا ہے اور جب اس کے پرتو حسن سے کائنات میں رنگینیاں ہی رنگینیاں بکھر جاتی ہیں تو وہ بے خود ہو کر پکار اٹھتا ہے ؎

بکھر گیا جو کبھی رنگ پیرہن سرِ شام
نکھر گئی ہے کبھی صبح دوپہر کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پر سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
رنگ پیرہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

آج پھر حسن دلآرا کی سج دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ ہلکی سی حنا کی تحریر

شاعر تمام واردات اور تجربات بیان کرتا ہے جو راہ الفت میں پیش آتے رہتے ہیں۔ کہیں وصل و ہجر کا تذکرہ ہے، کہیں انتظار و مایوسی کے صدمات کا بیان ہے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

پھر ایک ایسا دور آتا ہے کہ فیض آگے بڑھتا ہے۔ گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اچانک چونک اُٹھتا ہے۔ وہ اپنی دنیا اور خارجی دنیا میں بڑا فرق محسوس کرتا ہے اور اس تلخ حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ دنیا صرف رنگ برنگ جلوؤں ہی سے معمور نہیں بلکہ یہاں بے رنگی، خزاں نصیبی اور غلاظت کے ڈھیر بھی ہیں۔ اسے ہر طرف غربت و افلاس، بھوک، ناداری اور ظلم و ستم کے عفریت منہ کھولے نظر آتے ہیں۔ خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے جسم اور رستے ہوئے ناسور اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اب اس کا غم ذات غم کائنات میں ڈھل جاتا ہے اور وہ پکار اُٹھتا ہے۔ ؎

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اب محبوب کی دلکشی کے مقابلے میں غم روزگار میں زیادہ دلفریبی نظر آتی

ہے۔ وہی فیض جو حسن دلآرا کے نکھار، سج دھج، خوابیدہ آنکھوں میں کاجل کی لکیر، رنگ رخسار پر غازے کا غبار، دلآویز خطوط، شفق کا مہکایا ہوا پیرہن، ٹمٹماتے ہوئے آویزے، غرض رنگ و بو کے ایک نورانی پیکر کا دلدادہ تھا۔ اب عام زندگی کے تلخ مسائل کو موضوع بناتا ہے۔ چنانچہ اس کا محبوب گوشت پوست کی بنی ہوئی ایک خاص ہستی نہیں بلکہ اس کی محبّت کا مرکز و محور وطن اور اس کے باسی ہیں اور وہ ان سے اسی طرح محبّت کرتا ہے جس طرح شروع میں اپنے محبوب سے کرتا تھا۔ ان کے عشق میں وہی شدّت، وہی جوش، وہی جذبہ اور وہی تڑپ ہے جو انہوں نے کسی مرمریں جسم کے لئے محسوس کی تھی۔ ؎

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

پس دیوار زنداں میں بھی شاعر لیلائے وطن کے تصور ہی تصور میں محو کلام رہتا ہے۔ ؎

بجھا جو روزن در تو دل نے سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پہ بکھر گئی ہو گی

فیض نے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں لیکن رجائیت اور امید آفرینی نے ان کے رومانیت آمیز کو اور دل کش بنا دیا۔ سیاسی جدوجہد میں قدم قدم پر ناکامی اور شدید ردعمل —— یہ ایسے عوامل ہیں جن کی زہرناکی بیان کی حلاوت میں تلخیوں کا زہر گھول دیتی ہے لیکن فیض کے یہاں ایسے مقامات بہت کم ہیں جہاں جذبے کی شدت نرمیٔ گفتار پر غالب آگئی ہو ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیضؔ کے جذبۂ محبت میں اس قدر وسعت ہے کہ تمام عالمِ انسانیت اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ انسان کے بہیمانہ کاموں کو دیکھ کر ان کا دل شدید نفرت کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف تاریکی اور مایوسی کے مہیب سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں سے امید یا نور کی کرن نظر نہیں آتی جس سے ہمت بندھ سکے، پھر بھی اس اندھیرے میں وہ سرگرم عمل ہیں اور اس ظلمتِ شب کو نورِ سحر کرنے کے درپے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ ایک دن انسانیت کی سربلندی و عظمت کا آفتاب ضرور طلوع ہوگا اس لئے وہ مایوس نہیں۔ ؎

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

مستقبل کی طرف امید افزا اشارے کس قدر حسین اور خوبصورت ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد زندگی سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی جد و جہد کا نام ہے اور یہی فیضؔ کی شاعری کا کمال ہے ؎

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

فیضؔ کے چند اشعار

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

فیضؔ زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا اگر وفا شعار نہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تیری عاقبت سنوار چلے

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

قومی تعمیر اور طلبہ کی ذمّہ داریاں

قومی تعمیر کے سلسلے میں ملک کے طالب علموں کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ تعمیر و ترقی کا کارواں اسی صورت میں رواں دواں رہ سکتا ہے جب کہ اسے نوجوان ذہنوں ــــ جوان خیالوں اور انتھک محنت کرنے والوں کی حمایت حاصل ہو ــــ ظاہر ہے کہ یہ تازہ جذبات اور شگفتہ ولولے جس مقدار میں طلبہ کے دائرے سے نسبت رکھتے ہیں، کسی دوسرے طبقے میں ان کی اتنی مقدار نہیں پائی جاتی۔ یہ حقیقت ذہن نشین کر لینے کے بعد ملک کی تعمیر کے ضمن میں ہمارے طلبہ کی ذمہ داریاں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے طلبہ قومی فرائض اور ملکی ذمہ داریوں سے موجودہ دور میں کہاں تک عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں یہ اعتراف ہے کہ نوجوان طالب علموں پر

تعلیمی مراحل طے کرنے کے فرائض عائد ہوتے ہیں اور یہ ایسے فرائض ہیں جنہیں ہر حال میں ایک اوّلین حیثیت حاصل ہے ـــــ اس کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تعلیمی راہگزاروں میں چلتے ہوئے طلبہ کو مشکلات کی کن کن چٹانوں سے متصادم ہونا پڑتا ہے ۔ ان سب باتوں کے باوجود اس چیز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم کا مقصد ایک فرد کی تعمیر ہی نہیں ، بلکہ بالواسطہ یہ ایک پورے معاشرے کی تعمیر ہے ۔

اب جبکہ ہماری زندگی نئے حالات کی آغوش میں آچکی ہے ۔ نئے موضوعات ہماری قوتِ فکر کو دعوتِ غور و فکر دے رہے ہیں ۔ نئی راہیں متعین ہو رہی ہیں ۔ قومی راہ گزار کے مسافر نئے عزائم اور نئے ولولوں کے جلو میں ارتقاءِ حیات کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ اس لحاظ سے اور ان حالات کا احترام کرتے ہوئے تعلیم و تدریس کے طالبان کو بھی ایک نئے اندازِ فکر سے آگے بڑھنا ہے ۔

قوم کی تعمیر اور ملک کا استحکام اسی صورت میں ممکن ہے کہ طلبہ ذہنی طور پر تسلیم کر لیں کہ قومی تعمیر و ترقی کے رجحانات و احساسات کا فروغ بھی ان کی نصابی تعلیم ہی سے منسلک ہے ۔ اس بارے میں سکول اور کالج کے اساتذہ تعلیمی نقطۂ نگاہ میں قومی اندازِ فکر کو شامل کر لیں اور طلبہ کے افکار و جذبات کو بھی اس میدان میں اتاریں تو یہ ایک بہت بڑی قومی خدمت ہو گی ۔

یہ امر وضاحت طلب نہیں ہے کہ تعمیر قوم و ملک کے سلسلے میں طلبہ کو کون کون سے کام کرنے چاہئیں ۔ ہمارے خیال میں اگر ہمارے طالب علم قوم کی فلاح و بہبود کے نکتے کو سمجھ لیں تو ان کے قومی فرائض ان پر وضاحت کے ساتھ روشن ہو سکتے ہیں ۔ تعطیلات اور خصوصاً موسم گرما کی چھٹیوں میں نصابی تعلیم کے علاوہ بہت سا وقت قومی تعمیر کے لئے وقف کرنا ضروری ہے ۔ طلبہ خواہ اپنی رہائشی جگہوں پر رہیں یا گرمی سے بچنے کے لئے کسی پہاڑی فضا کو اپنائیں ، دونوں صورتوں میں یہ بات کبھی فراموش نہ کریں کہ نئے حالات نے ان پر قومی تعمیر کی ذمہ داریاں بھی عاید کر دی ہیں ۔

آزادی تو ہم نے حاصل کر لی، مگر اس آزادی کو عوام کی زندگی پر اثر انداز کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اس وقت نئے دور کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ ایک طرف ہمارے حالات ہیں جن میں احتیاج اور جہالت کی تاریکی ہماری منزل کو دھندلا رہی ہے اور ہم اس تاریکی کو روشنی میں بدلنے کے خواہاں ہیں۔ دوسری طرف سائنس کے کمالات کی روشنی ہماری نئی پود کی آنکھوں کو چکا چوند کر رہی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام جہاں بھی گیا ہے اس نے ایک نئی روح پھونکی ہے، ایک ولولہ پیدا کیا ہے اور زندگی کو نیا مفہوم عطا کیا ہے۔ اسلام نے اپنے اصول بنائے اور اپنی اقدار قائم کیں۔ انہی اقدار کے لیے مسلمانانِ ہند نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے وطن عزیز میں علم کی روشنی پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ عوام کو علم کی دولت سے مالا مال کر کے انہیں اسلامی مقصد حیات سے آگاہ کیا جا سکے۔ جب عوام میں یہ شعور پیدا ہو جائے گا کہ پاکستان کے شہری ہونے کے سبب ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں تو اس کے بعد ہی ہم اپنے ذرائع کو ترقی دے سکیں گے، اخلاقی اور روحانی معیار کو بلند کر سکیں گے اور اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے قابل بنا سکیں گے۔ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے زندگی کی ترقی پسندانہ تعمیر و تطہیر ہو سکتی ہے۔

ہماری نئی پود یعنی طلبہ ہی اس ذمہ داری کو سنبھال سکتے ہیں۔ ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وطن عزیز کی ترقی، تعمیر اور استحکام کا بیڑا اٹھائیں اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں بزرگوں کا ہاتھ بٹائیں جس میں اسلامی اقدار، اخلاقی کردار اور روحانی بلندی کے امتزاج سے ایک ایسی فضا پیدا کی جا سکے جس سے معاشی فروغ حاصل کیا جائے۔ طلبہ کا مقصدِ حیات صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ ڈگریاں حاصل کر کے ملازمتوں کے چکر میں پھنس کر رہ جائیں بلکہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے وطن اور قوم کی سربلندی اور سرفرازی کا موجب بنیں۔

ہمارے ہاں بہت سی ایسی انجمنیں بھی قائم ہیں جن میں نوجوان طلبہ کثرت سے شامل ہیں۔ ان انجمنوں کے ذریعے انفرادی سوچ بچار کے بعد ایک اجتماعی عمل کی ضرورت ہے جو ملک و قوم کے بعض معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ ایسی ہی دیگر چھوٹی چھوٹی تنظیموں کی وساطت سے معاشرے کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

ہمارے وہ طلبہ جو دیہات سے تعلق رکھتے ہیں ان پر بھی یہی فرائض عائد ہوتے ہیں۔ وہ عوامی تعمیراتی پروگرام میں کارکنوں کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں اور دیہی عوام کو ذہنی طور پر بیدار کر سکتے ہیں۔ وطن کی محبت، علم کی محبت اور انسان کی محبت کے حصول کے لئے ان کے اذہان کو آمادہ کر سکتے ہیں۔ وہ دیہاتی زندگی کے قریب ہوتے ہیں اور دیہی مزاج اور رجحانات کو جس خوبی سے سمجھ سکتے ہیں کوئی دوسرا اس مرحلے پر پورا نہیں اتر سکتا۔

ہمارے ملک کے طلبہ درحقیقت قومی تعمیر و ترقی کا ایک نہایت ہی نزدیکی ذریعہ ہیں۔ اگر وہ یہ عہد کر لیں کہ اس ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے رہ جائیں۔ قومیں ہمیشہ افراد کے یقین محکم، عمل پیہم اور انتھک کوششوں سے بنتی ہیں۔ ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

طلبہ اور سیاسیات

- طلبہ کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔
- اقبالؔ نے کہا تھا۔ ؏

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

- سیاست ہوس انگیز لوگوں کا کھلونا ہے۔ طلبہ کو اس سے پرے رہنا چاہیے۔

● طلبہ اگر سیاست میں شریک نہ ہوتے تو پاکستان معرضِ وجود میں نہ آتا۔

اسی طرح کے اور بھی بلند آہنگ نعرے زبان زدِ خلائق اور مضمون نگاروں کے نوکِ قلم پر ہیں لیکن آپ کو کبھی ایسا آدمی نہیں ملا ہوگا جس نے مختلف اوقات پر دونوں قسم کے نعرے نہ لگائے ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ صرف وقت ہی اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ ضرورت کے مطابق کون سا نعرہ لگانا چاہیے؟ عوام کا حافظہ خراب سمجھیے یا زندگی کی کشمکش کا بوجھ کہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سیاست کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ لہٰذا طالب علموں کو سیاست میں پورے طور پر شریک ہونا چاہیے۔ بظاہر آپ کو اس عمل میں تضاد نظر آئے گا لیکن انسانی کردار سیاست کے سلسلے میں متضاد خواص کا ہی حامل ہے۔ وہی سیاست مدار جب اقتدار کی کرسی سے دور ہوتا ہے تو تمام کالے قانونوں کی مذمت کرتا ہے اور ان کی تنسیخ پر عوام یا کم از کم اپنے ساتھیوں کو ابھارتا ہے، لیکن جب وہ خود مسندِ اقتدار پر متمکن ہوتا ہے تو نہ صرف کالے قانونوں کی ترویج پر مُصر ہوتا ہے بلکہ ان میں ایک دو اور کالے قانونوں یا آرڈی ننسوں کا اضافہ کر دیتا ہے۔ دور کیوں جائیں اپنے گھر کی بات ہی دیکھ لیجیے۔ جن قانونوں کو انگریز کے عہد میں تمام کانگرسیوں، مسلم لیگیوں، خلافتیوں، احراریوں نے کالا قانون کہا اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا تو انہوں نے ان قانونوں کو بڑے ٹھسے سے بحال رکھا کہ اس کے بغیر حکومت چلانا ناممکن ثابت ہوا۔

طلبہ کو سیاست میں شامل کرنے اور انہیں اس سے باز رکھنے کی تلقین کا بھی کچھ اس طرح کا سلسلہ رہا۔ جب مسلم لیگ نے دیکھا کہ پنجاب کے جغادری اور گھاگ مسلمان اور سیاستدان پنجاب میں اس کا بھی بوٹا مار رہے ہیں تو انہوں نے اذنِ عام کر دیا کہ نوجوان طلبہ سر دھڑ کی بازی لگا کر مسلم لیگ کا علم بلند کریں اور مسلمان طلبہ اس تحریک میں کود پڑے جس کا کوئی ایماندار نام لیوا بھی اب اس ملک میں باقی نہیں رہا۔

مسلمان جیدار طالب علموں کے خیل کے خیل قافلے نکلے اور انہوں نے پہلے مسلم لیگ اور پھر تحریک پاکستان کو وہ قوت بخشی کہ انگریز کی سیاست اور ہندو کی چال بازی دونوں اس کے سامنے ماند پڑ گئیں اور اللہ پاک کے ایک بندے قائداعظم محمد علی جناح کے عزم اور خدا کے فضل نے پاکستان قائم کر کے رکھ دیا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ تلقین کے باوجود طالب علم کو سیاست سے باز کیسے رکھ سکتے ہیں۔ جب آپ خود ہر بڑے آدمی کے کارناموں میں حقیقی یا فرضی طور پر یہ ضرور شامل کرنا چاہتے ہیں کہ اس نے فلاں موقع پر فلاں سیاسی تحریک میں حصّہ لیا اور کارہائے نمایاں سرانجام دیے تو آپ اپنی پود سے فخر و مباہات کے یہ مواقع کیوں چھین لینا چاہتے ہیں۔ راقم کی دیانت داری سے یہ رائے ہے کہ ہمیں طلبہ کو سیاسیات میں سرگرم عملی حصّہ لینے کی ترغیب دلانا چاہیے لیکن اس انتہائی احتیاط کی تلقین کے ساتھ کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں صرف اس قدر حصّہ لیں کہ

۱۔ نہ تو ان کی تعلیم میں حرج ہو۔

۲۔ نہ وہ اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈالیں۔

۳۔ نہ وہ کوئی ایسی حرکت کریں جس سے ملک اور ملت کا مفاد یا املاک خطرے میں پڑیں۔

۴۔ اور نہ وہ کسی ایسی سیاسی تحریک میں حصہ لیں جس کے سامنے کوئی اعلیٰ ہدف یا مقصود نہ ہو۔

یہ آخری شرط بڑی لازمی اور کڑی ہے۔ لازمی اس لئے کہ اگر طلبہ بیہودہ سیاسی تحریکوں میں حصّہ لینا شروع کر دیں اور ایسے ہنگاموں، مجمعوں اور جلوسوں میں شامل ہوں جن کا مقصد صرف ملک و ملّت کی تخریب یا ملی املاک کا اتلاف ہو تو ان کا یہ عمل انہیں ہلاکت کے قریب لے جاتا ہے کیوں کہ ہیئتِ حاکمہ یا طبقۂ اقتدار کو

بالکل اصولی طور پر انہیں اس کام سے باز رکھنے کے لئے پولیس اور بسا اوقات فوج سے مدد لینی پڑتی ہے اور اس میں طلبہ کو سیاست پر آمادہ کرنے اور بھڑکانے والے سیاست مداران کرسیوں کی ہوس میں انہیں یہ نہیں سمجھا پاتے کہ بیٹا ہم تمہیں اچھی تحریک میں شامل ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں لیکن خیال رکھنا کہ تم قوم کی متاعِ عزیز ہو، تمہارا ضیاع ملّت کے مستقبل کا ضیاع ہے، تم آئینی حد تک تو آگے بڑھتے چلو لیکن جب قانون تمہارا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے تو معاملہ ہمارے سپرد کر دو۔ اگر فتح ہوئی تو اس میں ہمارا فائدہ ہے اگر شکست ہوئی تو تمہارا نقصان نہ ہوگا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں گھر میں والدین اور درسگاہوں میں استاد کی تلقین کی شدید ضرورت اور احتیاج محسوس ہوتی ہے۔ اگر والدین اور استاد بچوں اور طلبہ کو یہ سمجھاتے رہیں کہ برے مقاصد والی تحریکوں سے نہ صرف الگ رہنا چاہیے بلکہ ان کی مخالفت بھی کرنی چاہیے تو سیاست بڑی عمدہ اور صاف ہو جائے گی اور سیاست مدار اس پر مجبور ہو جائیں گے کہ طلبہ کو بُرے مقاصد کے لئے استعمال نہ کر سکیں۔ لیکن ہر صورت میں طلبہ کو سیاست سے پرے رکھنے اور پرے رہنے کی تلقین کرنا نہ قابل عمل ہے نہ مفید۔ طلبہ میں صحیح سیاست کا شعور پیدا کرنا ایک بہت بڑی ملی خدمت ہے اور اس کے لئے والدین اور اساتذہ دونوں کو کوشش کرنا چاہیے ورنہ اکثر یہ صورت حالات پیدا ہو گی کہ مشتبہ عزائم کے لوگ بھولے بھالے اور سادہ دل اور نیک نہاد بچوں کی تعلیم، ان کی جان اور قومی املاک سے کھیلنا شروع کر دیں گے اور قومی اعتبار سے یہ کوئی مفید لائحہ عمل نہیں۔

اقتدار اچھی چیز ہے اور اس کی تحصیل کی ہوس بھی درست جذبہ ہے۔ لیکن اس میں تلبیس و ریا کو کام میں نہ لائیے۔ آپ صاحب اقتدار ہوں یا نہ ہوں لیکن طلبہ پر اپنی پوزیشن واضح رکھیے۔ اگر وہ آپ کے نیک ارادوں کی تکمیل میں مدد

دے سکتے ہیں تو انہیں اس میں شریک کیجیے۔ اگر آپ اپنی کرسی کے لرزتے ہوئے پایوں کو سنبھالا دینا چاہتے ہیں یا حریف کو اسی کرسی سے بلا مقصد اتارنا چاہتے ہیں تو خدارا اس قوم کی متاعِ عزیز کا ضیاع نہ کریں۔ مرحوم علامہ اقبال اور قائد اعظم نے تحریک پاکستان میں مکمل اعتقاد کے باوجود طلبہ کو اس آگ میں دھکیلنے کی کبھی کوشش نہیں کی جسے ہلڑبازی، ہنگامہ آرائی یا تخریب کا نام دیں گے۔ وہ ان کو شفقت اور پیار سے ہمیشہ یہی سمجھاتے تھے کہ تحریک پاکستان کو آپ قلبی طور پر قبول کریں، اسے اپنائیں، اس کی تبلیغ کریں اور جرأت و دلاوری سے تحریکِ پاکستان میں کام کرنے والوں کی مدد کریں، لیکن ہلڑبازی یا نعرہ آرائی سے کام نہ لیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم معمارِ پاکستان کے نقشِ قدم پر چل کر پاکستان کے استحکام اور مدافعت کی تحریکوں میں شامل ہونے کے لئے اور اس سیاست کو جزوِ ایمان بنانے کے لئے ہر وقت طلبہ کو ابھارتے رہیں، لیکن رو بہی اور تخریب نہ سکھائیں۔ نوجوان قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ہمیں ان کی قیمت کا احساس ہر وقت اپنے دل میں رکھنا چاہیے کہ اس کے بغیر قوم کا کوئی مستقبل نہیں۔ (ڈاکٹر محمد باقر)

اسلامی اخوّت

خالق کائنات نے انسان کو پیدا کیا تو اس کے اندر جماعتی زندگی کے تقاضے بھی رکھ دیئے۔ اجتماعیت کے ان محرکات نے پہلے خاندان کا روپ دھارا، خاندان سے برادری بنی، برادری نے قبیلہ کی شکل اختیار کی۔ پھر وحدت نسلی نے انسان کو مربوط کیے رکھا، یہاں تک کہ اس میں لسانی وحدت کا احساس پیدا ہوا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جغرافیائی اور علاقائی ہم آہنگی نے اس کی جمعیت کو کچھ اور وسعت بخشی اور بالآخر مذہب نے آکر اجتماعیت کے ان سارے محرکات کو عقیدہ کے زیرنگیں کر دیا۔ اب مذہبی برادری نے تمام چھوٹی چھوٹی برادریوں کو اپنے احاطہ

میں لے لیا۔

الہامی مذہب قدم بقدم چلتے ہوئے، اسلام کی منزل تک آپہنچے۔ اب اسلام کی صورت میں دنیا کے پاس زندگی گزارنے کے لیے بہترین لائحۂ عمل موجود تھا۔ اسلام نے انسانی اجتماعیت کو چھوٹی چھوٹی تنگنائیوں سے نکال کر ملت کے بیکراں سمندر سے ہمکنار کر دیا۔ ملت اسلامیہ نسل، قوم، ملک، زبان اور رنگ کے تمام رشتوں کو توڑ کر وحدت دین کے نظریئے سے منسلک ہو گئی۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں بسنے والا، کوئی کی زبان بولنے والا، کسی بھی نسل سے تعلق رکھنے والا محض لا الٰہ الا اللہ کہہ کر ملت اسلامیہ کا فرد بن گیا۔ اس کا رنگ سیاہ ہو یا سفید، بھورا ہو یا کالا، وہ یورپ میں بستا ہو یا ایشیا میں، وہ فرانسیسی ہو یا چینی، وہ منگول نسل کا ہو یا آریہ نسل کا، محض توحید اور رسالت پر ایمان لا کر اسلامی برادری کا معزز رکن قرار پایا گیا۔ ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

افراد کو پیوستہ رکھنے کے لیے اسلام نے صرف دستوری اور قانونی دفعات ہی کو کافی نہ سمجھا بلکہ ان کے دلوں میں اتر کر انہیں باہمی محبت کے رشتوں میں پرو دیا۔ ایک بھائی کی خوشی سارے بھائیوں کی خوشی اور ایک بھائی کے دکھ سے ساری امت ملول، حتیٰ کہ پوری ملت جسد واحد بن گئی جس سے ایک عضو میں درد اٹھنے سے پورے جسم میں ٹیسیں محسوس کی جانے لگیں۔ قرآن پاک نے "انما المومنون اخوۃ" کہہ کر افراد ملت کو ایک ایسے رشتۂ مودت میں پرو دیا جس کی مثال اس سے پہلے یا بعد کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اب امت کے احساسات کے تار ایک ساتھ بجنے لگے، حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان اسے توڑنا چاہے تو وہ خود اسلام سے کٹ جاتا ہے۔

قرآن پاک نے مسلمانوں کے جذبۂ اخوت کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ آپس میں

پیکر رحمت ہوتے ہیں لیکن دشمن کے مقابلے میں آہنی چٹان بن جاتے ہیں۔ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ان کا یہی جذبۂ اخوت ہے جس نے ان نامساعد حالات میں بھی ان کے ملی وجود کو بچا رکھا ہے۔ اگر کسی ملک کے مسلمانوں کے متعلق سنتے ہیں کہ کسی مصیبت میں گھر گئے ہیں تو ان کے دلوں میں ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں اور جہاں تک ان سے بن پڑتا ہے اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد سے دریغ نہیں کرتے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے یورپ کے مردِ بیمار ترکی پر ادبار کی گھٹائیں چھانے لگیں اور خلافتِ اسلامی کا وجود خطرے میں پڑ گیا تو دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہر ملک کے مسلمان اپنے ترک بھائیوں کی مدد کیلئے بیقرار ہیں۔ ہندوستان کے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مسلمان اظہارِ درد میں اپنے آزاد بھائیوں سے بھی سبقت لے گئے۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں تحریکِ خلافت اسی جذبۂ اخوت کا بے مثال اظہار تھا۔ طرابلس کے شہیدوں کا لہو دنیا بھر کے مسلمانوں کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکنے لگا اور یہ بے چینی اور بیقراری اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا سرعنوان بن گئی۔ فلسطین اور کشمیر کے ستم رسیدہ اور بے گناہ مسلمان آج بھی جسدِ ملت کو بے چین کیے ہوئے ہیں اور عالمیانِ اسلام کی یہ بے چینی دشمنانِ اسلام کو انگاروں پر لوٹا رہی ہے۔

مسلمانوں میں باہمی ایثار اور محبت کی روح پیدا کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان میں وقتاً فوقتاً بھائی چارہ کرا دیتے تھے، یعنی دو مسلمانوں سے ارشاد فرما دیتے کہ تم آپس میں بھائی بھائی ہو۔ ان میں حقیقی بھائیوں کی طرح حقوق اور واجبات قائم ہو جاتے تھے۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم نے مہاجرین اور انصار کو اکٹھا کیا اور ایک ایک انصاری اور مہاجر کو بلا کر ان میں بھائی چارہ قائم کر دیا۔

انصار اور مہاجرین کے اس بے مثال بھائی چارے نے مسلمانوں کے حوصلے

بڑھا دیئے اور وہ کئی گناہ دشمنوں پر مسلسل غالب آتے رہے۔ یہاں تک کہ مخالفت کے تمام بادل چھٹ گئے اور عرب کی سرزمین مسلمانوں پر فراخ ہو گئی۔ اس ابتدائی بھائی چارے کے کامیاب تجربے کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ سے زائد صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آج ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ سب اہلِ اسلام کی ایک برادری ہے۔ اس تاریخی اعلان نے ملت اسلامیہ کو محبت اور اخوت کے ایسے مضبوط رشتے میں مربوط کر دیا کہ وہ سیسہ پلائی دیوار بن گئی اور تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے حوادث کے باوجود ان کا شیرازہ ملی بکھرنے نہیں پایا۔

بھائی چارے کے اس تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کو بتایا کہ مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین روز سے زیادہ قطع تعلق رکھے چہ جائیکہ وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو گالی دینا فسق اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔ بلکہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دیگر مسلمان محفوظ رہیں۔ یہاں تک کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ آنکھ سے ایسا اشارہ بھی کرے جس سے کسی مسلمان کو رنج پہنچے۔ آپ نے مومن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ مومن وہ ہے جو اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

آج کا مسلم معاشرہ اس مثالی دور سے فروتر ہے، جس کا نقشہ ہمیں دورِ رسالت میں نظر آتا ہے۔ مسلمان اتحاد و یگانگت سے تہی دامن ہیں۔ ان کے باہمی اختلافات نے ان کی حالت دگرگوں کر دی ہے بسا اوقات وہ اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والے مسلمانوں کو معاف نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ جنگ و جدل میں مبتلا دیکھے گئے ہیں۔ ان میں فرقہ وارانہ اختلافات دور تک راہ پا گئے ہیں۔ یہ باتیں کسی حد تک بجا ہیں۔ لیکن تمام باتوں کے باوجود بحیثیت مجموعی وہ ایک قوم اور ایک ملت کے حصار میں محصور ہیں۔ اصحابِ بصیرت ان میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جذبۂ اخوت کو از سرِ نو بیدار

کرنا بہت ضروری ہے جب تک ان میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسا باہمی ہمدردی کا ایک برادرانہ جذبہ پیدا نہیں ہوگا ان کی حیاتِ نو کا خواب محض ایک سراب رہے گا اور جس قدر جذبۂ اخوت پروان چڑھے گا وہ "بنیان مرصوص" یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ دہ اپنے سارے امتیازات مٹا کر مسلمان اور صرف مسلمان باقی رہ جائیں گے اور چشم زمانہ جس نظارہ کی باز دید کے لیے ترس رہی ہے وہ زندہ اور پائندہ حقیقت کی شکل میں جنت نگاہ بن کر زمانہ میں نمودار ہوگا ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

(پروفیسر محمد سلیم ایم اے)

فوجی تربیّت

جنگ ایک ناگزیر شے ہے۔ اس کے آتشیں شعلے کسی وقت بھی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔ خصوصاً آج تیسری عالمگیر جنگ کے گھناؤنے بادل دنیا کی فضائے بسیط پر محیط ہو چکے ہیں اور استعمار پسند قومیں امن و امان کو تہ و بالا کرنے پر تلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سائنس کی ترقی نے اس کے امکانات واضح کر دیئے ہیں۔ ایسے حالات میں جو قومیں اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کا دفاع مضبوط ہو، ان کے پاس ایک زبردست تربیت یافتہ فوج ہو جو بوقت ضرورت ملک و قوم کی خاطر میدان میں کام آسکے۔

دنیا کا قانون ہے کہ طاقتور کمزور پر رعب جماتا ہے۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ اقبالؔ نے اسی چیز کو یوں پیش کیا ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آئے گا کہ طاقتور اقوام نے کمزور اقوام پر حملہ کر کے سلطنتیں چھین لیں۔ سکندر اٹھا اور سارے مشرق پر چھا گیا۔ محمود غزنوی نے ہندوستانیوں کو روند کر رکھ دیا۔ چنگیز خان اور ہلاکو نے مشرق وسطیٰ کو لرزہ براندام کر دیا۔ نپولین نے تمام یورپ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

آج بھی ارد گرد کے حالات یہی صورت پیدا کر رہے ہیں۔ طاقتور قومیں کمزور قوموں کو ہڑپ کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ایسے حالات میں ضرورت ہے کہ ہمارے ملک کا دفاع مضبوط ہو، ایک زبردست مسلح فوج ہو جو صورت فولاد دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو سکے۔ زیادہ سے زیادہ تربیت یافتہ نوجوان ہوں جو وقت ضرورت ملکی استحکام کے لئے قربانی دے سکیں۔ اب ہم آزاد ہیں اور آزادی کو ہر صورت میں برقرار رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ہم نے اسے جان و مال کی قربانی کے بعد حاصل کیا ہے۔ اب وہ دورِ غلامی نہیں رہا جب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا تھے۔ وہ صبح قیامت نمودار ہو چکی۔ اس سے پہلے ہمیں ملک کی فکر نہیں تھی۔ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو ایک کانگرسی بزرگ نے فرمایا تھا:

" بھائیو جنگ سے ڈرتے کیوں ہو کوئی ہم سے کیا چھینے گا۔ غلام ہی رہنا ہے تو انگریز کے غلام نہ سہی کسی اور قوم کے غلام سہی"

اب وہ حالات نہیں رہے۔ اب ہم آزادی کی نعمت سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ پیارے ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیں کوشش کرنا ہے۔ اس کے استحکام کے لئے تربیت یافتہ فوج تیار کرنی ہے۔ اس میں شک

نہیں کہ پاکستان کے پاس ایک مضبوط، طاقتور اور اچھی تربیت یافتہ فوج ہے لیکن ہمارا ملک اس قابل نہیں کہ کافی تعداد میں تربیّت یافتہ فوج ہر وقت رکھ سکے۔ لہٰذا اس سلسلے میں نوجوانوں کو فوجی تربیّت دینے کی ضرورت ہے تاکہ جنگ کی صورت میں وہ ملک کی حفاظت کر سکیں۔ بلکہ حالات کے پیشِ نظر ضرورت اس امر کی ہے کہ فوجی تربیّت کو ہر نوجوان کے لئے لازمی قرار دیا جائے۔ یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہوگا۔ اس طرح ملک کے تمام افراد فوج ہی بن جاتے ہیں اور ہر شخص ملکی دفاع میں کام آ سکتا ہے۔ بعض لوگ اعتراض کریں گے کہ ہر شخص کو فوج میں دھکیل دینا مفید نہیں کیوں کہ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ یہ درست ہے۔ اس کا بندوبست یہ ہو سکتا ہے کہ دو تین سال علیحدہ تربیّت دینے کی بجائے سکولوں اور کالجوں میں اس کا بندوبست کر دیا جائے تاکہ دورانِ تعلیم ہی میں فوجی تربیّت حاصل ہو جائے۔ حکومت نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے اور بعض کالجوں میں ملٹری ٹریننگ دینے کا بندوبست کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر سکول اور کالج میں صحت مند نوجوانوں کے لئے فوجی تربیّت کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ نوجوان اس فن میں مہارت حاصل کر سکیں۔

ہم مسلمان ہیں اور ہر مسلمان پیدائشی مجاہد ہوتا ہے۔ اسلام میں جہاد کی فضیلت سب سے زیادہ ہے۔ جس قوم میں جذبۂ جہاد باقی نہیں رہتا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ یہی جذبۂ جہاد تھا جس کی وجہ سے مسلمان قوم تھوڑے ہی عرصے میں دنیا پر چھا گئی تھی۔ بلکہ ہمیں تو یہ سبق ملتا ہے کہ عورتوں کو بھی فوجی تربیّت دینی چاہیے تاکہ وقت ضرورت وہ ذلت کی موت نہ مریں۔ اپنی بقا کے لئے فوجی تربیّت سب سے مقدم چیز ہے۔

فوجی تربیّت کا یہ مقصد ہر گز نہیں کہ ہم دوسرے ممالک سے جنگ چھیڑنے کے متمنی ہیں بلکہ اس کا مقصد ملکی دفاع، قومی استحکام اور آزادی کو برقرار رکھنا

ہے۔ نیز فوجی تربیت صرف جنگ ہی کے لئے مفید نہیں بلکہ عام زندگی میں بھی اس کے متعدد فوائد ہیں۔ تربیت کی وجہ سے کمزور توانا ہو جاتے ہیں۔ صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ انسان چست و چوبند رہتا ہے اور اتحاد، تعاون اور نظم و ضبط کی تربیت ملتی ہے جو ملکی استحکام کے لئے نہایت ضروری ہے۔ نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور انسان مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ ملٹری سکولوں کے تعلیم یافتہ نوجوان نسبتاً زیادہ چست و چالاک ہوتے ہیں۔

پاکستان جیسی مملکت کے لئے فوجی تربیت اور بھی اہم ہو گئی ہے کیونکہ ہمارا ہمسایہ ملک بھارت ہمارے خلاف برے عزائم رکھتا ہے اور روز بروز اپنی طاقت بڑھا رہا ہے۔ موجودہ ہنگامی حالات نے ہمیں پھر خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا ہے اور ہم محسوس کرنے لگے ہیں کہ آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ ۱۹۶۵ء کو اس نے مغربی پاکستان میں لاہور اور سیالکوٹ کے علاقوں پر اعلانِ جنگ کئے بغیر حملہ کر کے اپنا جارحانہ رویّہ ظاہر کر دیا تھا۔ اب سیاسی چالیں چل کر ہمارا ایک بازو مشرقی پاکستان علیحدہ کر دیا ہے۔ پاکستان کے بہادر اور دلیر سپاہیوں کی جانبازی اور شجاعت کا لوہا دنیا مانتی ہے۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود ہمارے پاسبانوں نے برّی، بحری اور ہوائی محاذ پر دشمن کو شدید نقصان پہنچایا ہے لیکن پھر بھی دشمن کے عزائم ناپاک ہیں۔ کشمیری مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور انہیں حق خود ارادیت دینے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان کسی وقت بھی پھر جنگ چھڑ سکتی ہے۔ کیا ان حالات میں ضروری نہیں کہ پاکستان کا ہر نوجوان فوجی تربیت حاصل کرے اور وقت آنے پر دشمن کو منہ توڑ جواب دے۔ قوم اور ملک کی خدمت اسی میں ہے اور زندہ قوموں کا یہی شعار ہوتا ہے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

بنی نوع انسان کا قوام جن چار عناصر (ہوا، مٹی، آگ، پانی) سے تیار ہوا ہے۔ طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے بالکل اُلٹ اور برعکس ہیں۔ ہوا اور مٹی کا جوڑ نہیں ہو سکتا۔ پانی آگ کے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہ چاروں چیزیں جس میں جمع ہو جائیں اس کی فتنہ سامانی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ حضرت انسان ہی ہے جس نے انہی چاروں عناصر سے تشکیل پائی ہے۔ طبیعتِ انسانی کا اختلاف ظاہر ہے۔ پھر ہر فرد دوسرے سے مختلف طبیعت اور سرشت و جبلت لے کر آیا ہے۔ ارسطو نے کہا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی مل جل کر رہنا سہنا اس کی فطرت اور طبیعت میں شامل ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ انسانی طبائع کا اختلاف بنی نوع انسان کو نچلا نہیں بیٹھنے دے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف روزِ ازل کو فرشتوں نے یہ کہہ کر باری تعالیٰ کے حضور میں عرض کی تھی کہ دنیا میں ایسی مخلوق کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے جو فتنہ و فساد کو دعوت دے گی اور خون خرابہ کا شکار ہو گی۔

مختلف الطبائع افراد کے سماج میں ہم آہنگی و ہم خیالی اور امن و سکون یا تو اخلاق کے ذریعے پیدا کیا جا سکتا ہے یا قانون اور حکومت و سیاست کی آنکھ اس کا بندوبست کر سکتی ہے۔ اخلاق ہی کا دوسرا نام دین ہے۔ یا تو انسانوں میں دیانتداری اس قدر ہو کہ ان کی اخلاقی قدریں اس قدر بلند ہو جائیں کہ نظام عالم انسانی کے اندر امن و سکون رہے۔ کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو سکے۔ لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔ محبت و مروّت کا رشتہ ان میں قائم رہے۔ ایثار

کی دولت سے ایک دوسرے کے دُکھ درد کا مداوا کرسکیں یا پھر حکومت کا ڈنڈا وہ کچھ کرلے گا جس کے لئے اخلاق و دین کی تعلیم کارگر ثابت نہ ہوسکی ہو۔ لیکن تاریخ انسانی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بارہا حکومت کے دباؤ نے وقتی اور ہنگامی طور پر تو انسانی معاشرے سے جرائم ختم کر دیئے بلکہ صرف ارتکاب جرائم کی شرح کم کردی لیکن یہ دباؤ کبھی بھی مستقل طور پر جرائم کو ختم نہ کرسکا، کیونکہ قانون و حکومت کے پاس کوئی ہمہ گیر آنکھ ایسی نہیں جس کا اثر و نفوذ انسانوں کے نہاں خانۂ دل اور در و دیوار سے ماورا، گوشۂ تنہائی تک رسائی حاصل کرسکے۔ چنانچہ جونہی حکومت، سیاست اور قانون کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی فطرتِ انسانی پھر ربڑ کی لچک کے ساتھ پہلے سے زیادہ گمراہی کی طرف مائل ہوئی اور ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے لگی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو قانون و سیاست کے مقابلے میں اصل نصب العین کی حیثیت اخلاق کو حاصل ہے۔ قانون اخلاق کی فصیل ہے۔ اخلاق کی سالمیت کے لئے اس فصیل کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن فصیل کی پناہ لینے والے جب تک فصیل کی خبرگیری نہ کرتے رہیں گے یہ کمزور پڑکر گرسکتی ہے۔ اخلاق کا فرض ہے کہ قانون کی فصیل کی نگہداشت کرے۔ جس طرح اخلاق کے بچاؤ کے لئے قانون کی پناہ ناگزیر ہے اسی طرح قانون کی حفاظت کے لئے اخلاق کی کمک ضروری ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے کہ معاشرہ خواہ کتنا ہی کیوں نہ سُدھر جائے بعض افراد ایسے ضرور ہوں گے جن کی معاندانہ طبیعت کا علاج حکومت اور سیاست کی غصیلی آنکھ ہی کرسکتی ہے، ورنہ چند ایک سرکش انسانوں کی بگاڑ اور فساد کے نتیجے میں سارے کا سارا معاشرہ فتنہ و فساد کی دہکتی ہوئی آگ کا ایندھن اور اس کا شعلہ بن سکتا ہے۔

بہرصورت دین و سیاست لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کا ساتھ ضروری ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود مشکل ہے۔ تاریخ انسانی کے کسی دور میں انسانی معاشرے پر نگاہ

ڈالیں اور اس معاشرے کا تحلیلی جائزہ لیں تو جو بات سب سے اُبھری ہوئی نظر آئے گی یہی ہے کہ اگر اس معاشرے میں دین غالب ہے تو دین پر قائم رہنے والے افراد کے سلسلے میں فسادی لوگوں کی رخنہ اندازیوں سے بچاؤ کے لئے قانون کی پناہ لینا پڑی ہے اور اگر کہیں سیاست کے دباؤ اور قانونی گرفت میں معاشرے کی اصلاح سمجھ کر ہر طرف قانون کا جال بچھا دیا گیا ہے اور معاشرے کے گرداگرد سیاست کی ایک جہاں پناہ فصیل کھڑی کر دی گئی ہے تو تاریخ کے اس دور کا بغور مطالعہ ہمیں بتائے گا کہ مفسدین اور فتنہ پرداز لوگوں کو ان کی رخنہ اندازیوں سے باز رکھنے کے لئے کہیں نہ کہیں اخلاقیات کا سبق بھی پڑھایا جاتا رہا ہے۔ دین کے درس جاری کر کے ان کی طبیعت کے عناد کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو حکومت اور قانون کا وہ دباؤ بالکل ہنگامی، وقتی اور بالکل محدود ثابت ہوا ہے اور جونہی سیاست کا شکنجہ ذرا ڈھیلا ہوا ہے لوگ بیش از بیش آفتیں ڈھانے میں سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔

چنانچہ ہلاکو اور چنگیز خاں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اقتدار کے نشے میں اور حکومت وسیاست کے زور میں انہوں نے انسانیت کُش اور اخلاق سوز سزائیں اپنی رعایا پر روا رکھی ہیں۔ لیکن کیا ان کی یہ سیاست اور حکومت کا یہ دباؤ، ان کی قربانیاں اور جبر شعاریاں رعایا کے مریض دل ودماغ کا کوئی دیرپا علاج کر سکی ہیں؟ تاریخ کا ایک ابتدائی طالب علم بھی اُس دور کی تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر بتا سکتا ہے کہ ان کی سیاست بڑی ناپائیدار تھی۔ ان کا یہ دباؤ اور قہر وجبر ایک ظلم وستم کی بھیانک صورت تھی، جس کے تلے انسانیت دب کر چیخ وچلا اٹھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک بنی نوع انسان انہیں ظالم وسفاک قرار دیتے آئے ہیں۔ جہاں کہیں ظلم وسفاکی اور انسانی لباس میں درندگی و وحشت کا ذکر ہوتا ہے، گفتگو کی اس نشست میں آغاز انہیں دو ناموں سے ہوتا ہے اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ انہوں نے اصول سیاست وحکومت میں سے دین کے عنصر کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ حکمرانی اور جہانبانی، جہانگیری اور جہانداری کے

اُن اصول و قوانین سے انہوں نے یک قلم آنکھیں بند کر لی تھیں جن پر عمل کر کے ایک حاکم رعایا کے دلوں کو موہ سکتا ہے اور ان کے دلوں پر حکومت کر سکتا ہے۔

ادھر دوسری طرف ہم مرکزِ حیاتِ انسانی اور مقصدِ تخلیقِ کائنات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں دین و سیاست کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جہانبانی کی مثال آج اسلام اور فرزندانِ توحید و رسالت کے دشمن یورپ و امریکہ کے لوگ بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ کفر اپنی زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ جہانگیری و جہانداری کے سلسلے میں خلفائے راشدین کی مثال اپنے سامنے رکھنی چاہیے۔

اس کی ٹوہ لگانے سے یہی حاصل نکلتا ہے کہ ان مبارک تاریخی ادوار میں لوگوں کی دینداری مسلم تھی۔ فضائل اخلاق کے وہ لوگ پتلے تھے۔ ان کا دینی تقویٰ گلوگیر نہیں تھا بلکہ دلگیر تھا۔ وہ نفاق سے کوسوں دُور تھے۔ قومی اور سیاسی و حکومتی سطح پر قانون کی پُشت پناہی دین کر رہا تھا۔ انہیں سیاست کی کم اور دین کی زیادہ ضرورت تھی۔

اسلام نے حکمرانی کے چند شرائط و اصول بیان کیے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔ "مسلمان اور اللہ کے فرمانبردار وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اگر ہم خلافت ارضی عطا کر دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا انتظام و انصرام کریں گے۔"

دینی حکمرانی اور اسلامی حکومت کے یہ اصول ہیں جن سے پہلو تہی اور انحراف، بے اعتنائی اور تغافل چنگیزی سیاست کا پیش خیمہ ہے۔

(پروفیسر حافظ عبداللہ)

چاندنی رات

بے دل و بے جان سا ہوتا ہوں اندھیری رات میں
چاندنی کے ساتھ میرا دل بھی لے جاتا ہے چاند

آسمان کو کوسنا ایک قدیم روایت ہے۔ ادیب اپنے ادب پاروں میں اسے آفات نازل کرنے والا کہتے ہیں۔ شاعر اسے اپنے کلام میں محبوب کی طرح جفاکار قرار دیتے ہیں۔ ؎

نہ ربط ان سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے (مومن)

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو (غالب)

غرض یہ کہ اسے جملہ صعوبات کی آماجگاہ کہا جاتا ہے۔ جہاں ہم اس مفروضے پر ایمان رکھنے کی صورت میں اسے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور سب اذیتیں اس کی طرف منسوب کرتے ہیں وہاں عدلِ خداوندی نے چاند جیسی نعمت غیر مترقبہ کی صورت میں اس کا ازالہ بھی کیا ہے۔ جس قدر تلخیاں شب تیرہ و تار کے بھیانک تصور سے وابستہ ہیں اسی قدر راحتیں چاندنی رات کے حسین تصور سے متعلق ہیں۔ آفتابِ عالم تاب بہت روشن ہے۔ یہ ساری دنیا کو روشن کرنے کی کمال صلاحیت رکھتا ہے، اتنا روشن ہے کہ ظلمتِ شب کو نورِ نہار میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لیکن کیا اس کی شعاعیں ذہن انسانی کو وہی تلذذ بخشتی ہیں جو چاند کی شعاعیں اور اس کی ضوفشانیاں قلب انسانی کو؟

چمکتے ہوئے اور ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی انجمن میں جب ماہِ کامل شب چہار دہم کو چرخ نیلی فام پر نمودار ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک طشت زریں پستی سے بلندی کی طرف برابر بڑھ رہا ہے اور حیاتِ انسانی کو زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کا سبق دینے کے ساتھ ساتھ عالم کون و مکان کے حسن میں اپنی تمازت کی روشنی اور نور سے رنگ بھر رہا ہے۔ ہر صاحب بصارت اس کی سحر انگیز چاندنی سے مسحور و مسرور ہوتا ہے اور ہر صاحب دل اس کی نشاط انگیز چاندنی سے محظوظ ہوتا ہے۔ کون ہے جو چاندنی کے حسن و جمال سے تاثر قبول نہیں کرتا۔ بچہ آغوش مادر سے لپک لپک کر چاند کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ جوان کی نظریں اس میں تجمل، شباب اور رعنائی

تلاش کرتی ہیں۔ مرد پیر کتاب ماہتاب کے سنہری اوراق میں اپنی عمر رفتہ کی داستانِ رنگین پڑھتا ہے۔ عاشق مجنوں پہروں ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھتا ہے اور اس پر اس قدر محویت کا عالم طاری ہوتا ہے کہ محبوب و ماہتاب کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ ؎

مہتاب کے ہنستے ہوئے چہرے پہ تبسم
تیرے رخِ انور کی ضیا دیکھ رہا ہے

شاعر اپنے لطیف احساسات اور نازک جذبات کو بروئے کار لاکر اپنی فنکارانہ نگاہ سے اسے کچھ ایسے انداز سے دیکھتا ہے کہ پیغامات فطرت کا ایک لامتناہی تسلسل بندھ جاتا ہے ؏

چاندنی رات ہے چلے آؤ

مغنی صرف دیکھتا ہی نہیں ہے بلکہ کچھ سنتا بھی ہے۔ ؎

راتوں کو میرے ذوقِ ترنم نے بارہا
گاتے سُنے ہیں چاند ستاروں کے قافلے

چکور کا منتہائے مقصود یہی ہے۔ روزِ اول سے وہ اپنے اس محبوب تک رسائی کے لیے کوشاں و سرگرداں ہے۔ جونہی یہ افق پر نمایاں ہوا اس کے پر و بال حرکت میں آئے۔ اس کے ذوق کی انتہا یہ ہے کہ جب تک وہ غروب نہ ہو گیا اس کی پرواز کے تسلسل میں فرق نہ آنے پایا۔

صفحۂ ارض پر چاند کی کرنیں اس طرح پڑتی ہیں گویا کسی نے طلائی چادر بچھا دی ہو۔ سنہری کرنوں کا عمل اس طرح جاری ہوتا ہے جیسے آسمان سے نور کی لگاتار بارش ہو رہی ہو۔ اس کا احاطۂ کار سارے عالم پر محیط ہے۔ باہر والوں کے لئے اس کا ایک وسیع اور لامحدود سلسلہ حظ ذہنی کا سامان ہے۔ اندر والوں کے لئے دریچوں اور روشندانوں سے کرنوں کا چھن چھن کر آنا تسکینِ قلبی کا سبب ہے۔ میدانوں میں اس کا پھیلا ہوا نور انہیں آئینہ بنائے رکھتا ہے۔ پہاڑوں پر گئے تو وہی کنگر جو دن میں پتھر تھے اب

چاندنی کے سبب سے دُرِ شہوار اور جوہرِ آب دار معلوم ہوتے ہیں۔ گلستانوں میں گئے تو وہاں بھی اس کا ظہور پُر نور پایا۔ سرو اس کی قربت حاصل کرنے کیلئے کوشاں۔ غنچہ اس سے ہم کلام ہونے کے لئے بے قرار۔ گلاب اس کی شراب زریں کے لئے کٹورے بڑھائے ہوئے۔ نرگس اس کے نشۂ دیدار میں سرمست و بے خود اور روئے سبزہ مارے خوشی کے سُرخ۔ سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر چاندنی کا نظارہ کیا تو کیا دیکھا کہ پانی جوشِ مسرت میں بلیوں اچھل رہا ہے اور حسن قمر سے متاثر ہو کر بے اختیار اس کی طرف بڑھ رہا ہے جسے لوگ اپنی زبان میں مد و جزر کہتے ہیں۔ اس تماشے میں اتنے محو ہوئے کہ اسی دوران میں ہم نے سمندر کو موجوں کی مدد سے چاندنی کی دولت بیش بہا کو سمیٹ کر اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ لوگ اسے لہر کا عمل کہتے ہیں۔

شہروں کی فلک بوس عمارات پر اس کی زر فشانی ماحول کو شان و شکوہ اور حسن و جمال عطا کرتی ہے۔ چاندنی رات کی سہانی، خاموش اور پُر سکون فضا دیہات کی بے ڈھنگی، بھدی اور غربت زدہ جھونپڑیوں کے قبح کو حسن میں بدل دیتی ہے۔ یہاں کی معصوم جوانیاں اس حسین ماحول، دلکش فضا اور دلفریب منظر سے محظوظ نہ ہونے کو کفرانِ نعمت سمجھتی ہیں۔ یہی جذبہ ان کے دل میں ایک امنگ اور تڑپ بن کر انہیں گھروں کی چار دیواریوں کو چھوڑنے کے لئے بے تاب و بے قرار کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ ٹولیوں کی صورت میں ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی اور اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گلیوں میں نکل آتی ہیں۔

جس طرح چاند کے گرد ہالہ ہوتا ہے وہ حلقہ بناتی ہیں اور جس طرح چاند ہالے کے درمیان میں ہوتا ہے وہ بھی ایک چاند کو منتخب کر کے حلقے کے مرکز کی زینت بناتی ہیں۔ کچھ ستاروں کی مانند دور دور بکھر جاتی ہیں۔ پھر خوشی سے ایک ساتھ گیت گاتی ہیں اور جھوم جھوم جاتی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے فلک قدرت کے شاہکاروں چاند، ہالہ اور ستاروں سمیت زمین پر اتر آیا ہے۔

چاندرات کو آخر شب کسانوں نے ہل جوتے۔ ایک سادہ مگر پر اثر لَے کے

ساتھ نغمے چھیڑ کر سکوت فضا کو توڑا۔ ادھر سپیدۂ سحر نے آمدِ آفتاب کا پیغام دیا۔ اس خبر نے چاند کا خون کر دیا جو مشرق کی جانب پھیل گیا۔ چاندنی کا طلسم ٹوٹا اور خورشید کی حکمرانی شروع ہوئی۔ ؎

ہر کمالے لازوالے ہے اصولِ کائنات
زندگی کو زندگی کے راز سمجھاتا ہے چاند
(پروفیسر سیّد طاہر شمسی)

میرا نصب العین

زندگی ایک بے کیف سفر ہے۔ یہ ان لوگوں کا مقولہ ہے جن کے نزدیک زندگی کا کوئی نصب العین نہیں، سوائے اس کے کہ پیدا ہوئے، تمام عمر کولہو کے بیل کی طرح کسبِ معاش کے چکر میں گرفتار رہے اور زندگی کے دن جوں توں کر کے پورا کرنے کے بعد رخصت ہوتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا۔ ؎

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

ایک نصب العین کے ہوتے ہوئے زندگی ایک بے کیف سفر کی بجائے ایک خوشگوار مشغلہ بن جاتی ہے اور رہرو کا ہر قدم اس کی منزل کو زیادہ واضح، روشن اور جاذب تر بناتا ہے۔

میرے نزدیک انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین انسانیت کی خدمت اور آدمیت کا احترام ہے۔

باخبر شو از مقامِ آدمی
آدمیت احترامِ آدمی

آدمیت کا احترام ہم نوع انسان کی خدمت کے ذریعے کر سکتے ہیں اور نوع انسانی کی خدمت سے بڑھ کر کون سا نصب العین حیات ہو سکتا ہے جسے اپنا کر انسان اس پر فخر کر سکے۔ انسانیت کی خدمت ہی حقیقتاً انسانیت کا معراج ہے۔ قرآن کریم میں جس سے بہتر ضابطۂ حیات اس وقت تک دنیا والوں کو میسّر نہیں آسکا، انسانی خدمت کے اس نصب العین کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ میرے نزدیک اس زمانے میں انسانیت کی سب سے بڑی خدمت انسانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہے، کیونکہ دورِ حاضر میں غیر تعلیم یافتہ افراد کو انسانیت کا صحیح مرتبہ اور مقام دینے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہی وہ جوہر ہے جس کی بدولت انسان کو کائنات کی دوسری چیزوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اسی فضیلت کی بدولت انسان کو کائنات کا شاہکار اور دنیا میں خدا کا نائب و خلیفہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ کمال ہے جس کی بدولت کائنات کی ہر شے انسان کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی برتری اور عظمت کا اعتراف کرتی نظر آتی ہے۔ یہی وہ جوہر انسانیت ہے جسے اجاگر کرنے کی تلقین کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ ہوائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں

خود شناسی کی یہ صلاحیت کب پیدا ہو سکتی ہے؟ اسی وقت جب انسان زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو۔ یہ نصب العین اگرچہ ایک عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور اسے کسی خاص طبقے یا خطۂ ارض تک محدود کرنا عالمگیر انسان دوستی کی روح کے منافی ہے لیکن جیسا کہ اصول ہے چشمہ سے سب سے پہلے اس کے قرب وجوار سیراب ہوتے ہیں مگر آخر کار اس کا سیلاب بلا تفریق سمت و فاصلہ ہر جگہ اور ہر مقام کو اپنی لہروں کی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اسی طرح میرا مقصد اولاً سرزمین پاک سے لاعلمی اور جہالت دور کرنا اور پاکستانیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے انہیں اپنے صحیح مرتبہ و مقام سے آگاہ کرنا ہے۔ میرے نصب العین کی اہمیت کا احساس صرف مجھے ہی نہیں تمام ترقی یافتہ اقوام اور

خود ہماری حکومت کو بھی ہے۔ تمام مہذب دنیا کو اس کا احساس ہے کہ جب تک نوعِ انسانی کو جہالت اور لاعلمی کے عمیق غاروں سے نہیں نکالا جاتا، اس وقت فلاحِ انسانی کا کوئی پروگرام اور کوئی لائحہ عمل خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔

میرے خیال میں اگر ہر تعلیم یافتہ پاکستانی اپنے دل میں تہیہ کر لے کہ اس نے اور تنہا اس نے ہی پاکستان سے لاعلمی اور جہالت کو دور کر کے اپنے پاکستانی بھائیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہے تو یہ مسئلہ تھوڑے سے عرصے میں حل ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے میرا یہ مشورہ بظاہر کم نظری اور دیوانگی پر محمول کیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرد ہی اپنی ذات میں انجمن ہے۔ کسی عالمگیر تنظیم کا وجود افراد کے بغیر ناممکن بلکہ محال ہے۔ افراد چاہیں تو اقوام کی تقدیر بدل سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ایک واضح نصب العین اور ذوقِ عمل کا ہونا لازمی ہے۔

اس نصب العین کی موجودگی میں میں معلمی کے پیشے کو دوسرے پیشوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ یہ بات نہیں کہ میرے خیال میں وہ لوگ جو معلمی کے علاوہ دوسرے پیشوں کو اپنائے ہوئے ہیں ان کے لیے انسانی خدمت کے اس جذبے کو عملی جامہ پہنانے کے امکانات کم ہیں۔ میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ دل میں ذوقِ عمل کا جذبہ موجود ہو تو انسان ہر جگہ اپنے لئے راہِ عمل تلاش کر لیتا ہے۔ لیکن اس ماحول میں پہنچ کر انسان کو ایک موافق ماحول میسر آجاتا ہے۔ اسے تعلیم کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خود علم کی لگن اور دوسروں تک اس کی روشنی پہنچانے کی ایک حقیقی خواہش اور آرزو پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے مشن کو عملی جامہ پہنانے میں ہمہ تن مشغول ہو سکتا ہے اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ پیشہ مالی حیثیت سے اتنا منفعت بخش نہیں جتنا کہ بعض دوسرے پیشے ہیں لیکن ایسا تصور کرنا میرے نزدیک خود غرضی بلکہ خود فریبی ہے۔ انسانی خدمت کا بیدار جذبہ رکھنے والے افراد اس امر میں میری ہمنوائی کریں گے کہ تھوڑے سے ذاتی فائدے کو عالمگیر انسانی مفاد پر قربان کر دینا کوئی مہنگا سودا

نہیں ۔ میرے نزدیک یہ لوگ وہ خدمت سر انجام دیتے ہیں جو انبیاؑ و اولیاؑ کا شیوہ رہا ہے اور یہ انسانیت کی ایسی خدمت ہے جس کے احسانات سے انسانیت ابدالآباد تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتی ۔ آج دنیا میں تہذیب و تمدن کے جو نشانات ملتے ہیں وہ سب اسی طبقے کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ ہیں ورنہ آج کون جانتا خدا کیا ہے ؟ مادہ کیا ہے ؟ کائنات کی حقیقت کیا ہے ؟ آج چاند تاروں پر کمند ڈالنے والے انسان کس کے فیض تربیت کے مرہونِ منت ہیں ۔ یہ سب اسی طبقے کا فیضان نظر ہے کہ آج دنیا کو حسین و جمیل بنانے کی کوشش تیز سے تیز تر ہو رہی ہے ۔

اس صورت حال کے پیش نظر میرے نزدیک انسانیت کی سب سے بڑی خدمت انسانیت کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ہے ۔ یہی میرا نصب العین حیات ہے اور میں ہر لمحہ اپنے اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہوں ۔ ممکن ہے میرا یہ نصب العین میری زندگی میں پورا ہو یا نہ ہو ، بہرحال میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں وہ بے رنگی و بے کیفی نہیں جس کے بیشتر لوگ شاکی ہیں ۔

(پروفیسر اے ۔ ڈی ۔ شیخ مرحوم)

کالج ہوسٹل کی زندگی

کالج ہوسٹل کی زندگی پر لطف زندگی ہے جس کی یاد ہمیشہ دل کو تڑپاتی ہے ۔ کالج ہوسٹل میں گزارے ہوئے لمحات کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے ۔

ہوسٹل کی زندگی میں بے شمار خوبیاں ہیں ۔ طلبا مختلف جگہوں سے آتے ہیں اور یہاں ایک جگہ مل جل کر رہتے ہیں ۔ باہمی تعاون اور اعتماد کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں ۔ یہاں ایسی دوستی قائم ہوتی ہے جو عمر بھر قائم رہتی ہے ۔ مل جل کر رہنے سے اخلاقی تربیت حاصل ہوتی ہے ۔ مروت ، رواداری اور باہمی

ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ہوسٹل کا تمام ماحول علمی ہوتا ہے۔ بحث و تکرار کے ذریعے مسائل حل کیے جاتے ہیں۔ کالج کے مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ اسباق کا اعادہ اور ان پر رائے زنی ہوتی ہے۔ مختلف دلچسپیاں رکھنے والے طالب علم ہماری معلومات میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کسی کو کھیلوں کا شوق ہے، کسی کو فوٹوگرافی کا خبط ہے، کسی کو موسیقی سے لگاؤ ہے، غرضیکہ ہر قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں۔

پھر ہر قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے، جو چاہو کرو۔ کسی قسم کی ممانعت نہیں ہے۔ ہنسو، قہقہے لگاؤ۔ دوستوں کے ساتھ کھاؤ پیو، گپیں اڑاؤ، کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔ یہاں سے اکتاؤ تو کامن روم میں جاکر تاش، کیرم یا شطرنج کھیلو۔ ریڈیو سیٹ سے دلفریب تانیں سنو یا فرمائشی پروگرام سے جی بہلاؤ۔ یہاں سے دل بھر جائے تو اپنے کمرے میں جاکر لمبی تان کر سو جاؤ۔ کوئی مخل نہ ہوگا۔ آپ کو چند روز کے اندر محسوس ہوگا کہ آپ شاید کوئی بڑے رئیس یا شہزادے ہیں اور درزی، دھوبی، باورچی اور دیگر نوکر آپ کی رعایا ہیں جو ہر وقت خدمت کے لئے حاضر رہتے ہیں۔

ہوسٹل میں سوسائٹیوں کا قیام عملی تربیت دیتا ہے۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ میس کا انتظام کس طرح چلتا ہے۔ حساب کتاب کیسے رکھا جاتا ہے اور لوگوں سے کس طرح پیش آنا پڑتا ہے۔ پریفیکٹ اور چیف پریفیکٹ بننے سے دوسروں کی رہنمائی کرنے اور اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کا سبق ملتا ہے۔ خود اعتمادی انسانی اخلاق کا ایک اہم ترین جوہر ہے۔ جب تک ہم ماں باپ کے زیر سایہ رہتے ہیں ہم آزادانہ طور پر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ہر چیز کے لئے دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ لیکن ہوسٹل میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ ہمیں آزادانہ طور پر کام کرنے کے متعدد مواقع ملتے رہتے ہیں۔ اپنے سامان کی حفاظت کرنا، صفائی کا خیال رکھنا، اپنے ہاتھوں سے روپیہ خرچ کرنا، متحد

ہو کر کام کرنا اور مختلف کام اپنے آپ سرانجام دینے سے، ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم آزادانہ طور پر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ہوسٹل کی زندگی محبت اور پیار کی زندگی ہے۔ ہم آپس میں کبھی نہیں لڑتے اور کسی سے اختلاف ہوتا ہے تو دوست صلح صفائی کرا دیتے ہیں۔ اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے تو جسے ملے وہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ یہاں ہمیں مساوات کا سبق بھی ملتا ہے۔ یہاں امیر و غریب، ادنیٰ اور اعلیٰ کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ امیر گھرانوں کے لڑکے غریب لڑکوں کے ساتھ ایک جیسے کمروں میں رہتے ہیں اور ایک ہی میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ اس طرح امرا میں تکبر نہیں رہتا اور غربا کے دلوں سے احساس کمتری جاتا رہتا ہے۔

ہر چیز کے لئے وقت مقرر ہوتا ہے۔ کھانا کھانا، مطالعہ کرنا، سونا، جاگنا، کھیلنا سب کے اوقات مقرر ہیں۔ لہٰذا یہاں ہماری زندگی منظم ہو جاتی ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو نہ صرف ایک طالب علم بلکہ ہر انسان کو کامیاب و کامران بناتی ہے۔

ہوسٹل کی زندگی کردار کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں باہمی تعاون سے کام کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ ہوسٹل میں اقامت پذیر ہونے کی وجہ سے کالج کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جا سکتا ہے۔ تفریحی مشاغل میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ آج کوئی مباحثہ سن رہے ہیں یا کسی مجلس میں شریک ہیں تو کل کسی میچ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور اس طرح دوسروں کو کھیلوں میں حصہ لیتے دیکھ کر اپنے اندر بھی کھیلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

ہوسٹل میں رہ کر انسان کبھی تنہائی محسوس نہیں کرتا۔ کئی یار دوست پیدا ہو جاتے ہیں جو ہماری زندگی کی تلخیوں کو دور کر دیتے ہیں۔ ایک زاہد خشک بھی دیکھا دیکھی زندگی کی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہونے لگتا ہے۔ آپ کے ساتھی کبھی آپ کو پریشان ہونے نہیں دیں گے۔ کبھی سودا سلف خریدنے جا رہے ہیں،

کبھی سیر و تفریح کا پروگرام بن رہا ہے، سینما کے پروگرام بن رہے ہیں - ہم عمر دوست کبھی محسوس نہ ہونے دیں گے کہ آپ گھر سے دُور آ گئے ہیں۔ ہر وقت خوشی اور مسرّت کی باتیں سنائی دیں گی۔ اس طرح ہوسٹل کی زندگی گوشۂ عافیت اور مسرّتوں کا مرکز ہے۔

اس کے مقابلے میں گھر کا ماحول دیکھیے۔ وہاں علم و عمل کے مواقع میسّر نہیں ہیں۔ کبھی بچے کے رونے کی آواز آ رہی ہے، کبھی بچوں کی لڑائی کا شور برپا ہے۔ یکسوئی سے پڑھنا کہاں نصیب ہوتا ہے۔ لیکن کالج ہوسٹل میں پڑھنے کے مواقع میسّر آتے ہیں۔

ہر چیز کے روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو بھی ہوتا ہے۔ ہوسٹل کی زندگی میں بھی چند نقائص مل جاتے ہیں۔ مثلاً جو طالب علم صرف والدین کے دباؤ کی وجہ سے پڑھتے ہیں وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی آوارہ گردی شروع کر دیتے ہیں۔ نگرانی کے بغیر وہ کام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ تمام دن بیکار باتوں میں صرف کرتے ہیں اور ان پڑھ والدین کے بچے تو ہوسٹل میں آکر خوب رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ معمولی معمولی بہانوں کے ذریعے گھر سے پیسے منگوائے جاتے ہیں۔ فضول خرچی ہوتی ہے۔ اور پھر روپیہ نہیں پہنچتا تو قرض لینا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض لڑکے بُری صحبت کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں۔ طبیعت میں آوارگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل سختی سے کام نہ لے تو اکثر لڑکے رات گئے تک گھومتے رہتے ہیں۔ بیشتر سینما میں وقت گزارتے ہیں اور پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود مجموعی طور پر کالج ہوسٹل کی زندگی بڑی پُر لطف ہوتی ہے۔

تعلیمِ نسواں

آج یہ کہنا کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ بغیر علم کے کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں۔ دنیا کے جن ممالک میں خواندگی کا تناسب زیادہ ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ جن ملکوں کا خواندگی کا تناسب کم ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں پسماندہ سمجھے جاتے ہیں۔ خواندگی کے تناسب میں نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی شامل سمجھی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں کم تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہیں ایک وجہ تو اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے ملک میں بعض لوگ اس زمانے میں بھی عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عورت کو صرف گھر کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور گھریلو تعلیم کے لیے ابتدائی قسم کی چیزیں ضروری ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ابھی عورتوں کے لئے تعلیمی سہولتیں عام نہیں ہوئیں جس کی وجہ سے کئی محدود وسائل کے لوگ اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عورتوں کو کسی قسم کی تعلیم دینا مضر خیال کیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ محدود وسائل کے باوجود ہمارے ملک میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، ہر قسم کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ تعلیمِ نسواں ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر حقیقت پسندانہ طرزِ عمل کی ضرورت ہے۔ عورت کے بغیر انسانی زندگی کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ عورت اور مرد ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اگر دونوں میں سے ایک پہیہ ناکارہ ہو تو گاڑی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتی۔ ان دونوں کے اشتراک سے ایسا ہونا ممکن ہے۔ اگر عورت اپنے دائرہ عمل میں رہ کر علم حاصل کرے تو اس کے خاطر خواہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ ایک باشعور عورت ایک

گھر کو اور چند باشعور عورتیں ایک خاندان کو اور بہت سی باشعور عورتیں پورے ملک کی اخلاقی حالت میں انقلابی تبدیلی لا سکتی ہیں۔ آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت دراصل ایک ایسا فریضہ ہے جس کو عورت ہی بطریقِ احسن انجام دے سکتی ہے۔

عورت کا دائرہ کار مرد سے قطعاً مختلف ہے۔ مرد کا علم و ہنر زندگی کی کٹھن منزلوں کو آسان کرتا ہے اور عورت کا علم و عمل اس کو عظیم ذمہ داری کے لیے تیار کرتا ہے۔ عورت کے لیے تعلیم حاصل کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت مرد کی طرح دفتروں میں کام کرے۔ فیکٹریوں میں مشین چلائے اور بنکوں میں ملازمت کرے اور پھر ایک غیر فطری بنیاد پر مرد کے مقابلے پر مساوی حقوق کا مطالبہ کرے۔ مغربی ملکوں کے بعض دانشوروں نے عورت کی اس ترقی معکوس کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ عورت کے اس غیر فطری طریقے پر باعلم ہونے سے خاندانی نظام ختم ہو کر رہ گیا ہے، جس سے آئندہ نسلوں کا مستقبل مخدوش ہو گیا ہے۔ اس کا صحیح اور اصل کام مردوں سے تعاون کرنا اور ان کے بچوں کی تربیت کرنا ہے۔

اُوپر بیان کیے گیے حقائق کی روشنی میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے علوم ہیں جن کا حصول عورت کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے عورت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ملک اور مذہب کے بارے میں پوری واقفیت بہم پہنچائے۔ اس کے لیے سکول کی تعلیم میں ان تمام باتوں کا اہتمام ہو سکتا ہے۔ اس تعلیم کے دوران اس کو اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف ہونے کا موقعہ دیا جائے تاکہ اگر ان کو زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملے تو سکول کی تعلیم ہی ان کی راہنما بن سکے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے نرسنگ اور ڈاکٹری کا پیشہ ان کے لیے بہت مفید رہ سکتا ہے۔ اس پیشے کے لیے جس شفقت اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے وہ قدرتی طور پر عورت میں پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر عورتوں کے علاج معالجے کے لیے عورت کی ذات زیادہ بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ اس پیشے کے لیے عورتوں کی

تدریس اور تربیت کے لیے اس بات کا اہتمام ضروری ہے کہ حتی الامکان عورتیں عورتوں سے تعلق رکھیں اور مرد مردوں سے ۔ عورتوں کا دائرہ کار عورتوں تک محدود ہو اور مردوں کا مردوں تک ، یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ عورتیں مردوں کے ہسپتالوں میں کام کریں اور مرد عورتوں کے ہسپتالوں میں ۔ ان دونوں صنفوں کو آزادانہ میل جول سے روکنا دونوں کے لیے مفید ہے ۔ اس پیشے کے بعد تدریس کا پیشہ عورت کی فطرت سے بہت مناسبت رکھتا ہے ۔ اس میں سکول اور کالج دونوں کی تدریس شامل ہے ۔ اس مقصد کے لیے بھی عورتوں کی تربیت کے لیے علیٰحدہ ادارے کی ضرورت ہے ۔ ایسا کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ قوم کے بچوں کی تربیت کرنے سے پہلے اپنے اندر وہ صفات پیدا کرے گی جو تمام قوم کے لیے باعث فخر ہوں ۔

ہر قوم اپنے ملکی اور تہذیبی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر تعلیم نسواں کو فروغ دیتی ہے ۔ ہمارے ملک میں تعلیم نسواں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اپنے ایک قوم ہونے کا تصور پس پشت ڈال کر دوسروں کی نقالی کو علم کا مقصد قرار دیں اور رفتہ رفتہ اپنی انفرادیت کو خاک میں ملا دیں ۔ کسی علم کی ڈگری حاصل کرنے سے عورت کی تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوتا ۔ اگر کوئی علم عورت میں نسوانی کردار کے استحکام کا باعث نہ بنے تو اس کے لیے فائدہ مند ہونے کی بجائے الٹا نقصان دہ ثابت ہو گا ۔ علم کے حصول سے پہلے اس کی نسوانیت کا تحفظ ضروری ہے ۔

آج کل اس موضوع پر سوچنے والے دو گروہوں میں تقسیم ہیں ۔ ایک وہ لوگ ہیں جو مغربی طرز پر سوچتے ہیں اور تعلیم نسواں کے لیے بھی وہی طریقے سوچتے ہیں جن پر آج مغرب میں عمل ہوتا ہے ۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو علم و فن کے بارے میں مغربی علوم سے فائدہ تو اٹھانا چاہتے ہیں مگر وہ ان علوم پر اپنی مشرقیت کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے راستے میں بہت سی دشواریاں پیش ہوتی ہیں ۔ دوسرے مسائل کی طرح اس اہم قومی مسئلے کے لیے بھی اعتدال اور

معقولیّت کی راہ اختیار کرنی چاہیے ۔

(پروفیسر محمد مرغوب ایم ۔ اے)

ریڈیو

وائرلیس یا لاسلکی بیسویں صدی کی ان ایجادات میں سے ہے جن سے عقلِ انسانی دنگ ہے ۔ اس کی ایجاد اٹلی کے باشندے 'مارکونی' سے منسوب کی جاتی ہے ۔ مارکونی نے برقی لہروں کے ذریعے تجربات کیے اور آہستہ آہستہ ان میں کامیاب ہو گیا ۔ اس کے بعد لاسلکی کا چرچا ہونے لگا اور مزید تجربات کے لیے حوصلہ افزائی ہونے لگی ، اور آخر اس آلے کی ترقی سے ریڈیو معرضِ وجود میں آیا جس نے دنیا میں ایک تمدنی انقلاب پیدا کر دیا ۔

ریڈیو پر سب سے پہلا نشریاتی پروگرام اوائل ۱۹۲۰ء میں انگلستان سے جاری ہوا اور پھر ۱۹۲۲ء میں باقاعدہ طور پر براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ ہندوستان میں سب سے پہلے کلکتہ ، بمبئی ، مدراس اور رنگون میں ریڈیو کلب کھولے گیے ۔ ان پر بہت زیادہ خرچ آتا تھا اس لیے شروع میں یہ تفریح محض امرا تک محدود رہی ۔ بالآخر ۱۹۳۶ء میں دہلی میں ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا اور اس طرح ریڈیو کو بے حد مقبولیّت حاصل ہو گئی ۔ ریڈیو سیٹ بکثرت درآمد ہونے لگے اور اب تو گھر گھر ریڈیو سیٹ نظر آتے ہیں اور ہر طبقے کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔

یوں تو سائنس نے اس دور میں کئی ایجادیں کی ہیں لیکن ان میں سے ریڈیو کمال درجے کی مفید ایجاد ہے ۔ پیغام رسانی اور نشر و اشاعت کا کام جس سرعت و خوبی اور وسعت سے آجکل ریڈیو کے ذریعے ہو سکتا ہے ایسا کبھی انسان کے ذہن میں بھی نہ آتا تھا ۔ ریڈیو ضروری اطلاعات آناً فاناً ملک کے گوشے گوشے بلکہ دنیا کے چپے چپے میں پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے ۔ فاصلے کا سوال بے معنی ہو

کر رہ گیا۔ بڑے بڑے باکمال موسیقی نوازوں کے گیت اور نغمے غریب سے غریب شخص کو میسر آ رہے ہیں۔ بلند پایہ مقرروں، ادیبوں، شاعروں، سیاستدانوں اور اہل ہنر کے خیالات سے گھر بیٹھے ہر شخص مستفید ہو رہا ہے۔ دنیا بھر کی خبریں، مقامی حالات، منڈیوں کے بھاؤ، تجارتی نرخ، سرکاری ہدایات لوگوں کو بالکل وقت پر پہنچ رہی ہیں۔ رنگا رنگ کے تفریحی پروگرام، فلمی گانے، فرمائشی گانے اور بچوں کے دل بہلاوے کی باتیں بلا تکلف سُنی جا رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں عورتیں پردہ کی پابند ہونے کی وجہ سے تفریحات کے مقامات پر جانے سے قاصر رہتی تھیں۔ ریڈیو نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اب نہ صرف عورتیں بلکہ کم سن بچے اور بوڑھے تک اپنے مذاق کے مطابق ریڈیو کے پروگرام سے لُطف اُٹھاتے ہیں۔

ریڈیو کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دور دراز ملکوں کے بڑے بڑے اہم واقعات اور حادثات کی اطلاع فوراً تمام دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ لندن میں ایک ہنگامہ خیز کانفرنس ہو رہی ہو تو دنیا کے تمام ممالک میں براڈکاسٹ کے ذریعہ ساتھ ہی ساتھ تقاریر سُنی جا رہی ہوں گی۔ امریکہ میں کرکٹ میچ کھیلا جا رہا ہے تو ہر روز کی کارروائی اس انداز سے دنیا کے گوشے گوشے میں سنی جا رہی ہو گی گویا آنکھوں سے دیکھی جا رہی ہو۔ لاہور میں کوئی ٹسٹ میچ ہو رہا ہو تو تمام سکور کا پتہ چلتا رہے گا۔ شعرا کا کلام اور مجالس کی کارروائی ملک کے کونے کونے میں سنی جا رہی ہو گی۔ راولپنڈی سے صدر پاکستان قوم کو کوئی پیغام دینا چاہیں تو جوں جوں ان کے لبوں سے الفاظ نکلیں گے ساتھ ہی ساتھ لوگوں کے کانوں تک پہنچتے جائیں گے۔ اس قسم کی تمام کارروائیوں کو کانوں سے سُن کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا بذاتِ خود اس کارروائی میں شامل ہیں اور تمام کارروائی آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے۔

ریڈیو کی ایجاد سے قبل تجارتی طبقے کے لوگ اشیائے تجارت کے بھاؤ تبدیل ہونے کی اطلاعات حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ ٹیلی گرام کے منتظر رہا کرتے تھے یا ٹیلیفون پر کان لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ اب ایسی اطلاعات بڑے بڑے تجارتی مرکزوں کی طرف سے بلا تکلف ریڈیو پر

سنائی جاتی ہیں اور ہر شخص اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ مختلف منڈیوں کے بھاؤ، کمپنیوں کے حصّوں کی قیمت، تجارت کا نرخ، گھڑ دوڑوں اور میچوں کے نتائج، موسمی حالات ہم روزانہ عین وقت پر سن سکتے ہیں۔ یہ اطلاعات پہلے اخباروں میں آیا کرتی تھیں اور کئی کئی دن بعد۔ مگر اب ان کو ریڈیو پر وقتاً فوقتاً سنا جا سکتا ہے۔

دیہات کے رہنے والے بھی شہریوں کی طرح فائدے اٹھاتے ہیں۔ ریڈیو پروگرام میں ایک خاص حصہ دیہاتی لوگوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ روزانہ ایک گھنٹہ دیہاتیوں کے مطلب اور ان کے ڈھب کی باتیں پُرلطف انداز میں سنائی جاتی ہیں۔ عام طور پر یہ پروگرام مقامی زبان میں نشر کیا جاتا ہے۔ دیہاتیوں کی معلومات بڑھانے، تفریح کا سامان بہم پہنچانے اور مفید مطلب اطلاعات دینے کے لیے رنگا رنگ پروگرام بنائے جاتے ہیں اور دیہاتی انہیں دلچسپی سے سنتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ بچوں کا پروگرام بھی بچوں کی ضروریات کے پیش نظر بے حد سبق آموز ہوتا ہے۔ ریڈیو صرف یہی نہیں کہ مکانوں میں رکھا رہے اور گھر میں رہ کر ہی اس کے پروگراموں کو سن سکیں بلکہ متحرک اشیا میں بھی نصب کیا جا سکتا ہے اور ہر مقام پر اُن سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دوڑتی بھاگتی کاروں میں ریڈیو برابر کام کرتا ہے اور سفر کے ساتھ ساتھ تفریحات اور مفید اطلاعات سے محظوظ کرتا ہے۔ برقی بیٹری پر کام کرنے والے ریڈیو کو جنگل، صحرا، آبادی غرض جہاں کہیں چاہیں اُٹھائے لیے جائیں آپ اس کی آواز سے اسی طرح لطف اندوز ہوں گے کہ جس طرح ریڈیو گھر میں رکھ کر ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ ریڈیو سٹیشن عام طور پر موسیقی کی طرف زیادہ دھیان دیتے ہیں اور پروگرام کا زیادہ حصہ موسیقی کے لیے وقف رہتا ہے پھر بھی تعلیم و تربیت اور اصلاح و بہبود کے لیے کافی مواقع بہم پہنچتے ہیں۔ ریڈیو کے مختلف پروگراموں پر نظر ڈالی جائے تو اس میں ہر طبقے کے شخص کے لیے دلچسپی کا کچھ نہ کچھ سامان ملے گا۔ جو لوگ تجارت پیشہ ہیں، انہیں تجارتی معلومات وسیع پیمانے پر حاصل ہوتی ہیں۔ عورتوں کی تہذیب و تربیت اور دلچسپی

کے لیے پروگرام جداگانہ ہوتا ہے۔ بچوں کی واقفیت عامہ بڑھانے کے علیحدہ پروگرام ہوتے ہیں۔ ادب پسند اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے الگ پروگرام ہوتا ہے۔ ایسے ریڈیائی پروگرام تفریح کا سامان بھی ہوتے ہیں اور درس و تدریس کا ذریعہ بھی۔ بچے، بوڑھے، نوجوان اور ہر مذاق کے لوگ ان کارآمد اور مفید پروگراموں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ریڈیو تعلیمی لحاظ سے بے حد مفید چیز ہے۔ بچوں کا پروگرام ان کے ذہنی ارتقاء کے لیے ایک بااثر معلم کا کام دیتا ہے۔ باتوں باتوں میں تعلیم دینا ریڈیو کا ایک بھاری وصف ہے۔ بچے بڑی دلچسپی سے پروگرام سنتے ہیں اور معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے ہر روز صبح کے وقت تلاوت کی جاتی ہے۔ پھر قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنے کے لیے کچھ وقت مخصوص ہوتا ہے۔ گویا اس طرح مذہبی تعلیم بھی دی جاتی ہے جو نہایت مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح علماً اور قادر الکلام مقررین کے خیالات عوام تک پہنچائے جاتے ہیں۔ اساتذہ کے کلام، ادیبوں کے شاہکاروں، ڈراموں، افسانوں اور تنقیدوں سے ادب کو وسعت دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سامعین کو معیاری کتابوں، مصنفوں اور ادبی و علمی کارناموں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں اعلیٰ درجے کے معلم کا کام کرتی ہیں۔ وہ کام جو اخبارات، کتب کے مطالعہ اور اساتذہ کی مدد سے حاصل ہوتا ہے کافی حد تک ریڈیو کی بدولت دماغی کاوش کے بغیر انجام پاتا ہے۔ وقت بھی بچ جاتا ہے اور دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ اعلیٰ پایے کے سائنس دانوں، فلاسفروں، اقتصادیات کے ماہرین اور علماً و فضلاً کی تقاریر سے ہمیں مجلسی، سیاسی، معاشی، ادبی اور مذہبی مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ چھوٹے ریڈیو یعنی ٹرانسسٹر نے اور بھی آسانی پیدا کر دی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ شہروں کا تو ذکر ہی کیا دیہاتوں میں یہ ٹرانسسٹر عام نظر آتے ہیں۔ کھیتوں میں ہل بھی چلائے جا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ فرمائشی پروگرام بھی سنا جا رہا ہے۔ مسافر سفر میں بھی اسے اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور دنیا کے حالات سے باخبر رہتے ہیں۔

ریڈیو کی ایک ترقی یافتہ شکل ٹیلی ویژن کی ایجاد ہے۔ یہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ اس کی مدد سے ہم پروگرام میں حصّہ لینے والے کی آواز سننے کے ساتھ اس کی شکل بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ شکل ریڈیو میں لگے ہوئے ایک پردے پر سینما کی تصویر کی طرح نظر آتی ہے۔ ابھی اس ایجاد نے زیادہ ترقی نہیں کی، پھر بھی انگلستان، امریکہ اور دوسرے بڑے ملکوں میں اس کا رواج عام ہے۔ پاکستان میں بھی اس سے متعلق تجربات کیے جا رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب ٹیلی ویژن ہمارے ملک میں عام ہو جائے گا اور گھر گھر میں پروگرام سنے اور دیکھے جا سکیں گے۔

فرصت کے مشاغل

مشغلہ ایسی مصروفیت یا کام کو کہتے ہیں جو انسان اپنی فرصت کے اوقات میں کرتا ہے اور جس سے کوئی خاص نفع یا غرض مقصود نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص مزدوری کرتا ہے تو یہ اس کا مشغلہ نہیں ہے۔ گویا اپنی روزی کے سلسلے میں جو کام کیا جاتا ہے وہ مشغلہ نہیں کہلاتا۔ بعض لوگ جب دن کے کام کاج سے فارغ ہوتے ہیں تو وہ تصویریں بناتے ہیں یا شاعری کرتے ہیں یا ٹکٹ جمع کرتے ہیں تو یہ ان کے مشغلے کہلائیں گے۔

فرصت کے مشغلے انسان اپنی طبیعت کی پسند کے مطابق اختیار کرتا ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی قسم کا مشغلہ نہیں کرتے۔ صرف یار دوستوں سے گپیں مار کر وقت گزارتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہی ان کا مشغلہ ہے۔ شاعری، مصوری، تاش کھیلنا، یا باغبانی کرنا وغیرہ تمام ایسے مشاغل ہیں جو فرصت کے اوقات میں لوگ انجام دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مشغلے کو پیشہ نہیں بناتا۔ بعض لوگوں کی آمدنی قلیل ہوتی ہے اور اس محدود آمدنی میں گزارہ نہیں کر سکتے اور فرصت کے اوقات

میں کوئی اور کام کرنے لگتے ہیں جس سے انہیں تھوڑا بہت سہارا مل جاتا ہے تو یہ کام مشغلہ نہیں کہلائے گا۔ مشغلہ کا مطلب صرف ایسی مصروفیت ہے جس سے دانستہ طور پر کوئی کامل فائدہ مقصود نہ ہو بلکہ وقت گزارنے کا ایک شغل ہو۔

انسانی طبائع ہمیشہ مختلف رہی ہیں۔ ان کی نگاہِ انتخاب بھی اسی طبیعت کے فطری تقاضے کے مطابق ہوتی ہے۔ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ مثلاً میری نگاہ میں جو چیز حسین ہے وہ شاید آپ کی نگاہ میں نہ ہو کیونکہ ذوق جمالیات کی شرح مختلف ہے۔ طبائع کا یہی اختلاف مشاغل کے انتخاب میں بھی موجود ہے۔ انتخاب کرتے وقت مشغلہ کی اہمیت کو ضرور مدنظر رکھیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ بعض مشاغل نقصان دہ ہوتے ہیں۔ مثلاً تاش کھیلنا، کیونکہ اس سے بڑھتے بڑھتے جوا کھیلنے کی لت پڑ جاتی ہے اور اس کا انجام ظاہر ہے۔ اس لئے دیکھنا چاہئے کہ جو مشغلہ اختیار کیا جا رہا ہے وہ کہیں نقصان رساں تو نہیں ثابت ہوگا۔ دنیا میں ایسے مشاغل بھی ہیں جو تفریح کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں فائدہ بھی پہنچاتے ہیں۔ سیر و تفریح، شکار، فوٹو گرافی، شاعری، کتب بینی وغیرہ ایسے مشغلے ہیں جو ہر طرح مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہمارے خیال میں مطالعۂ کتب سب سے اچھا مشغلہ ہے۔ اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ کتب بینی سے انسان کے علم میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے اور اپنے بھلے بُرے کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اپنے پسند کی کتابیں اور مضامین پڑھنا دماغ کو روشن کرتا ہے اور آدمی کی فکر کو جلا دیتا ہے۔ تمام دنیا کا علم گھر بیٹھے حاصل ہوتا ہے۔ خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دل میں ترقی کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ترقی کی نئی نئی راہیں سوجھتی ہیں اور بعض دفعہ انسان کتب کے مطالعے کی بدولت کچھ نہ کچھ بن جاتا ہے۔ مشاہیر کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں تقریباً سب ہی کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے۔ یہ مشغلہ سستا بھی ہے کیونکہ کتابیں خریدنے کی استطاعت نہ ہو تو

مانگ کر پڑھی جاسکتی ہیں۔ لائبریریوں میں جاکر یہ شوق پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کتابوں کے انتخاب میں غور وفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

ہر انسان کا کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ہوتا ہے، کیونکہ فارغ وقت گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا درکار ہوتا ہے۔

ہزاروں کام ہیں دنیا میں ذوق کرنے کو
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

فرصت کے مشاغل اگر طبیعت کے مطابق ہوں تو آدمی تندرست، خوش وخرم اور توانا رہتا ہے۔ مضرت رساں مشاغل اختیار کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ تو وقت کا ضائع کرنا ہے۔

مردوں کی طرح عورتوں کے بھی خاص خاص مشغلے ہوتے ہیں مثلاً سینا پرونا، چرخہ کاتنا، کتابیں پڑھنا وغیرہ۔ غرض ہر انسان اپنے فارغ وقت کو گزارنے کیلیے کسی نہ کسی مشغلے کا سہارا لیتا ہے۔ اس قسم کی مصروفیت کے بغیر زندگی گزارنا بڑا کٹھن کام ہے۔

کھیلوں کی اہمیّت

کھیل جسمانی صحت کے لیے ایک لازمی مشغلہ ہے۔ جس طرح بغیر کھائے پیے زندہ رہنا مشکل ہے۔ اسی طرح بغیر کھیل کے صحت کا بحال رکھنا محال ہے۔ ایک انگریزی مقولے کیمطابق دماغ بھی اسی کا صحت مند ہوتا ہے جس کا جسم مضبوط اور توانا ہو۔ A SOUND MIND IN A SOUND BODY

اگر جسم اور دماغ صحت مند نہ ہو تو زندگی بیکار ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کھیل ہماری زندگی کا اہم حصہ ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہی قومیں دنیا میں طاقت ور شمار ہوتی ہیں جنہوں نے کھیل کود کو تعلیم کا اہم جزو بنایا ہے۔ قدیم یونان جس نے سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسی عظیم الشان ہستیاں پیدا کیں کہ جن کے کارنامے قیامت تک مٹنے والے نہیں، ان کے یہاں یہ عالم تھا کہ کھلاڑی کئی

کئی سال درسگاہوں میں مشق کیا کرتے اور مقررہ وقت کے بعد منتخب کھلاڑیوں کا مقابلہ اولمپیا کے غیر فانی میدان میں ہوتا تھا۔ اولمپیا کے مقابلے میں چنا جانا یا فقط شامل ہونا ہی ایک بڑا اعزاز تھا۔ کھیلوں کے انہماک کا یہ نتیجہ نکلا کہ یونانی قوم دنیا کی زبردست قوم بن گئی اور اپنی طاقت، تہذیب اور حکمت کے زور سے نہ صرف دنیا کے کافی حصے پر حکمرانی کی بلکہ اپنی تہذیب کو بھی پھیلایا۔ اسی طرح اہل روما نے بھی تعلیم میں کھیل کو بہت زیادہ اہمیت دے رکھی تھی۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ نپولین جیسے ماہر اور زبردست جرنیل کو واٹرلو کے میدان میں شکست دینے والے وہی کھلاڑی تھے جنہوں نے ایٹن (ETON) کے کھیل کے میدان میں مقابلہ، جرأت اور استقلال کی تربیت حاصل کی تھی۔

زمانہ حال کی بڑی بڑی طاقتوں نے کھیل کو اتنی ہی اہمیت دی ہوئی ہے جتنی کہ تعلیم کو۔ اس کا واضح ثبوت عالمی اولمپک مقابلوں میں ان کے کھلاڑیوں کی شاندار فتح ہے۔

اسی ضمن میں قائد اعظم نے پہلی پاکستان اولمپک گیمز ۱۹۴۸ء کے موقع پر فرمایا تھا: "اعلیٰ دماغوں کے لیے صحت مند جسم چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم ورزشی کھیلوں کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور اپنے ملکوں میں اس کو پھیلانے اور ترقی دینے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ ہماری مختلف سپورٹس انجمنیں بھی پاکستان کو اعلیٰ، مضبوط اور طاقتور بنائیں گی۔"

اگر ہم ایک زندہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی تعلیم کے ساتھ کھیل کود کے میدان کی رونق بڑھانا ہو گی کیونکہ کھیلوں کو صحیح طریقے سے کھیلنے اور منظم کرنے سے قوموں میں عظیم الشان انقلاب آیا ہے۔

کھیلوں کا صرف یہی فائدہ نہیں ہے کہ جسم تندرست و توانا رہتا ہے، بلکہ ان کے ذریعے نوجوان وہ تربیت حاصل کرتے ہیں جو آئندہ کے لیے مشعل راہ ہوتی ہے۔ تنظیم، اتحاد اور صبر و تحمل کا سبق ملتا ہے۔ خود اعتمادی کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک

مشترک نصب العین کی خاطر تگ و دو کرنا اور ذاتی مفاد کے خیال کو ترک کر کے ٹیم یا پارٹی کے مفاد کی خاطر جد و جہد کرنا ، یہ وہ صفات ہیں جو خود غرضی کو ختم کرتی ہیں۔ یہی پارٹی یا ٹیم کے مفاد کا خیال اپنے محدود دائرے سے نکل کر انسان کے اندر حب الوطنی کا قابل قدر جذبہ پیدا کرتا ہے۔ نظم و ضبط ، چستی و چالاکی اور دور اندیشی یہ وہ خوبیاں ہیں جو کسی بھی قوم کی تعمیر میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔

تفریح اور سکون کی تلاش انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ کھیل دلچسپی اور تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔ تمام دن سکول، کالج اور دوسری مصروفیتوں کے بعد دماغ شام کے خوشگوار موسم میں اپنی تھکاوٹ، آسائش اور سکون میں تبدیل کر لیتا ہے۔ کھیل کا میدان ہمیں سکھاتا ہے کہ قائد کی اطاعت اور ساتھیوں کے ساتھ بے لوث تعاون کی کتنی اہمیت ہے۔ دوسروں کی رہنمائی کس طرح کی جاتی ہے۔ نیز کھیل کے میدان میں مساوات کا اعلیٰ سبق ملتا ہے۔ یہاں امیر غریب، چھوٹے بڑے یا گورے کالے کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ دو حریف جب ایک دوسرے کے مقابلے میں اترتے ہیں تو ہر ایک کے دل میں جیت کی امنگ اچھا کھیلنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس طرح تگ و دو کے جذبات جنم لیتے ہیں جو زندگی کے میدان میں ترقی کا سبب بنتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں صحیح تربیت پانے والا نوجوان زندگی کے میدان کارزار میں کبھی ناکام نہیں ہوتا۔

کھیلوں کی اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ سکولوں ، کالجوں اور دوسری کلبوں کو پوری پوری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تا کہ خالق ، نواز ، حمیدی ، نصیر ، تنویر ڈار ، حفیظ کاردار ، امتیاز ، فضل محمود ، ہاشم خاں جیسے بین الاقوامی شہرت کے کھلاڑی پیدا ہو سکیں۔ ہاں ایک بات کھلاڑیوں کے ذہن نشین کر دینا ضروری ہے کہ کھیل صرف جیتنے کے لئے نہیں بلکہ مضبوط عزم اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کرنے کے لیے کھیلے جاتے ہیں۔

عوامی میلہ ــــــ میلہ چراغاں

پاکستان کے طول و عرض میں سال کے مختلف دنوں میں میلے منائے جاتے ہیں
بعض میلوں کا تعلق کسی مذہبی تہوار سے ہوتا ہے، جیسے عید الفطر یا عید بقر کا میلہ۔
اسی طرح بعض اوقات محض تفریح کی خاطر میلے منعقد ہوتے ہیں۔ کبھی کسی بزرگ کے
عرس کے موقع پر ایسی تقریبیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس لحاظ سے شاہ عبد اللطیف بھٹائی
کا میلہ اور لاہور کا میلہ چراغاں بے حد مشہور ہیں۔

میلہ چراغاں ہر سال مارچ کے آخری ہفتہ اور اتوار کے مغلوں کے حسین ترین باغ
شالامار میں لگتا ہے۔ لیکن اگر رمضان ہو تو اس کی تاریخیں تبدیل کر دی جاتی ہیں۔
موسم بہار کا ہر میلہ اپنی شان و شوکت میں بے مثال ہے۔ یوں تو عرس اور میلے اور بھی
ہوتے ہیں۔ لیکن اس میلے کی سج دھج کچھ اور ہی سماں دکھاتی ہے۔ شالامار باغ کا قرب
اور بزم چراغاں اس کی شان کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے شالامار باغ دیکھا
وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وسیع عالیشان اور پر فضا باغ کی چار دیواری میں لوگوں کا
بے پناہ ہجوم کیا شان دکھاتا ہو گا۔ ایک طرف سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی حسین بارہ
دریاں اور چبوترے، دوسری طرف سبز مخمل کی طرح نرم نرم گھاس پھولوں کی کیاریاں،
خوبصورت صاف ستھری روشیں، ان میں فواروں کا رقص، پھر ان سبزہ زاروں میں
رنگیلے سجیلے لوگ زرق برق لباس پہنے ہوئے کیسے بھلے معلوم ہوتے ہوں گے۔

یہ میلہ ایک خدا رسیدہ بزرگ حضرت شاہ حسین کی یاد میں منایا جاتا ہے جن کا مزار
شالامار کے بالکل قریب واقع ہے۔ مزار پر بے شمار چراغ جلائے جاتے ہیں جس سے
درگاہ اور گرد و نواح کا منظر بقعۂ نور بن جاتا ہے، اسی وجہ سے اس عرس کے میلے

کو میلہ چراغاں کہا جاتا ہے۔

اس میلے کو چونکہ تاریخی حیثیت حاصل ہے اس لیے اس کی تیاریاں بہت پہلے شروع کر دی جاتی ہیں۔ ڈھول، طبلہ، دف، سارنگی، چوہا اور چمٹا وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں جمعہ کے روز دیہاتیوں کی ٹولیاں اپنے اپنے گاؤں سے روانہ ہوتی ہیں اور ہفتے کے روز وہ لاہور کی سڑکوں پر قطار اندر قطار اچھلتے کودتے گاتے بجاتے اور ہلڑ مچاتے شالامار کی طرف قدم بڑھاتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہات کا بچہ بچہ میلہ کی خوشی میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ اور تو اور پیری کی ہڈیوں میں بھی شباب کی بجلیاں مچلنے لگتی ہیں۔ اور بڑے بوڑھے بھی بے اختیار بچوں کی طرح ناچنے لگ جاتے ہیں۔

دوکاندار اور سودا سلف بیچنے والے دو ایک روز پہلے ہی سے آکر ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔ ہفتہ کی شام بے حد رنگین اور پر کیف ہوتی ہے۔ اگر چاندنی رات ہو تو منظر اور بھی دلفریب ہو جاتا ہے۔ سنگ مرمر کی بارہ دری پر حسن کا نکھار آجاتا ہے۔ تالاب کے فوارے دمک اُٹھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرو صنوبر اور چنار کے درخت بھی "ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے" کا ورد کر رہے ہیں۔ پہلی منزل میں جا بجا خیمے لگے ہوتے ہیں۔ جن میں موسیقی کی تانیں بل رہی ہوتی ہیں۔ درمیانی منزل کی بارہ دری اور تالاب کے گرد گانے بجانے اور رنگ رلیاں مچانے والوں کی ٹولیاں نظر آتی ہیں۔ پرانے وقتوں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں اس میلے کا شاہانہ ٹھاٹھ ہوا کرتا تھا۔ شوقین اور دولت مند لوگ میلے سے کئی دن پہلے خیمے لگا لیتے تھے۔ محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ رنگ رنگ کے کھانے پکتے تھے اور دعوتیں ہوتی تھیں۔ دن کو سیر و تفریح، رات کو قوالی۔ پھر عرس کے موقع پر نذر و نیاز اور بھنڈارے تقسیم ہوتے تھے۔ گانے والیوں کے مجرے ہوتے۔ [illegible] کی نقلیں ہوتیں۔ سوانگ بھرے جاتے اور رات انہیں رنگ رلیوں میں بسر ہو جا!

کرتی تھی۔ زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ان باتوں میں تبدیلیاں آگئی ہیں، لیکن میلے میں شریک ہونے والے لوگوں کے شوق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مزار پر درویشوں کا ویسے ہی ہجوم ہوتا ہے، خیرات بٹتی ہے۔ دھوم دھام سے چراغاں ہوتا ہے۔ ہاں بیل گاڑیوں کے بدلے اب ٹانگے اور موٹریں دکھائی دیتی ہیں۔ اور قوالی کے ساتھ ساتھ گراموفون ریکارڈوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں

اتوار کے دن خوب چہل پہل ہوتی ہے۔ شالامار کے دروازے تک موٹروں، بسوں، ٹانگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ باغ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہوا کے لطیف جھونکوں میں سگرٹ کا دھواں لہرانے لگتا ہے۔ خوانچے والے اپنے خوانچے سنبھال لیتے ہیں۔ حلوائیوں کی کڑاہیوں میں سرسوں کا تیل تڑتڑاتا ہے۔ جلیبیاں اور پیلے بوندی کے لڈو دیہاتیوں کو پکار پکار کر رہ جاتے ہیں۔ نان کباب اور تکوں کے انبار کام و دہن کی آزمائش کے لیے آراستہ کر دیے جاتے ہیں۔

کچھ لوگ تھک کر پیڑوں کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تاش یا شطرنج کی بازی لگتی ہے۔ کہیں قصہ گو لطیفوں اور چٹکلوں سے محفل کو قہقہہ زار بنا دیتے ہیں۔ طبلوں کی تھاپ اور ڈھول کی دھمک سے سارا باغ گونج اٹھتا ہے۔ دیہاتی لوگ لوک گیتوں اور بولیوں سے میلے کی رونق میں اضافہ کرتے ہیں۔ بانس پر باندھا ہوا لکڑی کا چوہا، ڈوری کے ذریعے کھینچ کر نچایا جاتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ فحش گیت گائے جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ اپنا تحت الشعور اگل رہا ہے۔ جنسی الجھنوں کے پرچے اڑائے جاتے ہیں۔ تاہم بحیثیت مجموعی یہ منظر اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ گھنٹوں طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ دیہاتی لوگ جھوم جھوم کے پڑھتے ہیں

کھٹن چلیاں تے کیہہ کھٹ لیندا
کھٹ کے لیاندے پیڑے،

تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ہولی کے دن شالامار باغ میں مادھو لعل رنگ کی پچکاریاں چلاتا پھرتا تھا۔ اچانک وہ حسین کے پاس آیا اور ان کی داڑھی کو بھی لالہ زار بنا دیا۔ شیخ اس طفلانہ حرکت سے کچھ اس طرح محظوظ ہوئے کہ اٹھ کر ناچنے لگ گئے۔ میلہ چراغاں کا ناچ گانا بھی اسی رقص عاشقانہ کی یادگار ہے۔

سینما ——— فوائد اور نقصانات

تفریح انسان کی طبیعت کا خاصا ہے۔ مختلف زمانوں میں تفریحات کے سامان مختلف رہے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں شہروں میں متحرک تصاویر کی نمائش تفریح کا سامان لیے ہوئی ہے۔ اگرچہ متحرک و متکلم فلم کو رواج میں آئے زیادہ مدت نہیں گزری مگر اس کے شائقین نے اس کی بے حد قدر دانی کی ہے۔ اور باقی قسم کی تفریحات اس کی موجودگی سے پس پشت جا پڑی ہیں۔ چنانچہ بڑے شہروں میں مشکل کوئی آدمی ایسا ملے گا جسے سینما دیکھنے کا شوق نہ ہو۔ سینما میں بہت سے معاشرتی اور تعلیمی فائدے بھی ہیں۔

انسان ہمیشہ سے نقل کو پسند کرتا آیا ہے۔ فلم کار انسان کی دلچسپی کے واقعات کو نقالی کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور انسان انہیں دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض قسم کی نقالی میں انسان کو اپنی آرزوؤں کا عکس نظر آتا ہے اور وہ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے۔ جیسے اس کی دیرینہ حسرتیں نکل رہی ہوں۔ جب فلم کے ذریعے مزاحیہ واقعات پیش کیے جاتے ہوں تو انسان کے دبے ہوئے فطری جذبے کو آزاد ہونے کا موقعہ ملتا ہے اور وہ اپنے آپ کو کچھ وقت کے لیے سماج اور ماحول کے دباؤ سے فارغ پا کر مسرت میں کھو جاتا ہے۔ سینما زندگی کی کوفتوں اور بیزاریوں کو دور کرنے کا ایک آسان ذریعہ ہے۔ محنتی لوگ سارا دن کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ دماغی کام کرنے والے لگاتار گھنٹوں میز پر بیٹھے

اکتا جاتے ہیں۔ دوکاندار صبح سے شام تک گاہکوں سے باتیں کرتے کرتے تنگ پڑ جاتے ہیں۔ دن بھر کے یہ تھکے ماندے لوگ جوں ہی سینما ہال میں داخل ہوتے ہیں فرحت و انبساط سے ان کی طبیعتیں شاد ہو جاتی ہیں۔ دلکش نظارے، محبت خیز راز، دلربا نغمے، حسن و عشق کے واردات دلوں میں ولولے اور جوش پیدا کرتے ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں دماغ کی کوفت دور کر دیتی ہیں۔ پردۂ سیمیں پر دلفریب رقص اور دلکش مناظر دن بھر کی تھکن زائل کر دیتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ فلم دیکھنا دل و دماغ کو فرحت بخش ٹانک مہیا کرتا ہے جس سے طبیعت کی افسردگی اور بیزاری دور ہو جاتی ہے۔ گویا سینما فکر و الم سے ایک پناہ گاہ ہے۔

سینما چونکہ دل و دماغ پر گہرا اثر کرتا ہے اس لیے اس کے دیکھنے والوں کے اخلاق و عادات پر بھی اس کا عکس پڑنا ضروری ہے۔ اگر فلموں میں اعلیٰ مذاق اور اخلاق کو داخل کیا گیا ہو تو اس سے لوگوں کے اخلاق سدھارنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ فلمیں دیکھ کر نوجوانوں کے ارادے مضبوط اور ہمتیں بلند ہوتی ہیں۔ اولوالعزم بہادروں کے کارناموں کو دیکھ کر طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ بلند خیال انسانوں کی زندگی کے واقعات آنکھوں کے سامنے دیکھ کر طبیعتوں کو بلند کردار کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ مشہور عالم ہستیوں کے طرزِ عمل سے ترقی کے خواہشمند جوانوں کو بیش قیمت سبق ملتے ہیں انہیں اپنے لیے زندگی کا لائحۂ عمل مرتب کرنے کے لیے اشارات ملتے ہیں۔ فتح مند اور کامیاب دلیروں کی روداد زندگی کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔

سوسائٹی کی اصلاح کا جتنا کام سینما کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ کسی دوسری طرح کی تبلیغ سے نہیں ہو سکتا۔ جب سوسائٹی کی قباحتوں کو فلموں کے ذریعے لوگوں کے سامنے ظاہر کیا جاتا ہے۔ تو طبیعتیں اس سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ جو کام سینکڑوں لیکچر دے سکتے ہیں وہ ایک فلم سے حاصل ہو جاتا ہے۔

سینما تعلیم کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ بہت سے مسائل جن کے سمجھانے میں

دقتیں پیش آتی ہیں، ایک کہانی کے رنگ میں پیش کرکے ذہن نشین کرا دیے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں جن کی ضخامت سے ڈر لگتا ہے اور کند ذہن طلباء کے لیے ان کا مطالعہ دشوار ہوتا ہے ان کے مضامین کو فلم کی شکل میں لاکر بآسانی سمجھا دیا جاتا ہے شیکسپیئر کے تمام ڈراموں اور ڈکنز کے تمام ناولوں کی فلمیں بنا کر دکھائی جا چکی ہیں۔ ایسے آغا حشر کے متعدد ڈرامے جو پہلے تھیئٹر کے اسٹیج پر دکھائے جاتے رہے فلم کی شکل میں پردۂ سیمیں پر دکھلائے گئے ہیں۔ دیگر بہت سے ڈرامہ نگاروں، ناول نویسوں، ادیبوں تاریخ و جغرافیہ کے عالموں، فلاسفروں کی کتابوں کے مضامین فلموں کی شکل میں دکھائے جاتے ہیں۔ ان فلموں کے دیکھنے سے تھوڑے وقت میں حقائق واقعات زیادہ آسان اور دل نشین پیرائے میں سمجھ میں آجاتے ہیں اور ان کے ساتھ ہماری دلچسپی تادیر قائم رہتی ہے۔

ایک لحاظ سے کتابوں کی نسبت فلموں کے ذریعے زیادہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں ہم صرف واقعات پڑھ لیتے ہیں، شخصیتوں کے کارنامے جان لیتے ہیں، مگر ان کی شکل و صورت، طرزِ معاشرت، اسلحہ و ہتھیار، تاج و تخت کی شان فوج کے رنگ ڈھنگ وغیرہ سے آگاہ نہیں ہونے پاتے ہیں۔ مگر فلم کے ذریعے ان تمام چیزوں کو گویا اصلی شکل اور حقیقی روپ میں آنکھوں کے سامنے دیکھ لیتے ہیں۔ ہم جغرافیہ کی کتابوں میں بلند پہاڑوں، وسیع دریاؤں، بڑی بڑی جھیلوں، گھنے جنگلات اور گہرے سمندروں کی نسبت صرف پڑھ لیتے ہیں مگر سینما میں آسام کے جنگلات، اہرام مصر، ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی مہم، دریائے نیل کی طغیانی، نیاگرا کی آبشار وغیرہ کا نظارہ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر پاتے ہیں جس سے طبیعت پر ایک مسرور تعجب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سینما کا ایک بیش قدر فائدہ یہ ہے کہ ناخواندہ طبقہ کو تعلیم دینے اور ان کی معلومات میں اضافہ کرانے کے لیے یہ نہایت کارآمد ہے۔ زراعت پیشہ لوگوں

کو لیجئے۔ یہ لوگ عام طور پر ناخواندہ ہوتے ہیں۔ اور کاشت کاری کے جدید آلات اور طریقوں سے ناواقف۔ فلم کے ذریعے انہیں کاشت کے جدید طریقوں سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں کھیتوں میں کام کرتی ہوئی مشینیں دکھا کر ان کے فائدوں اور ان سے کام لینے کے طریقے سے واقفیت دلائی جا سکتی ہے۔ انہیں یہ بات دل نشین کرائی جا سکتی ہے کہ جدید آلات اور جدید تدابیر سے کاشت میں کس قدر ترقی ممکن ہے سینما کے ذریعے یہ چیزیں ان آنکھوں کے سامنے ہوں گی اور وہ باتیں جو برسوں تجربے کر کر کے اور بیسیوں لیکچر دے کر کسانوں کے ذہن میں نہیں ڈالی جا سکتیں فلم کے ذریعے دو گھنٹوں میں دلوں پر نقش کرائی جا سکتی ہیں۔

سینما کے فوائد کے ساتھ ساتھ کچھ نقصانات بھی ہیں۔ بعض فلموں میں مخرب اخلاق واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ بالخصوص جنسی محبت کو عریاں طریقے سے دکھلایا جاتا ہے۔ مثلاً نیم عریاں جسم سے ناچ، بوسہ بازی، بغل گیری اور اسی قسم کی اور حرکات جو کھلم کھلا عیش پرستی کی تلقین کرتی ہیں ان کو دیکھنے سے نوجوانوں میں جنسی خیالات کا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ پست اخلاق اور رذیل جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ کئی نوجوان ایسی ہی فضول تصاویر کی بدولت جرائم پیشہ اور اوباش بن گئے ہیں۔ اکثر بڑے بڑے خاندانوں کے نوجوان ایکٹرسوں کے غائبانہ عاشق بنتے ہیں۔ لڑکیوں کا تعاقب کرتے ہیں اور فرضی معشوقہ کی یاد میں شعر پڑھتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں میں نامناسب فیشن پرستی شروع ہو جاتی ہے۔ لباس اور آرائش کی دوسری چیزیں جو انہیں فلم میں دکھائی جاتی ہیں ان کی نقل اتارنے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ بخصوصاً عورتیں اس بارے میں اپنی کمزوری کا زیادہ اظہار کرتی ہیں۔ وہ کسی ایکٹرس کی نئی قسم کی ساڑھی دیکھ کر خود ویسی ہی ساڑھی پہننے کی خواہش کریں گی۔ ان کی پیچ دار زلفوں کی بناوٹ کی ریس کریں گی اور اس کی چال کے تکلفات کو اپنانے کی کوشش کریں گے۔ غریب یا متوسط گھرانے پر ان باتوں کا اثر بہت بُرا

پڑتا ہے۔ موجودہ زمانے میں نوجوان لڑکیوں میں جو نزاکت پسندی اور فیشن پرستی رواج پا چکی ہے اس کے پیدا کرنے میں فلم کا بڑا دخل ہے۔

زر کا سوال بھی کچھ کم قابلِ غور نہیں۔ سینما کی تفریح کا خاصی مہنگی پڑتی ہے۔ اس میں براہِ راست خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ بار بار سینما دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں انہیں بہت سی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ روپیہ کے ساتھ وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ بینائی پر بھی اثر پڑتا ہے اور سینما کی تیز روشنی سے نگاہ کمزور ہو جاتی ہے۔ بعض نوجوانوں کو فلم دیکھنے کا خبط ہو جاتا ہے۔ جب تک وہ فلم نہ دیکھ لیں۔ انہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ وہ مطالعہ یا دوسرے کاموں کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

ان سب نقصانات کے باوجود جب سینما کا پوری طرح جائزہ لیا جاتا ہے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ سینما میں نقصانات کی نسبت فائدے زیادہ ہیں۔ تفریحی اور تعلیمی اعتبار سے اس کے فوائد بیش بہا ہیں۔ کوئی شخص سینما کا کتنا ہی زبردست مخالف کیوں نہ ہو اسے ماننا پڑتا ہے کہ سینما میں اعلیٰ درجے کی تفریح بہم پہنچانے کا وصف پایا جاتا ہے اور وہ اس زمانے میں ایک نعمت ہے۔

(ممتاز رضا)

سائنس کے کرشمے

سائنس کی عجیب و غریب ایجادات نے آج کی دنیا میں وہ عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ اگر اب سے سوڈیڑھ سو برس پہلے کے لوگ اس دنیا میں آ جائیں تو مشکل سے تسلیم کر سکیں گے کہ یہ وہی دنیا ہے جس میں وہ پہلے آباد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ ایجادوں نے دنیا کو ایک طلسم خانہ بنا دیا ہے جس کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ آج سے پہلے جو باتیں ناممکن معلوم ہوتی تھیں وہ سب ممکن معلوم ہوتی ہیں۔

وہ چیزیں جس کا ذکر صرف روایتی کہانیوں میں آتا تھا۔ آج حقیقت کا روپ دھار چکی ہیں۔ پہلے گراموفون کے ریکارڈ سن کر ہی لوگ دنگ رہ جاتے تھے کہ کس طرح انسان کی آواز کو پکڑ لیا گیا ہے۔ ریڈیو کی ایجاد نے گراموفون کو پس پشت ڈال دیا۔ ابھی ریڈیو میں آواز کی سننے کی حیرانی کم نہ ہوئی تھی کہ سائینس نے ایک قدم اور آگے رکھا اور ٹیلی ویژن ایجاد کیا جس میں بولنے والے کی آواز ہی سنائی نہیں دیتی بلکہ اس کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔

ریل، موٹریں، آبدوز کشتی، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون، بے تار برقی، ہوائی جہاز، جیٹ، میزائیل، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم وغیرہ سائنس کے وہ کرشمے ہیں جنہوں نے انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ان ایجادوں نے بنی نوع انسان کی زندگی کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اب حضرت انسان قدرتی عناصر آگ، پانی، ہوا، ذرات، وغیرہ پر غلبہ پا چکا ہے اور اپنی ضروریات کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔ یہ سہولتیں اور آسائشیں سب سائنس کی ترقی کے سبب سے ہیں۔

یوں تو سائنس نے ہماری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ لیکن ان میں سے دو بہت نمایاں ہیں۔ ایک تیزی اور دوسری سہولت۔ سائنس کی بدولت ہماری زندگی کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ جو کام پہلے ہم مہینوں یا ہفتوں میں کرتے تھے اب وہی دنوں یا گھنٹوں میں ہو جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کو دیکھیے۔ مہینوں کا سفر ختم گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے اور مسافر پلک جھپکنے کی دیر میں میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔ کراچی سے علی الصبح پرواز کریں تو شام کا کھانا لندن میں کھائیے۔ وہاں سے چلیں تو صبح کا ناشتہ نیویارک میں کریں۔ غرض ۲۴ گھنٹوں میں دنیا کی سیر ہو سکتی ہے۔

ریڈیو کے ذریعے دنیا بھر کے حالات سنو۔ دنیا کے کسی گوشے میں کوئی تقریر ہو رہی ہو یا کوئی میچ کھیلا جا رہا ہو تو ریڈیو کے ذریعے ہم یوں محسوس کرتے ہیں۔ کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ سمندری سفر جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن بحری جہاز

نے اسے محفوظ بنا دیا ہے۔ یہ جہاز کیا ہے ایک چھوٹا سا شہر ہے جس میں آرام و آسائش کے تمام سامان موجود ہیں۔ کھانا کھانے کے لیے ہوسٹل، تیرنے کے لیے حوض، کھیلنے کے لیے میدان، مطالعے کے لیے لائبریری، روشنی، پنکھے وغیرہ غرض وہ کون سی آسائش ہے جو جہاں موجود نہیں۔ ایسی ایجادوں نے دنیا کے دور دراز ممالک کو ایک دوسرے کے بالکل قریب کر دیا ہے۔

ٹیلی فون اور بے تار برقی کے ذریعے سینکڑوں میل دور پیغام بھیجے جا سکتے ہیں۔ ان ایجادوں نے انسانی زندگی کے لیے بے شمار آسائش پیدا کر دی ہیں۔ بجلی کی ایجاد کیا کم ہے۔ گھروں، دفتروں، کارخانوں میں کام آتی ہے۔ جس کام کے لیے سینکڑوں، آدمیوں کی قوت درکار تھی۔ بجلی پل بھر میں کر دیتی ہے، صرف بٹن دبانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس طرح وقت اور محنت کی بچت ہو جاتی ہے۔ شدید سردی میں بجلی کے ہیٹر جلا کر کمروں کو گرم کیا جا سکتا ہے اور گرمی کی شدت میں ایئر کنڈیشنر سے کمروں کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ تاریک راتوں میں بجلی کے قمقمے نور سے یوں بھرے ہوتے ہیں۔ کہ ان کی چمک دمک سے آسمان کے تارے شرما جاتے ہیں۔ لیمپ کی طرح نہ چمنی کی ضرورت۔ نہ تیل ڈالنے کی حاجت، نہ بتی کا جھنجھٹ، نہ دھوئیں کا نام اور نہ بو کا نشان۔ ذرا بٹن دبایا اور سارا گھر جگمگا اٹھا۔

کیمرے کے ذریعے چلتی پھرتی تصویریں نہایت آسانی سے لی جا سکتی ہیں۔ اجرام فلکی، عالی شان عمارتوں، ہوش ربا نظر، انسانی حرکات غرض ہر چیز کی ہو بہو تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ سینما کو دیکھیے پردے پر بولتی چالتی، ہلتی جلتی تصویریں، ہوائی جہازوں کی پرواز، شہروں کی تباہی، جنگ و جدل کے مناظر، دنیا کے عجائب۔ غرض وہ تمام مناظر جن کو عوام کا ذکر ہی کیا ہے خاص خاص لوگ بھی مشکل سے دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی اصلی حالت میں نظر آ جاتے ہیں۔

سائنس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کو بے جان بنا ہی

سے بچا لیا ہے۔ بے شمار ادویات کی وجہ سے بیماریوں کے علاج میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ ٹیکوں کے ذریعے وبائی امراض کی روک تھام ہو سکتی ہے۔ ایکس رے کی مدد سے ناقابل تشخیص امراض کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپریشن کے ذریعے انسان کو موت کے منہ سے بچایا جا سکتا ہے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے۔ سائنس نے جہاں بنی نوع انسان کو اتنے فائدے پہنچائے ہیں وہاں اس کی حیرت انگیز ترقی نے مصائب و ہلاکت کے سامان بھی مہیا کئے ہیں۔ مشینوں کے بے شمار فائدے ہیں۔ لیکن یہی حادثات کا سبب بھی بنتی ہیں۔ تباہ کن ہتھیاروں کی ایجاد بنی نوع انسان کی تباہی کا باعث ہے۔ ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، جیٹ طیارے، میزائل وغیرہ ہزاروں میلوں تک تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما پر ایک ہی بم پھینکا گیا تھا جس سے ہزاروں لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ ان بموں سے ایسی زہریلی گیسیں نکلتی ہیں کہ زمین جل جاتی ہے اور برسوں تک فصلیں بھی نہیں اُگ سکتیں۔

اس طرح یہ بم صدیوں کے لمبے لمبے شہروں اور سر بفلک عمارتوں کو آن واحد میں خاک میں ملا دیتے ہیں۔

ان تباہ کن آلات کے علاوہ مفید ایجادات نے بھی انسانی قدروں کو مٹا کر نقصان پہنچایا ہے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان مادہ پرست ہوتا جا رہا ہے اور روحانیت کا نام و نشان مٹتا جا رہا ہے۔ اسے ہر لحظہ اپنی آسائش اور آرام کی فکر دامن گیر ہے۔ تصنعات اور تکلفات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

الغرض یہ درست ہے کہ انسان نے سائنس کی بدولت زمان و مکان کے نظریات بدل دیئے ہیں، راکٹوں اور میزائلوں کے ذریعے ستاروں پر کمندیں ڈال چکا ہے، مشینیں اور کلیں تخلیق کر کے انسان کو جسمانی اور مادی سہولتیں پہنچائی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ذہنی سکون اور اطمینان قلب میسر نہیں۔ ایک مفکر کے الفاظ

ہیں سائنس نے انسان کو ہوا میں اُڑنا اور پانی میں تیرنا تو سکھا دیا لیکن زمین پر رہنا نہیں سکھایا۔ ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا !
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا !!

ایک دلچسپ سفر

(مری کی سیر)

مال روڈ کے ایک خوبصورت ہوٹل میں چائے پی رہا تھا۔ طاہر اور محمود سامنے بیٹھے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کل ہی تو ہم تپتی ہوئی دھوپ میں سٹیشن کی طرف آ رہے تھے۔ ٹانگے والا کہہ رہا تھا:

"بابو جی! گرمی نے تو مار دیا۔"

اور ہم ہنسی خوشی اسٹیشن سے باہر ہی پسینے میں شرابور چھوڑ کر ٹرین میں سوار ہو گئے۔ بہت جلد انٹر کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں اپنی الگ فضا تیار کی۔ چناب ایکسپریس زمین کے سینے کو چیرتی ہوئی برق پا بھاگی جا رہی تھی۔ ہم دیگر مسافروں سے بے نیاز مری کے سنہری خواب دیکھ رہے تھے۔ ٹرین صحراؤں، کوہساروں، سٹیشنوں، کھیتوں، گاؤں اور شہروں سے گزرتی رہی اور ہم ٹین، سوڈا، سٹیشنوں، کافی، رسالے اور گپوں سے دل بہلاتے کوہ و بیابان کے حسین خواب دیکھتے رہے۔ اور یہ خواب تب ٹوٹا جب ہماری ٹرین بل کھاتی، مڑتی اور اُمڈتی چڑھتی چٹانوں پر کوندتی ہوئی راولپنڈی پہنچ گئی۔

ہم تھوڑی دیر ٹھہر کر راجہ بازار سے ہو کر سیدھے مری کے بس اڈے پر جا پہنچے۔ بس تیار تھی، ٹکٹ لیے اور سوار ہو گئے۔ یہاں سخت گرمی تھی۔ اور لوگ پسینے میں شرابور تھے۔ خدا خدا کر کے بس چلی اور راولپنڈی کی سڑکوں سے گزر کر مری روڈ پر دوڑنے لگی۔ ہمارے رومانی سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرسبز باغوں، کھیتوں اور بستیوں سے گزر کر بس جونہی پہاڑوں کی طرف مڑی، ہوا کے خوشگوار جھونکے آنے لگے اور دماغ سے سفر کی تھکان آپ ہی آپ ڈھلنے لگی۔ پہاڑوں کی چڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ بس رینگ رینگ کر بلندیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ قدم قدم پر خطرناک موڑ تھے۔ وادیاں اور پہاڑ سرسبز ہونے لگے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہاڑی بستیاں اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے مکان عجیب اور دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔

آخر بس مسافت طے کرتی ہوئی کمپنی باغ پہنچی۔ یہاں ایک قدرتی چشمہ ہے۔ چند ریستوران بھی ہیں۔ وہاں اتر کر چائے پی اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوئے۔ یہاں سے مری تقریباً پانچ میل دور ہے۔ پہاڑیوں پر چیل اور دیودار کے درخت عجب بہار دکھا رہے تھے۔ موسم خوشگوار ہو چکا تھا۔ بس نہ جانے کتنے چشموں کے پاس سے گزرتی، یوکلپٹس کی شاخوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی بلندیوں کو پھلانگتی ہوئی مری پہنچ گئی۔ مطلع ابر آلود ہو چکا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی سامان اتارا اور ہوٹل کی طرف بھاگے مگر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اور ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی تمام کپڑے بھیگ گئے۔ ذرا بارش تھمی تو باہر نکلے۔ ہماری تھکی ماندہ روحیں پھر سے تازہ دم ہو گئیں۔ دیودار، چیل اور بلوط کے درختوں کی شاخوں سے بارش کی بوندیں موسیقی بکھیرتی ہوئی امرت برسا رہی تھیں۔

گرم گرم چائے ہمیں مری سے متعارف کرا رہی تھی اور طاہر اور محمود سامنے بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے۔ "یہ بارش مری کی خوبصورتی ہے۔ یہ درخت اور لوگ اس وادی کے بیٹے ہیں اور میں تمہاری میزبان ہوں۔" چائے ختم ہوتے ہی بارش بھی رک گئی۔

اور ایک دم سے سنہری دھوپ کے ٹکڑے سرسبز وادی میں قالین کی طرح تیرنے لگے۔ اور بارش کے ننھے ننھے قطرے گھاس اور پھولوں پر چمک اُٹھے۔

مری ایک خوبصورت مقام ہے۔ سڑکیں صاف ستھری، موسم کی رنگینی، دلفریب مناظر اور حسن و شباب کی دلکشی دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یہ علاقہ تقریباً سات ہزار فٹ بلند ہے۔ موسم گرما میں خوب چہل پہل ہوتی ہے۔ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ سیر و تفریح کے لیے یہاں آجاتے ہیں اور اس کی رونق میں اضافہ کرتے ہیں۔ سردیوں میں برف باری ہوتی ہے اور مقامی باشندوں کے علاوہ بہت کم لوگ دیکھنے میں آتے ہیں۔ مری میں چار روز قیام رہا اور خوب جی بھر کر سیر کی۔ گھوڑا گلی، یوتھ ہوسٹل، کشمیر پوائنٹ، پنڈی پوائنٹ، غرض ہر مقام پر پہنچے اور دلفریب مناظر سے لطف اٹھایا۔ مگر سب سے پر رونق جگہ مال روڈ ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ مال مری کی جان ہے۔ خوبصورت آراستہ دکانیں، بارونق ریستوران اور پھر لوگوں کا ہجوم۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسن و شباب کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ نوجوانوں کی آوارہ خرامی رنگ بکھیر دیتی ہے سارا ماحول چہروں کی چاندنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ گیسوؤں کی مہک اور آنچلوں کی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی ہے۔ ساون کی چنچل بدلیوں کی طرح شوخ جوانیاں رس گھول دیتی ہیں۔ چست لباس میں بھرپور جسم جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حسن و رعنائی سے بھرپور پہاڑیاں عجب طلسماتی نظارہ دکھائی دیتی ہیں۔ بل کھاتی حسین شاہراہیں اور درختوں کی چھاؤں میں اونگھنے والی سڑکیں سیاحوں کے قہقہوں سے گونجتی رہتی ہیں۔

جس دن ہمیں واپس آنا تھا اس رات بادل خوب گرجتے رہے، بجلی کڑکتی رہی اور ادلوں کے ڈھیر لگ گئے لیکن صبح ہوئی تو ہماری آنکھ دھوپ کی ان کرنوں سے کھلی جو ہوٹل کے دریچے سے اندر آکر ہمیں جگا رہی تھیں۔ ہم اٹھ بیٹھے۔ تمام وادی دھوپ سے نکھری ہوئی تھی۔ درختوں پر پرندے چہک رہے تھے۔ اور نیچے وادی

شریر بچوں کی طرح تیر رہے تھے۔ دور تک پھیلی ہوئی گھاس اور جنگلی پھولوں پر اوس کے قطرے چمک رہے تھے۔ ہم نے اُترتے ہوئے مری کی زمردیں وادی اُس کے حسین جلوؤں کو بڑے پیار سے دیکھا جیسے ہم نے کہا ہو

"اے پہاڑوں کی ملکہ! ہم تیرے دامن میں سکون، امن اور پیار حاصل کرنے اپنی تھکی ماندہ روحوں کو لے کر پھر کبھی ضرور آئیں گے۔ تو جب بھی اسی طرح نوجوان، تر و تازہ اور پر وقار ہوگی۔"

ہم تینوں نے زمین پر سے جھک کر ایک ایک خودرو پھول توڑا۔ کوٹ کے کالروں میں لگایا اور بس میں جا بیٹھے۔ بس چل پڑی۔ جنگلوں میں بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اور پہاڑی پھول ہوا میں ناچ رہے تھے۔ بس کے اوپر سڑک پر پہاڑی اخروٹ، چنار، گل مہر اور چیڑ کے درختوں کی شاخیں پیار سے جھوم رہی تھیں اور دور کہیں ایک چرواہا پہاڑی گیت بڑی درد بھری آواز میں گاتا اپنی بھیڑوں کو لے جا رہا تھا۔ مری پیچھے تھی اور راولپنڈی آگے اور نیچے وادیوں میں بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔

میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ

وہ شام میری زندگی کی سب سے زیادہ عجیب و غریب تھی۔ جب مجھے پہلی بار چوری کے تصور سے دل کی دھڑکن کی تیز رفتاری محسوس ہوئی۔ اس شام سے پہلے میرے دل میں کبھی بھولے سے بھی یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ دوسرے کا مال اتنی آسانی سے اپنایا جا سکتا ہے۔ کراچی آئے ہوئے مجھے پورے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ گھر سے بھاگ کر آنے والے ہر لڑکے کی طرح میری جیب میں بھی خاصی رقم تھی۔ جو ان پندرہ دنوں میں پیٹ کے کنوئیں میں ڈوب کر مر چکی تھی۔ اس یادگار شام میری جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور بیس پیسے تھے۔ اس پانچ کے نوٹ کو جیب سے دوسری جیب میں منتقل کرتے

ہوئے مجھے عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ پھر کیا ہو گا؟ یہی سوال میرے دل و دماغ کا طواف کر رہا تھا۔ بیس پیسے کبھی کبھی آپس میں ٹکرا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے، مگر ان کی موجودگی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ لا سکتی تھی۔

دونوں وقت آپس میں گلے مل کر شاید جھوم جھوم رہے تھے، ایسے جیسے سمندر کا کنارا آسمان سے مل رہا ہو۔ میں گیلی ریت پر بیٹھا ساحل کی جانب بڑھتی ہوئی موجوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ساحل سے ٹکرانے والی لہریں جب واپس ہوتیں تو ساحل کی جانب آتی ہوئی لہروں کو اندر ہی اندر کاٹ دیتیں۔ مجھے بے تحاشا وہ رقم یاد آتی رہی تھی جو یوں خرچ ہو گئی تھی جیسے کسی نے جیب کاٹ لی ہو۔

ایک تو اتوار کی شام دوسرے چودھویں کا چاند، لوگ شہر کے ہنگاموں سے بھاگ کر کلفٹن آئے تھے اور یہاں ہنگامہ کر رہے تھے۔ بے شمار لوگ ساحل کے ساتھ یوں پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے انہی لہروں نے سمندر میں سے نکال کر مونگوں، سیپیوں اور کوڑیوں کے ساتھ ساحل پر لا پھینکا ہو۔ مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ مالش والے کو پکار بیٹھا۔ مالش کروانے کی تک آج تک سمجھ میں نہ آسکی۔ بالکل غیر ارادی طور پر اُسے آواز دی۔ وہ مالشیا اپنا جغرافیہ اور تاریخ تفصیل سے سناتا رہا اور مالش اختصار سے کرتا رہا۔ تنگ آکر میں نے اس رامپوری بدماس (بدمعاش) کو پانچ کا نوٹ دیا کہ وہ باقی رقم لوٹا دے اس نے کمال اداکاری سے اپنے لباس میں دس پندرہ جگہیں ٹٹولیں اور ریزگاری کے نہ ہونے کی اطلاع دی۔ "ابھی لایا" کہہ کر افق کے اس پار نہ جانے کس دیو کی قید میں جا پھنسا۔ چاند کی بڑھیا نے اسے اپنی باتوں میں لگا لیا اور میں جوار بھاٹا کے شور میں ساحل ساحل اُسے تلاش کرتا رہا۔

جیب میں بجتے ہوئے بیس پیسے پانچ کے نوٹ کو ترستے ہی رہے۔ اس نوٹ کے چلے جانے کے احساس نے چودھویں کا چاند بن کر میرے دل میں مد و جزر پیدا کر دیا۔ اس مالیشے کے پورے خاندان کو میں جس قدر گالیاں یاد تھیں، دہرا دہرا کر دیتا

رہا۔ آخر تھک کر جب حواس میرے جسم کا بوجھ اٹھانے سے بیزار ہو گئے تو میں پھر اسی جگہ آ بیٹھا جہاں وہ آواز سن کر میں نے ماں بیٹے کو پکارا تھا۔ کاش وہ آواز پھر سنائی دے یہ خواہش بڑی شدت سے میرے دل میں پیدا ہوئی۔ دائیں جانب چند بچے کھیل رہے تھے۔ ان کے پاس کپڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ان کے ماں باپ ٹہلتے ٹہلتے کہیں آگے نکل گئے۔ میں نے بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھا تو مجھے اپنے بہن بھائی یاد آ گئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر جب میں نے چاند کی طرف دیکھا تو چاند جیسے چاندنی کے آنسو بہا رہا تھا۔ آس پاس تمام روشنیاں روتی ہوئی دکھائی دیں۔ نظریں گھوم پھر کر کپڑوں کے ڈھیر پر پڑیں تو وہیں جم کر رہ گئیں۔ میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے آنسوؤں کو صاف کیا۔ پھر اسی طرف دیکھنے لگا۔ کپڑوں میں ایک پرس رکھا تھا۔ یقیناً اس میں پیسے ہوں گے کچھ دیر تک میرا ذہن نیکی اور بدی کے متضاد تصورات کی رزم گاہ بنا رہا۔ پھر نامعلوم کس طاقت نے مجھے اپنی جگہ سے دھکیل دیا۔ میں نے پرس اٹھایا تو اس میں صرف پانچ روپے نکلے۔ خالی پرس واپس رکھ کر میں نے بچوں کی طرف نظر ڈالی۔ وہ پانی میں کھیل رہے تھے۔ میں نے ابھی چار پانچ ہی قدم اٹھائے تھے۔ کہ چیخیں سنائی دیں۔ بچے پانی میں مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر ان کی طرف بھاگا۔

چند لمحوں بعد جب میں پانی میں شرابور اس لڑکے کو ہاتھوں میں اٹھائے ساحل پر پہنچا تو اس کے والدین وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس کے باپ نے مجھے گرمجوشی سے سینے سے لگایا۔ اس کی ماں نے بڑھ کر میرے ماتھے کو چوما اور میں نظریں نیچی کر کے یہ سوچتا رہا کہ پانچ کا نوٹ بھیگ گیا ہو گا۔

اس لڑکے کی ماں نے کپڑوں میں سے اپنا پرس اٹھایا اور پھر اپنے خاوند سے بولی کہ میرے پرس میں پانچ روپے تھے، جانے کہاں گئے۔ آپ کے پاس ہوں تو اس لڑکے کو دیجئے۔ مجھے یوں لگا جیسے کہ میں آسمان اور زمین کے بیچوں بیچ معلق ہوں۔ یہ لو بیٹا

کچھ کھا پی لینا۔ اس کے خاوند نے میری جیب میں پانچ کا نوٹ ڈال دیا۔ میں جیسے دھڑام سے زمین پر آگرا ہوں۔ وہ شام ہمزاد بن کر اب تک میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ وہ شام نہ جیسے کل کی شام تھی۔

اُردو، ذریعۂ تعلیم

ع گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

"پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اردو ہوگی" یہ وہ الفاظ ہیں جو قائدِ اعظم نے ڈھاکہ کے ایک اجلاس میں دہرائے۔ اگر آپ کچھ عرصہ زندہ رہتے تو قومی زبان کے مسئلے کو بخوبی حل کر لیتے لیکن آپ کی وفات پر بنگالی بھائیوں نے بنگالی زبان کے لیے جد و جہد شروع کر دی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ مغربی پاکستان کے لیے اردو اور مشرقی پاکستان کے لیے بنگالی کو قومی زبان کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ توقع بھی ظاہر کی گئی کہ دونوں زبانوں کی ترقی کے لیے ایسے طریقے عمل میں لائے جائیں گے جو بیس برس کا عرصہ گزرنے سے پہلے پہلے اسے مکمل اور ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو میں لا کھڑا کر دیں گے اور ہمیں غیر ملکی زبان کے چنگل سے نجات دلائیں گے۔ لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود قومی زبان کو ایک موثر اور وقیع مقام نہ دیا جا سکا جس کی ایک قومی زبان مستحق ہوتی ہے۔

سب سے پہلا مسئلہ ذریعۂ تعلیم کا تھا کیونکہ جب تک کوئی قوم اپنی قومی زبان کو بہ درجہ نہیں دیتی اس کے افراد میں قوتِ اظہار اور انفرادی رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ نیز ان کی تخلیقی قوتیں بھی اجاگر نہیں ہو سکتیں۔ افراد کی ذہنی، اخلاقی اور سیاسی نشو و نما اور بیداری کے لیے اردو کو ذریعۂ تعلیم بننے میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے والا ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اپنی

سابقہ تربیت کے سبب انگریزی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہے اور اس حد تک اس کے عشق میں مبتلا ہے کہ ابد تک اسے اپنے ملک پر مسلط دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اُردو بے مایہ زبان ہے اور انگریزی کے زوال سے ملک میں جہالت اور بے علمی کے اندھیرے چھا جائیں گے۔ انگریزی لکھنا اور پڑھنا ایسے لوگوں کا طرزِ زندگی کا ایک جزو بن چکا ہے اور وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کبھی اس سے بے نیاز ہونے کے قابل بن سکیں گے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو "بین الاقوامیت پسند" تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

(۱) انگریزی بین الاقوامی زبان ہے اگر اسے ہم نے چھوڑ دیا تو دوسرے ممالک سے ناطہ کٹ جائے گا۔

(۲) پاکستان میں بہت سی علاقائی زبانیں اور بولیاں ہیں۔ انگریزی مشترک زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۳) انگریزی دفتری اور عدالتی زبان ہے۔

ان دلائل کو حقائق کی روشنی میں رد کیا جا سکتا ہے۔ اگر انگریزی واقعی بین الاقوامی زبان ہے۔ تو اسے ایک مضمون کی حیثیت سے رہنا چاہیئے۔ اس کی اس حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ بین الاقوامی زبان کی ضرورت ہر شخص کو نہیں ہوا کرتی اس لیے اسے ہر شخص پر مسلط کرنا اور امتحانات میں لازمی مضمون قرار دینا اشاعت علم اور تعلیمی سرگرمیوں کی راہ میں روڑا اٹکانا ہے۔ نیز یہ ضروری نہیں کہ اردو ذریعۂ تعلیم ہو تو انگریزی کو سرے سے ملک بدر کر دیا جائے گا۔ انگریزی کی تعلیم بھی جاری رہے۔ انگریزی کتابیں بھی استعمال کی جائیں لیکن ان مطالعات کا نچوڑ طلباء کے سامنے اردو میں پیش کیا جائے گا۔

انگریزی کو ملک کی ہمہ گیر زبان بنانا اور اسے قدرِ مشترک کا درجہ دینا جب کہ اسے سمجھنے والے ایک فیصد بھی نہ ہوں، مضحکہ خیز بات ہے۔ اس لحاظ سے اردو ایک

مشترکہ زبان کی حیثیت سے زیادہ مستحق ہے۔

انگریزی بلا شبہ دفتری اور سرکاری زبان ہے لیکن ایک غیر ملکی زبان کو سرکاری زبان بنائے رکھنا ملکی وقار کے منافی ہے۔ اگر تمام مدارج میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے تو ہر مشکل بھی خود بخود حل ہو جائے گی۔ اردو میں اس قدر غیر معمولی صلاحتیں موجود ہیں کہ یہ بخوبی دفتری زبان کی حیثیت سے استعمال ہو سکتی ہے۔ صرف انگریزی کو کام کی زبان اور فلاح کا ذریعہ سمجھنا ذہنی غلامی کی دلیل ہے۔

ہمارے محبان قوم کا ایک طبقہ جسے اپنی زبان سے ہمدردی ہے، یہ کہتا ہے کہ ملک میں تعلیم و تدریس کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اردو کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔ لیکن ان کے خیال میں ابھی اس میں سائنسی مضامین اور علوم کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔ جدید علوم پر کتابیں موجود نہیں۔ ایسے استاد موجود نہیں جو اپنی زبان میں پڑھا سکیں۔ غرض وہ وقت نہیں آیا کہ اپنی زبان میں تعلیم دینے کا مسئلہ اٹھایا جائے۔ ایسے لوگ تعلیمی مسائل اور تقاضوں سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ دلائل پیش کرتے ہیں۔ تمام ماہرین لسانیات تسلیم کرتے ہیں کہ اردو میں غیر معمولی صلاحتیں موجود ہیں۔ یہ غیر زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کو بلا تکلف اپنے اندر سما لیتی ہے اور اس طرح ہر زبان سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نیز باقی زبانوں کے مقابلے میں ہر پاکستانی اسے آسانی سے بول اور سمجھ سکتا ہے۔

اُردو کی تہی دامنی کا رونا رونے والے افراد یہ بھول جاتے ہیں کہ زبان پہلے ہی دن اعلےٰ درجے کی علمی یا سائنسی زبان نہیں بن جاتی۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے۔ اور اُردو یہ اعلیٰ منصب اسی وقت حاصل کر سکتی ہے۔ جب اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ انگریزی زبان نے بھی اپنا موجودہ مقام کئی صدیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے اردو میں سائنس کی تعلیم دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ جن قوموں نے سائنس کے میدان میں ترقی کی ہے کیا واقعی ان کی یہ ترقی انگریزی زبان کی

مرہون منت ہے؟ روس، جرمن اور جاپان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان سب ملکوں نے اپنی اپنی زبان میں سائنس کی تعلیم دی ہے۔ اور آج بھی جتنا سائنسی لٹریچر ان زبانوں میں تیار ہو رہا ہے۔ انگریزی میں شائع ہونے والے لٹریچر سے بہت زیادہ ہے۔ علوم کسی خاص خطہ یا زبان کی حدود میں مقید نہیں کیے جا سکتے۔ اگر سائنسی علوم روسی، جرمنی، جاپانی اور چینی زبان میں پڑھائے جا سکتے ہیں تو اردو میں کیوں نہیں پڑھائے جا سکتے؟

اس چیز کا دعویٰ تو کوئی زبان نہیں کر سکتی کہ اس میں تمام علوم کے سارے الفاظ اور اصطلاحات موجود ہوں۔ زندہ علوم بڑھتے رہتے ہیں۔ نئی نئی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ کامیاب وہی زبانیں ہیں جن میں نئے الفاظ بنانے اور غیر زبانوں سے اپنے مزاج کے الفاظ لینے کی اعلیٰ صلاحیت موجود ہو۔ اردو بفضل خدا اس شرط میں پوری اترتی ہے۔ اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں سب کچھ موجود ہے۔ البتہ اس میں تعلیمی، درسی اور دفتری ضروریات کی بیشتر اصلاحات موجود ہیں، جو نہیں ہیں وہ بنتی جا رہی ہیں۔ یہ کام جاری ہے اور جاری رہے گا۔

اردو میں تعلیم کوئی نئی بات نہیں۔ ۱۸۴۱ء سے اب تک اردو زبان کہیں نہ کہیں ذریعہ تعلیم رہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا منظم ادارہ جامعہ عثمانیہ تھا۔ جہاں اعلیٰ مدارج میں اردو ہی کے ذریعے تعلیم ہوتی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے ہر عنوان کی سینکڑوں مستند درسی کتابیں اردو میں ترجمہ اور تالیف کروائی تھیں۔ یہ ساری کتابیں موجود ہیں۔ جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اور مزید اضافے سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔

قومی زبان کو تمام مدارج میں ذریعہ تعلیم قرار دینے کی اشد ضرورت ہے۔ کراچی یونیورسٹی نے اس سلسلے میں پہل کی اور اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی نے بھی تمام امتحانات میں جوابات اردو زبان میں لکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ باقی

اداروں کو بھی ان کی تقلید کرنی چاہیئے۔ قومی زبان، قومی وقار کی محافظ ہوا کرتی ہے تعلیمی کمیشن نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ قومی زبان ذریعہ تعلیم کیوں بنائی جائے۔

(۱) قومی زبان احساس قومیت کو ابھارنے کی ایک بڑی قوت ہے۔ لوگوں میں یکجا پیدا کرنے اور ان کو آپس میں متحد رکھنے کا یہ بنیادی جزو ہے۔ اس سے قومی سربلندی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

(۲) عوام و خواص کے درمیان ایک ہی زبان کا باہمی استعمال طبقاتی امتیازات کو مٹاتا ہے۔

(۳) غیر ملکی زبان میں طلبہ پر محنت بار پڑتا ہے۔ وہ سبق رٹنے اور بدیسی زبان سیکھنے ہی میں اپنا سارا وقت گنوا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب قومی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے تو طلبہ کا وقت علم حاصل کرنے اور ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دینے میں صرف ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی ذہنی اور قلمی صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں اور ان کے تصورات، ان کے حوصلے اور ان کے تخلیقی افکار پروان چڑھتے ہیں۔

(۴) اعلیٰ تعلیمی سطح پر قومی زبان کی ترقی اور استعمال کے ساتھ ساتھ مختلف فنون میں جو ادب پیدا ہوتا ہے وہ ایک عامی کے لیے قابل فہم ہوتا ہے۔ جس سے زراعت، صنعت اور تجارت کی ترقی میں بڑی مدد ملتی ہے۔

قومی زبان کا ذریعہ تعلیم ہونے کے جواز میں اس سے زیادہ مدلل بیان کیا ہو سکتا ہے۔

اس سے کوئی حقیقت پسند انسان انکار نہیں کر سکتا کہ انگریزی کے مقابلے میں اُردو پسماندہ زبان ہے لیکن اس کی پسماندگی دور کرنے میں اسی وقت کامیابی ہو سکتی ہے جب اردو کو یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم قرار دینے اور اسے سرکاری اور کاروباری زبان بنانے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔ اس کے بغیر اردو سے ترقی یافتہ

اور جدید زبان بننے کا مطالبہ بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی شخص سے تیراکی میں مہارت پیدا کرنے کا مطالبہ کیا جائے لیکن اسے پانی کے قریب جانے کی اجازت نہ ہو۔

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

میرے ہمسائے

کسی شخص کی بدقسمتی کا اندازہ اس کے ہمسایوں کی تعداد سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً جس شخص کا کوئی ہمسایہ نہیں اس کا شمار ہم دنیا کے چند ایک خوش قسمت انسانوں میں کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر اگر کسی شخص کے چار پانچ ہمسائے ہیں تو اس شخص کی بد قسمتی کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ ہی کوئی علاج اور ہمیں کچھ تعجب نہ ہوگا اگر وہ شخص شیکسپیئر کے مشہور کردار ہیملٹ کی طرح دن رات یہی سوچتا رہتا ہو "زندگی اچھی ہے یا خودکشی، خودکشی اچھی ہے یا زندگی۔"

قیاس اغلب ہے کہ ان اشخاص میں اردو کے جلیل القدر شاعر مرزا غالب بھی شامل تھے کیونکہ ایک جگہ اپنے ہمسایوں سے تنگ آکر فرماتے ہیں۔ ع

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ذرا خیال فرمایئے مرزا علی الصبح اٹھے ہیں اور اپنے ہمسائے سے کہتے ہیں "سنیے گا مطلع عرض ہے" اور کوڑھ مغز کہتا ہے۔ "ہاں مرزا! مطلع کے متعلق آپ کیا کہہ رہے تھے۔ مطلع تو بالکل صاف ہے۔" یا مرزا فرماتے۔ دیکھیے کل رات کیا اچھا شعر موزوں ہوا۔

سہ
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا !

اور شعر و شاعری سے بے بہرہ ہمسایہ فرماتا ہے، "ہاں مرزا! روزگار کا بہت برا حال ہے۔ تین دن سے دکان پر ایک گاہک نہیں پھڑکا۔"

اب فرمایئے مرزا سر پیٹ کر کیوں نہ فرمائیں کہ

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

مگر اسی پر بس نہیں۔ مرزا ہمسایوں سے اتنے تنگ ہیں کہ فرماتے ہیں۔ ع

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

بہت خوب! کیوں کہ اگر گھر کے در و دیوار ہوئے تو ہمسایہ بھی ضرور ہوگا۔ اس لیے بے در و دیوار سا گھر بنانے سے ہی اس کم بخت سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

اب مرزا تو ٹھہرے شاعر۔ جن کے لیے جیسی بستی ویسا ویرانہ، مگر ہم اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا حاصل کریں کہ جن کو ساری عمر بستی میں گزر کرنا ہے اور جن کے ایک چھوڑ پانچ ہمسائے ہیں۔

آپ ہمارے پہلے ہمسایہ سے متعارف ہوجیے۔ یہ صاحب کسی نام نہاد بیمہ کمپنی میں کلرک ہیں۔ مگر آپ کے اقوال اور افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ کلرکی تو صرف ان کا شغل ہے ورنہ پیشے کے لحاظ سے طبیب واقع ہوئے ہیں۔

آنجناب کی حالت یہ ہے کہ امیر مینائی کی طرح "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔" فرق اتنا ہے کہ امیر مینائی تو کسی کے کانٹا چبھنے پر تڑپتے تھے، یہ صاحب بغیر کسی ایسی خلش کے تڑپا کرتے ہیں اور وقت بے وقت تندرست اور بیمار شخص کے لیے نسخے تجویز کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً آپ کو کھانسی ہے، ذرا خیال رکھیے کہیں وجع الصدر نہ ہو جائے۔ آج ہی شربت بنفشہ خرید لیجیے اور کم از کم دو ہفتے پیجیے۔

آپ کی آنکھیں ظاہر کرتی ہیں کہ آپ کو قبض ہے۔ علی الصبح ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا کریں۔ آپ روز بروز دبلے ہو رہے ہیں کہیں رات کو پسینہ تو نہیں آتا ہے ان کا مقولہ ہے کہ تندرستی کا انحصار تین باتوں پر ہے۔

(۱) صبح چار بجے اٹھ کر سیر کرنا۔

(۲) سرسوں کے تیل کی مالش کرنا۔

(۳) انگریزی برش کی بجائے مسواک کرنا۔

سیر کے متعلق ان کا اعتقاد ہے کہ یہ کم از کم دس امراض کا واحد علاج ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک چارٹ تیار کیا ہے جس کی ایک کاپی اپنے ہر ایک ہمسائے کو مفت مہیا کرتے ہیں۔ اس چارٹ میں لکھتے ہیں:۔

بدہضمی کی دوا!	لارنس باغ کے پانچ چکر
سردرد کی دوا!	لارنس باغ کے چار چکر
پیٹ درد کی دوا	لارنس باغ کے دو چکر

آپ سیر کے اتنے شوقین ہیں کہ یہ شوق مرض کی انتہا تک جا پہنچا ہے۔ سردی ہو یا برسات، آندھی ہو یا طوفان، جون ہو یا دسمبر، یہ سیر کرنے ضرور جائیں گے اور کم از کم دو تین ہمسایوں کو اپنے ساتھ لے جانے پر مصر ہوں گے۔

سرسوں کے تیل کی مالش ان کا دوسرا مجرب نسخہ ہے اور جو شخص اس تیل کی مالش نہیں کرتا وہ ان کے نزدیک گردن زدنی اور کشتنی ہے۔ یہی بات مسواک کے متعلق ہے جو شخص انگریزی برش استعمال کرتا ہے وہ اپنے دانتوں پر کلہاڑی چلاتا ہے۔

الغرض ہمارے یہ ہمسائے جو ہر درد کا درماں جانتے ہیں، اور بلا فیس بتاتے ہیں خود بلائے بے درماں ہیں، جن سے سوائے نقل مکان اور موت کے رہائی حاصل کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ قفس یا جیل خانے سے بچ نکلنا۔

ہمارے دوسرے ہمسائے شکل اور لباس کے اعتبار سے انسان ہیں لیکن،

اگر ان کو انسان نما ریڈیو کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا، کیوں کہ ریڈیو کی طرح یہ بزرگ صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک کچھ نہ کچھ فرماتے رہتے ہیں۔ سیاست فلمیں، مسلم لیگ، کانگرس، ہوائی حملے، قحط، بھونچال، بھوک، بیکاری، مردم شماری ان کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ سیاست میں اکثر ہندوستانی اور انگریزی سیاستدانوں کی غلطیوں اور گناہوں کی فہرست تیار کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ فلاں کی غلطی ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ فلاں کی بھی ہے۔ دراصل یہ سب کی غلطی ہے نہیں، اس کو غلطی کہنا ہی غلطی ہے، یہ جرم ہے۔

سیاست کے بعد ان کی دوسری دلچسپی کی چیز فلم ہے۔ فلموں کے متعلق کچھ اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں، فلاں ایکٹرس فلاں کمپنی کو چھوڑ کر فلاں کمپنی میں شامل ہوگیا ہے اب اس ایکٹر کا کیا بنے گا۔ اب اس کمپنی کا کیا بنے گا۔ فلاں ایکٹرس فلاں ایکٹر کے ساتھ چلی گئی ہے۔ خدا جانے دونوں کہاں چلے گئے ہیں۔ اب اس ایکٹر کو جانتے ہیں۔ کیوں نہیں جانتے؟ آپ کا اس فلم کے متعلق کیا خیال ہے؟ آپ نے یہ فلم کیوں نہیں دیکھی؟ آپ ہر ایک فلم کیوں نہیں دیکھتے؟

ہمارے تیسرے کرم فرما کسی اسکول میں مدرس ہیں۔ آپ کا تکیہ کلام ہے۔ "میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کے پاس یہ چیز ہے" چنانچہ آپ بجائے بازار، ڈاکخانہ یا ہسپتال جانے کے وقتاً فوقتاً ہمارے پاس تشریف لاتے ہیں اور "میں کہتا ہوں آپ کے پاس ایک گولی کونین کی ہے؟ ایک آنے کا ٹکٹ ہے؟ پرسوں کا اخبار ہے؟ پچھلے سال کا کیلنڈر ہے؟ اس سال کی جنتری ہے؟ پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ ہے؟ اقبال کے اشعار کا انتخاب ہے؟ وغیرہ وغیرہ" سوالوں سے ہمارا ناک میں دم کیے کرتے ہیں۔ ایک دن نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگے "آپ کے پاس "ادب لطیف" کا سالنامہ ہے" میں نے کہا کیوں، اس کی کیا ضرورت پیش آئی؟ "ویسے ہی کچھ

نہیں۔ اس میں سے ملکس کا اشتہار پڑھنا ہے۔"

ہمارے چوتھے ہمسائے ان اشخاص میں سے ہیں جن کو لیڈر کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ان کو ہر وقت قوم کا۔۔ غم کھائے جاتا ہے اور اس غم میں وہ اس طرح روتے ہیں گویا اس شاعر کے مصرع کی ترجمانی کر رہے ہیں، جس نے کہا تھا۔

"ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں"

وہ جس وقت ہمارے پاس آتے ہیں، قوم کی لاش پر آنسو بہاتے آتے ہیں اور اس قوم کا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ انگریزی مزدور کی روزانہ آمدنی تین روپے ہو، امریکن، مزدور کی ساڑھے چار روپے، آسٹریلین کی پانچ روپے اور ہمارے مزدور کی آمدنی صرف چھ پیسے یومیہ ہے۔" ملکی صنعتوں کی ترقی کے خواہاں ہیں مگر گھڑی سوئٹزرلینڈ کی اور سگرٹ انگلینڈ کا خریدتے ہیں۔ لکھنے کا قلم امریکہ کا تیل اور کریم فرانس کے اور کھانڈ جاوا کی استعمال کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے ایک اور ہمسائے ہیں جو ہر وقت مہیب اور خطرناک الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ مثلاً زلزلہ آئے گا، ایک زبردست طوفان اٹھے گا، بجلیاں کڑکیں گی، خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی۔ اپنی ہر تحریر کا آغاز ماسکو سے کرتے ہیں وہ ماسکو میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ ماسکو میں اگر کوئی یہ بات کرے تو اسے فوراً گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔ ماسکو میں اگر کوئی شخص بازار میں کیلے کا چھلکا پھینک دے تو اسے دو سال قید بامشقت کی سزا ہو جائے۔" آپ ہر وقت دنیا کے نظام کو بدلنے کی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں۔ ہر وقت ملک کی خاطر سختیاں جھیلنے کو تیار رہ۔ جرأت کا یہ حال ہے کہ جس دن شہر میں گرفتاریاں یا خانہ تلاشیاں شروع ہو جائیں آپ خوفزدہ کبوتر کی طرح سہمے سہمے پھرتے ہیں۔ رک رک کر بات کرتے ہیں۔ ترچھا قد ہے اور منہ پر ہر وقت کسی نامعلوم خطرے کے زیر اثر ہوائیاں اڑتی رہتی ہیں۔ چہرے پر فاقہ مستی اس طرح لکھی ہے کہ پہلی ملاقات میں سب سے پہلے

یہ چیز نظر آتی ہے۔ اکثر جوش ملیح آبادی کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسلی دیا کرتے ہیں۔ اگرچہ آپ میں شباب کے آثار تک غائب ہیں اور آپ تعمیر کے معنی سے قطعاً ناواقف ہیں، لیکن ہر صبح نہایت جوش سے اپنی بھاری آواز میں گایا کرتے ہیں۔ ع

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب

آپ کا نیک ارادہ دنیا بھر کے خاک رد بوں کو منظم کرنا ہے۔ اس کے بعد دھوبیوں کی انجمن، نائیوں کی انجمن، بیکاروں کی انجمن، بہشتیوں کی انجمن، ہرکاروں کی انجمن، شامت کے ماروں کی انجمن وغیرہ وغیرہ قائم کریں گے۔ آپ کا خیال ہے کہ آپ غلطی سے اس ملک میں پیدا ہوئے ہیں جہاں آپ کی لیاقت کی بہت کم قدر کی گئی۔ اس لیے بارہا مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ اگر میں ماسکو میں پیدا ہوتا۔ . . .

(کنہیا لال کپور)

قومی اتحاد

(فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں)

قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے جو کسی ایک ملک کے باشندے ہوں اور ایک ملت سے وابستہ ہوں۔ جس علاقے کے رہنے والے لوگ ہوں اسی لحاظ سے ان کی قومیت متعین ہوگی۔ یہ قوم کا مغربی تصور ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک دنیا کے تمام مسلمان ایک ہی ملت سے وابستہ ہیں۔ اس لیے عالم اسلام کے تمام مسلمان ایک ہی ملت سے وابستہ ہیں قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ محدود معنوں میں قومی اتحاد سے مراد پاکستانی قوم کا اتحاد مراد لیا جا سکتا ہے۔

اس کارخانۂ سود و زیاں میں ہر چیز اتحاد سے قائم اور برقرار ہے۔ اسی

اتحاد و اتفاق کی وجہ سے کمزور چیزوں میں بھی بے پناہ قوت آجاتی ہے۔ پانی کا قطرہ اپنی انفرادی حیثیت سے بالکل غیر اہم شے ہے۔ مگر جب یہی قطرہ سمندر کی طوفانی موجوں کا حصّہ بنتا ہے تو لاکھوں من وزنی جہاز اس کے تھپیڑوں سے پناہ مانگتے ہیں اور چٹانیں اس کے سامنے سر بخم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح خاکی ذرات کی مثال لیجیے بظاہر ایک ذرہ کتنا حقیر اور بے بس ہے مگر یہی ذرہ کسی آندھی کا جزو بنتا ہے تو کس طرح قیامت برپا کر دیا ہے۔ یہی ذرات ایٹم بم کا باعث بنتے ہیں۔ انسان کا قوم کے ساتھ وہی تعلق ہے جو قطرے کا دریا کے ساتھ ہوتا ہے۔ ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

علامہ اقبال نے فرد اور ملت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب کوئی فرد کسی منظم انسانی گروہ کے ساتھ ایک جزو کی حیثیت سے زندگی گزارتا ہے تو اس کا وجود دنیا کو محسوس ہوتا ہے، لیکن جس وقت وہ اپنے تعلقات قوم سے منقطع کر لیتا ہے اور محض انفرادی حیثیت سے زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا وجود کوئی قوت نہیں رکھتا ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اسی فلسفہ کو علامہ اقبال نے ایک اور جگہ یوں واضح کیا ہے۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

یعنی اگر شجر سے کوئی شاخ ٹوٹ جائے تو پھر وہ بہار میں بھی سرسبز نہیں ہو سکتی۔ فرد بھی اگر قوم سے رشتہ منقطع کر لے تو اس کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اس لیے فرد کو ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنا چاہیئے۔ خدا کا حکم ہے کہ "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور الگ الگ نہ ہو جاؤ۔" اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ کوئی شخص کامیابی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنے ساتھیوں یا بالفاظ دیگر قوم یا ملت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کام نہ کرے

قومی اتحاد وہ قیمتی چیز ہے جس کی بناء پر قومیں آزادی حاصل کرتی ہیں، جنگوں میں فتح سے ہم کنار ہوتی ہیں اور بڑے سے بڑے مشکل مسائل پر قابو پا لیتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اتحاد نے قوموں کو تحت الثریٰ سے نکال کر اوج ثریا پر پہنچا دیا۔ خود پاکستان کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اگر مسلمان متحد ہو کر مسلم لیگ کے مطالبے کی حمایت نہ کرتے تو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان معرض وجود میں نہ آتی۔

جب تک قومی اتحاد پیدا نہ ہو کوئی جدوجہد کامیاب نہیں ہوتی اور جہاں باہم ناچاقی اور نااتفاقی نے جنم لیا، قوم تباہی کے گڑھے میں جا پڑی۔ ہمایوں نے محض اپنے بھائیوں کی نااتفاقی سے شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھائی۔ فرانسیسیوں نے محض اپنے حکمران طبقے کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے صرف پندرہ دن میں جرمن قوم کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ اس کے برخلاف قومی اتحاد کی بدولت قوموں نے ترقی کی ہے۔ اتاترک نے قوم کو جب ایک مرکز پر لا کھڑا کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے یورپ کا مرد بیمار، ایک تندرست و توانا آدمی بن گیا۔

ہم جس مذہب کے پیرو ہیں اس کی پاکیزہ تعلیم اپنے اندر اتحاد و مساوات اور ربط باہمی کے ایسے پہلو لیے ہوئے ہے جس پر عمل کرنے سے قومیں سرفراز ہوتی ہیں۔ اسلام کا ہر رکن اتفاق کی تعلیم دیتا ہے۔ نماز با جماعت اتفاق کا ایک مظاہرہ ہے۔ ہم پاکستانیوں کے لیے اتحاد باہمی کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارا ملک اس وقت تک مضبوط و مستحکم نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنے اختلافات کو مٹا کر ایک نہ ہو جائیں۔ جب ہم ایک ہو جائیں گے تو کوئی مخالف طاقت ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ ہندوستان نے پاکستان پر ایک جارحانہ حملہ کیا ہے مگر منہ کی کھائی ہے۔ پوری قوم نے جس ربط باہمی اور اتحاد کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ پوری قوم ایک فرد واحد کی طرح ایک مرکز پر آ گئی اور سامراجی قوتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جو قومیں متحد نہیں رہتیں حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ قدرت بھی ان کی مدد نہیں کرتی۔ افراد کا اختلاف قومی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ موجودہ سیاسی بحران کے زمانے میں قومی اتحاد کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام عالم اسلام ایک مرکز پر جمع ہو اور اسلام کو بلند و بالا کرے۔ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

کالج میں پہلا دن

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اسی امید و بیم میں وقت گزرا کہ دیکھیں پاس ہوتے ہیں یا فیل۔ اُف! کالج کا تصور ہی کتنا پر لطف تھا۔ سنا ہوا تھا کہ کالج کی زندگی بڑی رنگین ہوتی ہے۔ استانی صاحبہ کی مار کا ڈر نہیں، علاوہ ازیں

آئے دن جلسے، ڈرامے، کھیلیں اور مختلف تقریبوں کا ذکر سن سن کر بے اختیار دل چاہتا تھا کہ کاش ہم بھی کالج میں ہوتے اور وہ لمحہ قریب ہی تھا جب ہماری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ بار بار یہ خیال بھی آتا تھا۔ خدانخواستہ اگر فیل ہو گئے تو۔ اور اس تصور سے کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ اتنے میں بھیا اخبار لیے ہوئے آتے نظر آئے نہیں وہ لمحہ کبھی بھول نہیں سکتا جب اخبار لرزتے ہوئے ہاتھوں میں تھا اور ہماری متجسس نگاہیں اخبار میں اپنا رول نمبر تلاش کر رہی تھیں ،اُف سیکنڈ ڈویژن!، ہماری چیخ نکل گئی۔

"تم سیکنڈ ڈویژن میں؟ خوب کسی کی نقل اڑائی ہوگی، ورنہ تم تو کبھی پاس بھی نہ ہو سکتی تھیں۔" باجی نے چھیڑا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو اس کے بال ہمارے ہاتھ میں ہوتے۔ لیکن اس وقت خوشی میں ہم بھی نظر انداز کر گئے۔ ہر طرف مبارک بادکی صدائیں بلند ہو رہی تھیں امی جان، دادی جان، خالہ خان، تمام رشتے دار بلائیں لے رہے تھے اور ہم سب کے جھرمٹ میں اس طرح بیٹھے تھے جیسے اندر راجہ پریوں کے جھرمٹ میں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ہمیں کالج میں داخل کرا دیا جائے۔ تاکہ گھر میں کم از کم ایک تو ڈاکٹر بن سکے ساری رات نیند نہ آئی۔ صبح ہوئی تو داخلہ لینے خود ہی کالج چل پڑے۔ یاسمین سے کہا کہ اکٹھے چلیں گے مگر وہ پہلے روانہ ہو گئی۔ بس کالج کے گیٹ پر رکی اور ہم بڑے ٹھاٹھ سے کالج میں گھس گئے۔ خاصی چہل پہل نظر آئی۔ داخل ہوئے تو پاس ہی چند شیطان کی خالائیں نظر آئیں۔ دل میں بہت ڈرے کہ کہیں فرسٹ ایر فول ہی نہ بنا دیں لیکن اپنے آپ پر اعتماد بھی تھا کہ ان سے ہم بے وقوف کیوں بننے لگے۔ خیر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ انہوں نے کچھ نہیں کہا اور ہم جان بچی سو لاکھوں پائے کا ورد کرتے ہوئے آگے چل پڑے۔

ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی جان پہچان کی لڑکی دکھائی نہ دی۔ آخر

سیدہ نظر آئی، سوچا چلو ایک تو واقف مل گئی، دور سے آواز دی۔

اوہ سیدہ کی بچی! ادھر تو آؤ۔

جب وہ نزدیک آئی تو حلیہ بگڑا ہوا پایا۔ بیچاری کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھی اس نے بتایا کہ چند لڑکیوں نے اسے حوض میں گرادیا تھا۔ اُسے تسلی دی اور ایک سہیلی کا فرض ادا کرتے ہوئے دو تین کوسنے ان لڑکیوں کو دے ڈالے۔

اتنے میں ایک اور لڑکی آتی دکھائی دی، پیچھے کچھ اور لڑکیاں تھیں۔ بیچاری کی پشت پر "فرسٹ ایپریل فول" کا لیبل لگا دیا گیا تھا۔ ہمیں بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئی۔

اتنے میں دیکھا کہ چند لڑکیاں میری طرف آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہم وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔ سوچ رہی تھی کہ اب جائیں تو کہاں جائیں۔ نہ جانے دفتر کہاں ہے۔ پرنسپل صاحبہ کہاں تشریف فرما ہیں اور کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اتنے میں باغیچے میں ایک لڑکی نظر آئی جو کہ سب سے الگ تھلگ مطالعہ میں مصروف تھی اور بڑی بھولی بھالی سی لگتی تھی۔ ہم نے سوچا ایک تو خدا کی بندی دکھائی دی۔ اس کے قریب گئے اور دفتر کا پتہ پوچھا۔ اس نے نہایت خوش اخلاقی سے بتایا کہ سیدھے چلے جائیں پھر بائیں طرف مڑیں۔ سیڑھیوں کے سامنے دفتر ہے۔ سوچا ٹھیک کہتی ہے۔ چنانچہ اس کا شکریہ ادا کیا اور ان کی ہدایت کے مطابق سیدھے چلے گئے۔ پھر بائیں طرف مڑے، پھر سیڑھیوں کے سامنے نظر ڈالی تو "بیت الخلا" کا بورڈ ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ ہمیں سخت غصہ آیا۔ اتنے میں پیچھے سے آواز آئی "کیوں جی دفتر مل گیا؟" اور ساتھ ہی ایک قہقہہ بلند ہوا مڑ کر دیکھا، تو وہی محترمہ ہنس رہی تھیں۔ غصے میں جی بھر کوسنے دیے۔ پہلے تو وہ خاموشی سے سنتی رہیں پھر وہ بھی ذرا گرم ہو گئیں اور جوابی حملہ شروع کر دیا۔ اس کی سہیلیاں بھی پہنچ گئیں۔ میدان کارزار گرم ہو چکا تھا۔ ہاتھا پائی شروع

ہوگئی اور بہت سی لڑکیاں ارد گرد جمع ہوگئیں۔

"اتنے میں ایک دبلی پتلی صاحبہ جو دیکھنے میں کالج کی طالبہ دکھائی دیتی تھیں۔ نزدیک آئیں اور ہمیں سختی سے منع کیا۔ وہ لڑکی تو فوراً الگ ہوکر خاموش ہوگئی۔ لیکن ہماری زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔ چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں اور کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ ان نئی آنے والی صاحبہ نے مجھے سختی سے منع کیا اور جب میں باز نہ آئی تو کہنے لگیں تمہیں شرم نہیں آتی کالج میں داخل ہونا ہے تو پہلے تمیز سیکھیں۔ نہ جانے ایسی جاہل لڑکیاں داخلہ لینے کیوں چلی آتی ہیں۔

اب آپ خود ہی سوچیں، ایسے سخت الفاظ ہم کب برداشت کر سکتے تھے۔ دو تین کوسنے انہیں بھی دیے اور ایسا دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچیں۔ وہ غصہ سے آگ بگولا ہوگئیں اور ہمیں بدتمیز اور بے شرم جیسے خطابات دے کر غصے میں بڑبڑاتی ہوئی چل دیں۔ تمام لڑکیاں دوپٹہ میں منہ چھپائے ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور کچھ غصے میں ہمیں گھور رہی تھیں۔

اتنے میں ایک ملازم نے آکر ہمیں کہا کہ پرنسپل صاحبہ دفتر میں بلا رہی ہیں۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ داخلہ ملنے لگا ہے۔ بڑے فخر سے ان لڑکیوں پر فاتحانہ نگاہ ڈالتے ہوئے دفتر پہنچے تو وہی محترمہ سامنے کھڑی تھیں۔ چہرہ غصے سے سُرخ تھا اور ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ پرنسپل صاحبہ نے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور کہا، "اری تجھے شرم نہیں آتی اس طرح ادھم مچا دیا ہے۔ تمہیں کسی سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں۔ ہم ایسی لڑکیوں کو داخلہ نہیں دے سکتے۔"

"جی نہیں، میں نے کیا کیا ہے؟ یہ مجھے صبح سے پریشان کر رہی ہیں۔"

"ان کے ساتھ تم کیوں بدتمیزی کر رہی ہو؟" پرنسپل صاحبہ نے دریافت کیا۔ ہم نے شروع سے لے کر آخر تک تمام قصہ کہہ سنایا اور اس لڑکی کے علاوہ ان محترمہ کو بھی برا بھلا کہا اور اپنے آپ کو بالکل معصوم ثابت کیا۔

"خاموش رہو بدتمیز لڑکی!" پرنسپل ایک مرتبہ گرجیں۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کون ہیں؟"

بھلا ہمیں کیا معلوم وہ کون تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ہماری پروفیسر مس ملکہ ہیں۔ اب تو ہماری نظر میں زمین و آسمان گھومتے نظر آتے تھے۔ جھٹ ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگی اور منت سماجت کرنے لگے۔ وہ بھی نیک دل تھیں۔ ہمیں معاف کر دیا اور ہمارے داخلے کے لیے بھی سفارش کر دی۔ نیز یہ نصیحت بھی کر دی کہ بڑوں کا حکم ماننا چاہیے اور ہر ایک کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا چاہیے" ۔ پرنسپل صاحبہ نے بھی تنبیہ کرنے کے بعد معاف کر دیا اور ہم فرسٹ ایر میں داخل ہو گئے۔

اب جب کبھی وہ پروفیسر صاحبہ ملتی ہیں وہی ہاتھ جو ان کو مارنے کے لیے اٹھا تھا، اب سلام کے لیے ان کے آگے جھک جاتا ہے اور ندامت محسوس ہوتی ہے وہ بھی مسکرا کر رہ جاتی ہیں۔

محبوب راہنما ـــــ قائدِ اعظمؒ

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

جن دنوں سر سید احمد خاں مسلمانوں کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کوشاں تھے اس زمانے (۱۸۷۶ء) میں کراچی کے ایک گمنام تاجر کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کراچی کے خاموش ساحل اور اداس فضا

قائدِ اعظم محمد علی جناح ۔ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء والد کا نام پونجا جناح

کا بیرلین انگلستان روانہ ہو گیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ نوجوان جو آج اپنا مستقبل سنوارنے انگلستان جا رہا ہے واپس آکر اپنی قوم کا مستقبل سنوارے گا اور سر سید اور اقبال کے بعد مسلمانوں کی ڈگمگاتی کشتی کا ناخدا بن جائے گا۔

اس نوجوان مسلم وکیل نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور مسلمانوں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس ہندو مسلم کشیدگی کے دور میں اتحاد پر زور دیا جب کانگرس اتحاد کے ہامبر کی حیثیت سے ناکام ہو گئی تھی تو اقوام عالم نے دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت ابھرتی دیکھی جو سب سے بڑی اسلامی حکومت تھی۔

۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس میں مسلمانوں کے لیے ایک خاص منزل کا تعین کر دیا تھا اور ایک علیحدہ مملکت کا خاکہ پیش کر دیا، مگر اس میں رنگ بھرنے اور اسے حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے کسی خاص شخصیت کی ضرورت تھی اور قدرت نے اس عظیم کام کی ذمہ داری اسی پتلے دبلے نوجوان پر ڈال دی جو ہندو مسلم اتحاد کا نقیب تھا اور اس وقت محمد علی جناح کے نام سے مشہور تھا۔

آپ نے مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی اور ضلعی اور تحصیلی لیگوں کے ذریعے مسلمانوں میں اس کی اہمیت کا خیال پیدا کرنا شروع کیا۔ مسلمانان ہند میں مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت دیکھ کر کانگرس حسد کی آگ میں جلنے لگی۔ کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں، ایک کانگرس اور دوسری حکومت۔ قائداعظم نے اس کی جواب میں فرمایا کہ ہندوستان میں ایک تیسری پارٹی مسلم لیگ بھی ہے جو ہندی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ وہ اپنے قول کو ثابت کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس قائداعظم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جن مسلمان رہنماؤں نے ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدواروں کو شکست دی تھی وہ بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے لاہور کے منٹو پارک میں (مینار پاکستان والی جگہ پر) ایک لاکھ فرزندان توحید کے زبردست اجتماع میں قرارداد پاکستان منظور کی۔ ہمارے محبوب قائداعظم نے ایک آزاد اور خودمختار ملک کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اس قرارداد کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ عوام میں مقبول ہوتی گئی۔ مسلمان طلبہ قریہ بہ قریہ لیگ اور پاکستان کی آوازے کر پہنچ گئے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی مسلمان ہندو غلبہ سے آزاد ہونے اور ایک آزاد وطن حاصل کرنے کے کتنے آرزومند ہیں۔ ہندوؤں نے سخت مخالفت کی لیکن قائداعظم کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کے نحیف جسم میں ایک طوفانی روح چھپی ہوئی تھی اور ان کا عزم کہسار سے زیادہ پائندہ و محکم تھا۔

آخر قائداعظم کی ان تھک کوششوں کے سبب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت اور پانچواں بڑا ملک پاکستان نمودار ہوا۔ ہمارے بوڑھے قائد کو جو کام کی زیادتی کی وجہ سے پہلے ہی تھک چکے تھے اب گوناگوں مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندو مسلم فسادات، نقل مکانی اور آبادکاری وغیرہ ایسے مسائل تھے جن کے ہوتے ہوئے پاکستان کی سلامتی خطرے میں تھی۔ قائداعظم نے اس نحیف پودے کی آبیاری اپنے مقدس خون سے کی اور جس عزم، حوصلہ اور بلند ہمتی سے اس قوم کو سنبھالا اس نے ان کو ہیرو بنا دیا۔ اس خطرناک دور میں قوم نے ان کی ہر اپیل پر لبیک کہا۔ اس طرح قائداعظم ایک مشعل بردار کی حیثیت سے رہنمائی کرتے رہے اور جب بھی کوئی فیصلہ کیا اپنے لوگوں کے دل کی دھڑکن اور روح کی آواز کو سامنے رکھا اور پھر اس پر چٹان کی طرح مضبوطی سے ڈٹ گئے۔

تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ جو اقوام دنیا میں نام پیدا کر گئیں ان کو مثالی قیادت حاصل تھی اور جو قومیں آج صفحۂ ہستی سے مٹ گئی ہیں، اس کی ساری ذمہ داری نااہل اور خودغرض قیادت پر رہی۔ جس قوم کو ایسی قیادت

لائی جو اپنی قوم کی دل کی دھڑکنوں کو نہ صرف سمجھ سکی بلکہ اس کو عملی قوت بھی دے سکی وہ قوم زندہ باد ید ہوگئی۔ قدرت ایسے باکمال لوگ صد ہا سال بعد پیدا کرتی ہے۔ جن میں بہادری، جرأت اور شجاعت موجود ہو، جو گفتار اور کردار کے غازی ہوں، جن کے عمل میں قوت ایمانی ہو اور جن کا خلوص لازوال ہو، جن کی آواز پر ساری قوم مرنے مارنے پر تیار رہے، جن کی پوری زندگی انگشت نمائی سے محفوظ رہے، جن کی شخصیت اتنی پرکشش ہو کہ دشمن بھی سامنے آئے تو زبان سے نکلا ہوا لفظ قوم کی تقدیر بن جائے۔ قائد اعظم ایسے ہی چند عظیم انسانوں میں سے ایک تھے۔ وہ نہ صرف پاک و ہند بلکہ تمام عالم اسلام کی ایک عظیم المرتبت شخصیت تھے۔ ایسی شخصیت جس نے غلاموں کے جسموں میں آزادی کی روح پھونکی، جس نے ایک مایوس، شکست خوردہ، غلام اور پست ہمت قوم کو اس قابل بنایا کہ وہ ایک انگڑائی لے کر اٹھے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر ایک باعزت آزاد زندگی بسر کر سکے۔

انہوں نے مسلمانوں کے خیالات بدلے، ان کی ذہنیت بدلی اور دماغوں کو ایک نئی روشنی عطا کی۔ انہوں نے اپنی قابلیت، ریاست اور بے پناہ خلوص سے برصغیر پاک و ہند کی سیاست کا رخ پلٹ کر رکھ دیا۔ انہوں نے عزم و استقلال، ہمت اور جوانمردی، قربانی اور ایثار سے بساط عالم پر ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی جس کا کسی کو وہم و گمان تک نہ تھا۔ قائد اعظم کو انہی خوبیوں کی وجہ سے وہ ہر دلعزیزی نصیب ہوئی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ قائد اعظم نے اپنی بلند ہمتی اور مسلسل جدوجہد سے نہ صرف مسلمانوں کو ایک حکومت، سلطنت، فوج، مال و دولت اور خطۂ زمین لے کر دیا بلکہ ایک غیر متزلزل عزم، اٹل ارادہ اور ناقابل تسخیر ہمت دی جس کے بل بوتے پر برصغیر کے مسلمان آج ایک آزاد اور خود مختار قوم ہیں اور اقوام عالم میں عزت و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اسلامیان پاک و ہند کا یہ رہبر فرزانہ، ارض مشرق کا عظیم المرتبت انسان

دس کروڑ مسلمانوں کی تقدیریں بدلنے والا مردِ مومن ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا، لیکن ان کا نقشِ قدم اب بھی ہمیں عمل پیہم کی دعوت دے رہا ہے کہ ہم ان کے سنہری الفاظ "اتحاد، تنظیم، ایمان" کو ذہن میں رکھیں اور ان کی متعین کردہ راہوں پر چل کر پاکستان کو ایک عظیم تر مملکت بنا دیں۔

قائدِ اعظم علامہ اقبال کے اس شعر کی ہو بہو تصویر تھے ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

برسات کی بہاریں

مئی اور جون کی گرمی خدا کی پناہ! کیا حیوان، کیا انسان، سب تکلیف میں ہیں زمین اور آسمان تپتے ہوئے لوہے کی مانند ہیں۔ سبزہ و گل پر زردی چھا گئی۔ نازک بدن یاسمین سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ نہ پودوں پر ہریالی نہ پرندوں کی چہچہاہٹ۔ نونہالانِ چمن کے پھول سے چہرے مرجھا گئے۔ سورج جلے دل سے بخار نکال رہا ہے۔ ہوا بند ہے۔ دم گھٹ گیا۔ بدن پھنک گیا۔ لوگ دھوپ اور لو سے بلبلا اٹھے۔ حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارانِ کرم کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دریائے رحمت جوش میں آیا۔ ابھی تیز دھوپ تھی اور اب خنکی ہونے لگی۔ بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑے نمودار ہوئے۔ کسی ایک گوشے سے سیاہ بدلی اٹھی اور پسینے میں بھیگے جسموں کو ہوا کا ایک نمناک جھونکا چھوتا ہوا گزر گیا۔

آہاہا! کیا کالی گھٹا چھائی ہے۔ بادل کس طرح جھومتا ہوا جا رہا ہے۔ ع

فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

دل کی بے چینی دور ہوئی ؎

پہاڑوں سے اٹھا بادل ہے بدلی حالت اب دل کی
چمن میں گونجتی پھرتی ہیں آوازیں عنادل کی!

بارش ہوگئی تو بہتر، ورنہ سینے میں ہوک سی اٹھے گی۔ سوکھی برسات کا کیا فائدہ آرزو کا یہ شعر ایسی ہی کیفیت پیش کرتا ہے ؎

گھر گھر کے جو بادل آتے ہیں اور بن برسے کھل جاتے ہیں
آشاؤں کی جھوٹی دنیا میں سوکھی برساتیں ہوتی ہیں!

دریائے رحمت نے جوش کھایا۔ ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں۔ مرجھائے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہلکی ہلکی پھوار سے بدن بھیگ گئے۔

• چھوٹے چھوٹے بچے گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ وس بدلا کا لیا، کی، آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دیکھو برسات کی بہاریں، دھواں دھار بارش شروع ہوگئی پرنالے بہنے لگے۔ بارش اتنی تیز ہے کہ بوندیں نظر نہیں آتیں، جیسے کائنات کسی دبیز چادر میں لپیٹ دی گئی ہو۔ بادل گرجا، دل دہل گئے۔ بچے ماؤں کی گود میں سہم گئے۔ کیا سخت کڑک ہے۔ جنگل میں شیر بھی اس طرح نہیں گرجتا۔ کیا گھنگھور گھٹا چھائی ہے۔ وہ بجلی چمکی جیسے سیاہ غلاف سے تلوار نکلی ہے، جیسے گیسوئے یار میں سفید بال، یا یوسیوں کی تاریکی میں بیضائے امید۔ یا

بود چوں خنجر رخشندہ درون سینۂ دیو

آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ رعد کڑکا، شاید بجلی گری، خدا خیر کرے۔

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ دل بے چین تھے۔ جان میں جان آگئی۔ لڑکوں کی ٹولیاں گھروں کے باہر نکل آئیں۔ کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ دیوانہ وار اچھل کود رہے ہیں۔ پانی میں ڈوبی ہوئی سڑکوں پر چھینٹے اڑاتے بھاگ رہے ہیں۔ واہ وا! چھم چھم ہو رہی ہے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ بقول نظیر اکبرآبادی ؎

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا
کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا
اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ رہا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

پرنالے دھائیں دھائیں بہہ رہے ہیں گویا آسمانی مشکوں کے منہ کھل گئے۔ گلیوں میں پانی ہی پانی ہے، آن کی آن میں صحن تالاب بن گئے۔ کوٹھوں کا سبزہ پانی کی چادر میں چھپ گیا۔ مسکراتی، لہراتی اور جھومتی لڑکیوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ کوئی بھیگی ہوئی کسی کنج گل میں گنگناتی ہے۔ ع

رم جھم برسے پانی آج مورے آنگن

بادل امڈتے آتے ہیں۔ ادھر دوستوں کی ملاقاتوں میں پانی کی دیواریں حائل ہو گئیں۔ کیچڑ اور پانی میں کون چلے۔ کام کاج میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ باران رحمت زحمت بننے لگی۔ ع

ہائے ناں وس وے ناں وس وے بدلا کالیا

بھرے ہوئے جل تھل مستانہ وار چل رہے ہیں۔ مینڈک ٹرّاتے ہیں۔ مور جھنکارتے ہیں۔ کوئل کوکتی ہے۔ پانی نے مردہ زمین میں جان ڈال دی۔ صحرا میں زمردیں فرش بچھ گیا چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ ہے۔ درخت لہلہا رہے ہیں۔ ہرے بھرے بیل بوٹے اپنی سج دھج دکھا رہے ہیں۔ آموں پر عجب بہار ہے۔ ننھی ننھی بوندیں گر رہی ہیں ہے

شاخوں پہ ہل ہل کے برستی ہوئی بوندیں
رستوں میں رہ رہ کے چھلکتا ہوا پانی!
گردوں سے اترتے ہوئے انوار کے چشمے
مٹی پہ بہتی ہوئی تاروں کی جوانی

دیہات میں کسان خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ سرسبزہ و شاداب کھیت لہلہانے لگے۔ ہل چل رہے ہیں۔ بیج پڑ رہا ہے۔ پود لگ رہی ہے۔ منچلے بے فکرے لہکتے لہکتے گاتے بجاتے پکنک کی دھن میں جا رہے ہیں۔ کھانے پینے کے پروگرام بن رہے ہیں توبہ عہد بتاں کی طرح ٹوٹ جاتی ہے۔ ع

ساقیا شراب کہ توبہ کا قتل ہوا

گھروں میں پکوان پک رہے ہیں۔ سموسے تلے جا رہے ہیں۔ آموں کی ٹوکریاں ختم ہو رہی ہیں۔ راگ رنگ کی محفلیں آباد ہیں۔ ع

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بھیگی بھیگی رُت اور مستانہ ہوا۔ سے

یہ بھیگی رت، یہ مستانہ ہوا، برسات کا موسم
بہاروں کا سماں، یہ رس بھرے جذبات کا موسم

(اختر شیرانی)

اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیے۔ ہر چیز کی کثرت بعض اوقات زحمت بھی بن جاتی ہے۔ برسات کا بھی یہی حال ہے۔ بارش کی کثرت ندی نالوں کو بھر دیتی ہے دریاؤں میں سیلاب آگیا ہے۔ بڑے بڑے درخت اکھڑ گئے۔ کشتیاں چلانے سے ملاح عاجز، بستیاں تباہ ہو گئیں۔ مویشی پانی کی نذر ہو گئے۔ انسانوں کی جانب جانیں تلف ہو گئیں۔ فصلیں تباہ ہونے لگیں۔ بیماریاں پھیلنے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔

غریب غربا کا برا حال ہے۔ مزدوری بند ہو گئی، کاروبار مندہ پڑ گیا۔ مکان گرنے لگے۔ اگر گرے نہیں تو ٹپک ٹپک کر چھلنی ہو جاتے ہیں۔ بقول میرؔ

کہیں ہنڈیا رکھوں کہیں پیالہ
کہیں ہنڈیا کے ٹھیکرے لالا!

نظیر اکبرآبادی غریبوں کی بے کسی کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں ۔

میلے کچیلے کپڑے آنکھیں بھی ڈبڈبائی
چھپّا پڑا ہے چولہا ٹوٹی پڑی کڑھائی

سب کچھ بجا، مگر برسات کا موسم سرچشمۂ انبساط ہے۔ اسی لیے لوگ تو خواہش کرتے ہیں۔ ع

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

ایک خواب

میں نے نائلون کا مہین اور خوبصورت خلائی سوٹ پہنا اور پھر ہوائی فوج کی سفید لاری میں بیٹھ کر ہوائی اڈے کو چل دیا۔ اڈے پر پہنچ کر میرا آخری طبی معائنہ ہوا اور پھر میں راکٹ کے آگے لگے ہوئے کیبن میں سوار ہو گیا۔ یہ کیبن ایک چھوٹے سے کمرے سے مشابہ تھا جس میں ضرورت کی تقریباً سبھی اشیاء موجود تھیں۔ میرے سامنے ہی ایک ریڈیو سیٹ رکھا تھا جس کے ساتھ ہی ٹیلی ویژن کا پردہ تھا جس پر مجھے پیغام بھیجنے والے کی شکل نظر آتا تھی۔ گرمی اور سردی پہنچانے والے آلات الگ الگ کونوں میں رکھے تھے۔ ایک گلوب بھی سامنے تھا جس میں زمین کا ہر وہ حصہ روشن ہو جاتا جس کے اوپر سے یہ راکٹ گزرتا۔ ان سب کے کنٹرول کا ایک بورڈ میرے سامنے لگا تھا۔ اور اس کے پر تقریباً ایک درجن بٹن تھے۔ ان سے مجھے اندرونی حصوں میں کنٹرول کرنا تھا۔ میں نے مقناطیسی بوٹ پہن رکھے تھے تاکہ بے وزنی کی حالت میں کہیں چھت سے ٹکرا کر سر نہ پھوڑ لوں۔

گو ابھی صرف رات کے چار ہی بجے تھے اور صبح کا دھندلکا پھیل رہا تھا مگر اڈے پر بہت چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ لوگوں کا ہجوم تھا اور تمام بیرونی ممالک کے سینکڑوں

اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر بھی موجود تھے جنہوں نے میرے سوار ہونے سے قبل میرا انٹرویو لیا اور میری تصاویر اتاریں۔ اب میں اپنے کیبن میں بیٹھا تھا اور تمام اقدامات مکمل ہو چکے تھے۔ چند ہی لمحوں میں میرا راکٹ زمین کو خیرباد کہنے والا تھا۔ میرا دل خوشی سے لبریز تھا کہ میں دنیا کا مشہور خلانورد ہوں گا۔ سبز بتی جلنے لگی اور گنتی شروع ہو گئی۔ دس، نو، آٹھ۔ چار، تین، دو، ایک اور صفر ــــــــــ راکٹ آگ کا ایک فوارہ نیچے چھوڑتا ہوا تیزی سے فضا کی وسعتوں کو چیرنے لگا۔ میں کھڑکی سے نیچے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ لوگ اچھل اچھل کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ میں مسکرا دیا۔ تمام دنیا کے ٹیلی ویژن پر میری تصویر آ رہی ہو گی، میں نے یہ خیال کیا اور مسکرانے لگا۔

راکٹ زمین سے سینکڑوں میل اوپر اٹھ چکا تھا۔ اب میں نیویارک پر سے گزر رہا تھا۔ سب شہر سو رہا تھا۔ مکانات گندم کے دانوں کی مانند نظر آ رہے تھے جو کہ چمک رہے تھے اور شہر جگنوؤں کا ایک گروہ نظر آتا تھا۔ آسمان سے باتیں کرنے والے مکانات ماچس کی روشن تیلیوں سے مشابہ تھے۔ سمندر سیاہی مائل نیلے رنگ کا تھا اور زیادہ حسین نظر آتا تھا۔ دور افق سے گھومتا ہوا سورج نکل رہا تھا۔ راکٹ گھومتا ہوا اب افریقہ پر سے گزر رہا تھا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ افریقہ میں سمندر ہی سمندر نظر آتا تھا اور زمین تو سب مخملیں گھاس سے اٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ دراصل افریقہ کے گھنے جنگلات تھے جو گہرے سیاہی مائل سبز رنگ کے نظر آتے تھے درمیان میں سے ایک دریا باریک رسی کی طرح بل کھاتا ہوا گزر رہا تھا۔

یکایک میرے کمرے میں لگا ہوا ایک بلب جل اٹھا اور ریڈیو پر مجھے امریکہ کے ایک افسر کی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے مبارکباد پیش کی، دعا دی اور مجھ سے احوال دریافت کیا۔ اس نے مجھ سے زمین کا منظر بیان کرنے کو کہا اور یہ بھی بتایا کہ امریکہ کے تمام لوگ میری آواز سننے کو بے قرار اور منتظر ہیں۔ میں خوشی سے پھول

ہی تو گیا۔ میں نے ایک بٹن دبایا اور کہنا شروع کیا۔ "میں اب زیادہ سے زیادہ بلندی پر پہنچ چکا ہوں اور اب زمین کے گرد اگرد چکر لگا رہا ہوں۔ میرے اردگرد ستاروں کی دنیا آباد ہے اور یہ ستارے چھوٹے چھوٹے گیندوں کی مانند اِدھر اُدھر گھومتے پھر رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی عظیم سی ہستی ان کروڑوں گیندوں کو اس چابکدستی سے لڑھکا رہی ہے کہ کوئی گیند دوسری گیند سے ٹکرانے نہ پائے اور اس کھیل سے خوب لطف اندوز ہو رہی ہے۔ زمین بذات خود ایک بڑے گیند کی مانند نظر آرہی ہے اور اس پر خشکی اور سمندر الگ الگ دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں ایک پورا چکر لگا چکا ہوں اور اب دوسرا چکر شروع ہے۔"

زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا کہ میں ایک جگہ سے گزرا تو وہاں دن تھا، ایک گھنٹے بعد دوسری جگہ سے گزرا تو وہاں رات تھی، کہیں شام تھی تو کہیں صبح۔ بحر منجمد شمالی یوں نظر آتا تھا۔ جیسے روئی دھنک کر پھیلا دی گئی ہو۔ زمین کا یہ حصہ ایک سفید براق چادر سے مشابہ تھا۔ شام ہو چکی تھی ستارے اب چمکنے لگے تھے اور چوگان کے روشن گیندوں کی مانند نظر آتے تھے۔ کئی شہاب ثاقب ٹوٹتے اور دوسرے ستاروں کی طرف گرتے تھے۔ مجھے دادی اماں یاد آگئیں، جن کے کہنے کے مطابق فرشتے شیطان پر انگارے لڑھکا رہے تھے۔ میں ان تمام مناظر سے انتہائی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا کیمرہ اٹھایا اور تصاویر اتارنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج تک ہزاروں بلکہ لاکھوں تصویریں اتاری جا چکی ہیں مگر جو تصویریں میں آج اتار رہا ہوں ان جیسی آج تک کوئی نہ اتار سکا ہو گا۔ میں نے قدرت کے چھپے چہرے پر سے نقاب کشائی کی تھی۔ مجھے زمین سے باقاعدہ ہدایات موصول ہو رہی تھیں۔ میں نے قلم اٹھایا اور ڈائری میں بعض یادداشتیں نوٹ کرنے لگا۔

دو چکر پورے ہو چکے تو مجھے زمین سے ہدایت ملی کہ واپس ہونے والا بٹن دباؤں میں نے حسین نظاروں کو بادلِ ناخواستہ "الوداع" کہا اور واپسی کا بٹن دبایا

راکٹ نے ایک پلٹا کھایا اور اس کا رُخ سیدھا زمین کی طرف ہوگیا۔ راکٹ تیزی سے نیچے کی طرف جا رہا تھا اور میں اس کا رُخ سمندر کی طرف موڑ رہا تھا۔ زمین سے مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ بحر اوقیانوس میں دس جہاز اور کوئی ایک صد سٹیمر میرا انتظار کر رہے تھے اور جونہی میرا کیبن سمندر میں گرے گا مجھے فوراً کیبن سمیت اٹھا کر جہاز میں سوار کر لیا جائے گا۔

راکٹ اب زمین کی کشش کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا اور تیزی سے نیلے سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سمندر میں جہاز اور سٹیمر نقاط کی طرح نظر آ رہے تھے۔ پھر یکا یک میرا کیبن سمندر میں آن گرا۔ ایک نزدیکی جہاز تیزی سے میری جانب بڑھا اور کیبن اٹھا کر جہاز میں رکھ لیا۔ میں جھٹ باہر نکلا۔ جہاز کے فوجی عملے نے مجھے فوجی سیلوٹ کیا اور میں نے ان کا جواب دیا۔ جہاز کے کپتان نے مجھے مبارک باد پیش کی اور توپیں داغنے کا حکم دیا۔

پہلی توپ چلی اور . . . اور میری آنکھ کھل گئی۔ میرا اپنا کمرہ تھا۔ میرے سینے پر انگریزی کی دہی کتاب کھلی پڑی تھی جو میں پڑھتا پڑھتا سو گیا تھا۔ یہ کتاب "امریکہ کا پہلا خلانورد" (America's First Man in Space) تھی۔

مجھے خواب کے حسین مناظر یاد آنے لگے۔ میں نے ایک دفعہ پھر آنکھیں موندھ لیں کہ شاید . . . مگر ع

وہ خواب سہانا ٹوٹ گیا

(خالد لطیف شاد)

نوٹ: (اس مضمون کو "خلائی سفر" یا ع
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
کے تحت بھی لکھا جا سکتا ہے۔)

مطالعۂ کتب

"کتابیں نوجوانی میں رہنما ہوتی ہیں، بڑھاپے میں تفریح اور تنہائی میں رفیق
یہ زندگی کو گراں بار نہیں ہونے دیتیں۔"

کتابیں دنیا کی ان چند نعمتوں میں سے ہیں جو باوجود اس قدر قیمتی اور مفید ہونے کے تمام بنی نوع انسان کی مشترکہ وراثت ہیں۔ ان کی بدولت زمانۂ گزشتہ اور زمانۂ حال کے حکماء کے انمول موتی، ادبا کے اچھوتے نکات اور شعراء کے پاکیزہ جذبات نہایت نفیس اور عمدہ الفاظ میں محفوظ رہتے ہیں۔ یہی ایک ایسی وراثت ہے جس میں سے امیر، غریب، طاقتور، کمزور سبھی باندازۂ ہمت بلا امتیاز حصہ لے سکتے ہیں۔ کتابوں کی وساطت سے ہم تمام روئے زمین کے بڑے بڑے مصنفوں، سیاست دانوں اور فلسفیوں کی صحبت سے گھر بیٹھے بٹھائے مستفیض ہو سکتے ہیں۔ اور ان سے مشورہ لے سکتے ہیں۔ اس مشورے کے لیے نہ تو ہمیں کوئی بڑی فیس ادا کرنی پڑتی ہے اور نہ ان سے باریابی حاصل کرنے وقت کوئی دقت اٹھانی پڑتی ہے۔

کتابوں کو اکثر اوقات دوستوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے، لیکن سچ پوچھو تو یہ دوستوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ دوستوں کی غداری اور بے وفائی کا خوف ہر وقت دامنگیر رہتا ہے۔ ان کی جدائی کے صدمے سے دل کانپتا ہے لیکن کتابیں تنگی اور فراخی، مصیبت اور خوشی، ہر حال میں ہمارا ساتھ دیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ داناؤں نے مطالعہ کتب کو دنیا کی ہر ایک نعمت پر ترجیح دی ہے۔ انگلستان کا مشہور ادیب لارڈ میکالے جو امارت اور مرتبے میں کچھ کم نہ تھا، کہتا ہے کہ میری زندگی کے سب سے خوش کن لمحے وہ تھے جو کتب بینی میں صرف ہوئے وہ ایک خط میں لکھتا ہے: "اگر مجھے دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ بنا دیا جائے

میرے رہنے کے لیے نہایت خوبصورت محلات اور باغیچے ہوں، کھانے کے لیے نفیس اور لذیذ کھانے اور پہننے کے لیے خوبصورت کپڑے مجھے ملیں، سواری کے لیے اعلیٰ قسم کی بگھیاں اور خدمت کے لیے سینکڑوں نوکر چاکر میرے لیے مہیا کیے جائیں لیکن ساتھ ہی یہ قید لگا دی جائے کہ میں کتابیں نہ پڑھوں تو میں اس شرط پر بادشاہ بننے سے قطعاً انکار کر دوں۔"

کتابیں ایسی نعمت بے بہا ہیں کہ دنیا کی کوئی اور نعمت ان کا بدل نہیں ہو سکتی کیوں کہ ان میں ایسی طاقت ہے جو مفلس کو مفلسی سے اور بدبخت کو بدبختی سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس کے طفیل باربردار بوجھ کی مشقت کو، بیمار بیماری کی مصیبت کو اور غمگین غم کی اذیت کو بھول جاتا ہے۔ کتابیں تنہا آدمی کے لیے رفیق اور مجبور کے لیے دمساز ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت ناشاد کو شادمانی حاصل ہوتی ہے، مایوس کی مردہ آرزو زندہ ہوتی ہے، شکستہ ڈھارس بندھتی ہے اور لاچار کو سہارا ملتا ہے۔ یہ ظلمت کی جگہ نور اور تاریکی کی جگہ روشنی پھیلاتی ہیں۔ کتابیں دل کو پاکیزہ خیالات اور جذبات سے بھر دیتی ہیں۔ سبق آموز سوانح عمریوں کے ذریعے سے تشکیل سیرت پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اعلیٰ اعلیٰ نمونے پیش کر کے ہمارے لیے مشعل راہ بناتی ہیں۔ اپنے حکیمانہ اقوال سے کام کرنے کے لیے ابھارتی ہیں۔

کتابیں اپنا اثر صرف انفرادی زندگی پر ہی نہیں ڈالتیں بلکہ قوموں کی تاریخ کو بھی اپنی زبردست طاقت سے بدل دیتی ہیں۔ پلوٹارک کی کتاب "مشاہیر یونان و روما" نے مغرب کی تمام قوموں کو قعر مذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہنچا دیا۔ روسیو اور والٹیر کی تصانیف نے اہل فرانس کے دلوں میں حریت اور مساوات کے ایسے خیالات بھر دیے کہ انہوں نے صدیوں کی شخصی سلطنت کو تہ و بالا کر کے ملک میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا جس کے اثرات یورپ کے تمام ممالک میں پھیل گئے۔ حالی اور اقبال کی شاعری نے مردہ قوم کو زندہ کرنے میں مسیحائی کا کام کیا ہے۔

جس طرح اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے سے طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے اور ناپاک آدمیوں کے پاس بیٹھنے سے دل میں گندے خیالات جاگزیں ہوتے ہیں، اسی طرح اچھی اور بری کتابیں بھی اپنا اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتیں اس لیے انتخاب کتب میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بعض کتابوں کا پڑھنا نہ صرف تضیع اوقات ہوتا ہے بلکہ مخرب اخلاق بھی۔ ان کا اثر زہر قاتل کی طرح چپکے چپکے دل میں گھر کر جاتا ہے اور بالآخر ہماری اخلاقی موت کا باعث بنتا ہے۔

برعکس اس کے عمدہ کتابوں کے پڑھنے سے انسان کا دل بے اختیار سچے جذبات سے ابلنے لگتا ہے۔ اس کی طبیعت بڑے کام کرنے کے لیے ابھرتی ہے۔ اس میں استقلال اور اولوالعزمی پیدا ہوتی ہے۔ عمدہ کتاب کے مطالعے سے انسان کی روح دنیا و مافیہا اور اس کے مصائب و آلام کو پیچھے چھوڑ کر اعلیٰ و ارفع مقامات میں پرواز کرتی ہے۔ عمدہ کتاب پڑھنے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے۔ ہماری ہستی عام ہستیوں سے خوش تر اور بالاتر ہو جاتی ہے۔

مطالعہ کتب میں کوئی نہ کوئی مقصد پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ہی نہیں مضر بھی ہے۔ جس قدر ہم بغیر کسی مقصد کے پڑھتے ہیں اس قدر ہم بامعنی مطالعہ سے دور ہو جاتے ہیں۔ بعض اشخاص محض تفریح طبع کے لیے پڑھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات دل بہلانے کے لیے اچھے ناولوں کا پڑھنا ضرر رساں نہیں ہوتا۔ بلکہ تاش وغیرہ کھیل کر وقت ضائع کرنے کی نسبت ہزار درجہ بہتر ہوتا ہے۔ لیکن مطالعہ کا سب سے مفید اور اعلیٰ مقصد معلومات حاصل کرنا ہے۔ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو دنیا کے تجربات اور معلومات سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ کتابوں کے پڑھنے سے ہم نہایت قلیل عرصے میں ان چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں جو انسان نے صدیوں کی کوشش کے بعد حاصل کی ہیں۔

مطالعہ کا ایک اور مقصد دماغ کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنا ہے۔ عمدہ

کتاب کے مطالعے سے ہم پر اپنی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بھی کچھ کر سکتے ہیں۔ مطالعہ ان خیالات کو ہمارے دل سے باہر نکال لاتا ہے۔ جن کے متعلق ہمیں وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ہمارے اندر موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات ہم سوچتے ہیں کہ کتاب ہمارے ان خیالات کی ترجمانی کر رہی ہے جو ہم میں پہلے سے موجود تھے مگر ہم ان کے اظہار سے قاصر تھے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کتابوں کا کثرت سے پڑھنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتا ہے۔ جو کچھ پڑھا جائے اس کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے، کہ وہ دماغ کا جزو بن جائے۔ کتابیں دماغ کے ساتھ وہی تعلق رکھتی ہیں جو ورزش کے آلات جسم کے ساتھ۔ ورزش کرنے کے بعد ان آلات کو اٹھا کر ہر جگہ نہیں لے جا سکتے۔ بلکہ وہ طاقت اور قوت جو جسم حاصل کر لیتا ہے ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ اس طرح کتابیں بھی دل و دماغ کو ایک طاقت بخشتی ہیں، لیکن ان سے اس طرح مستفید ہونا چاہیے کہ ان کو ہر ایک جگہ ساتھ لے جانا نہ پڑے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اقبال نے اس مصرعے میں عورت کا مقام واضح کر دیا ہے۔ اس حقیقت سے تو انکار ممکن نہیں کہ ایک تصویر میں جب تک مصور رنگ آمیزی نہیں کرتا وہ محض خاکہ ہی کہلاتا ہے لیکن جب اس خاکے میں موقع و محل کے مطابق رنگ بھر دیے جاتے ہیں تو اس کی خوب صورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر کسی تصویر کے خاکے میں نامناسب اور ناموزوں رنگ بلا لحاظ بکھیر دیے جائیں تو وہ نہ صرف فنِ مصوری کے معیار کے مطابق نہیں تسلیم کی جاتی بلکہ وہ دیکھنے والے کی توجہ کو بھی اپنی طرف نہیں پھیر سکتی۔ اس لیے ایک کامل شاہکار مصوری کا حسن

نہ صرف اس کے ڈھانچے کی نفاست پر مبنی ہے بلکہ نقاشں کی جمالیاتی حس کا بھی اس میں بڑا حصّہ ہے۔

اگر اس کائنات کو ایک تصور خیال کیجیے تو عورت کا وجود یہاں اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا خوش نما اور مناسب رنگ ایک تصویر کی تکمیل کے لیے لازم ہے۔ اگر عورت کی تخلیق نہ کی جاتی تو شاید دنیا اتنی حسین نہ ہوتی۔ ہم اس دلیل کے لیے واضح مثال حضرت آدم علیہ السلام کی دے سکتے ہیں کہ انھوں نے ہر اس چیز یا نعمت کی موجودگی میں جو قدرت نے انہیں وافر مہیا کی تھی ایک ایسے ساتھی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جو ان کی تنہائی دور کر سکے اور ان کی طبیعت کو بہلا سکے، اور اللہ تعالیٰ نے ایک عورت ہی کو اس اہم ذمہ داری کا اہل سمجھا۔ لیکن محض عورت کا وجود ہی کائنات کی تصویر میں رنگ آفرینی نہیں کر سکتا۔ عورت اس وقت کائنات کی تصویر میں رنگ بھرتی ہے۔ جب کہ وہ ایک مہربان ماں، وفا شعار بیوی، ہمدرد بہن اور فرماں بردار بیٹی کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اگر ایک مشفق ماں اپنی تمام کوششیں اپنی اولاد کی صحیح پرورش میں صرف کرتی ہے تو وہ کائنات میں زندگی ڈال دیتی ہے۔ عورت کو بحیثیت ماں جو مقام قدرت نے عطا کیا اس کی شہادت خود قرآن کریم سے مل جاتی ہے۔ اگر یہی عورت اپنے وجود میں وہ تمام شفقت و محبت، انس، خلوص قوت برداشت اور ضبط و تحمل نہیں رکھتی، جو اس کا حصّہ ہے تو وہ صحیح معنوں میں عورت نہیں کہلا سکتی اور ایسی عورت کا وجود کائنات کی تصویر میں ایسا ہی رنگ معلوم ہوگا جیسا کہ کسی نو آموز مصور کے تصویر میں غلط رنگ بھر دینے پر تصویر حسین معلوم ہونے کی بجائے بھدی معلوم ہونے لگتی ہے۔

اب بحیثیت بیوی دیکھیے عورت کہاں تک کائنات میں حسن پیدا کرتی ہے۔ ایک وفا شعار بیوی گھر کی چھوٹی سی کائنات میں جو رونق اپنی وفاداری اور خلوص سے بھرتی ہے وہ نہ صرف اس کے بلکہ اس کے خاوند اور بچوں کے لیے بھی

حد درجہ طمانیت و راحت کا باعث ہوتی ہے۔ رسول پاک صلعم نے عورت کو آنکھ کی ٹھنڈک فرمایا ہے تو کیا ایک مکمل اور خوبصورت تصویر آپ کے جمالیاتی ذوق کی تسکین نہیں کرتی ضرور کرتی ہے۔ پھر بھلا عورت کس طرح اس دنیا کے حسن میں اضافے کا باعث نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس ایسی خواتین جو اپنی فطری خوبیوں کو خیرباد کہہ دیں اور نسوانیت کا جامہ اتار دیں ان کے لیے یہ کہنا بجا ہوگا۔

وجود زن سے ہے عرصۂ کائنات میں جنگ

کیوں کہ نیک و بد ہر قسم کے لوگ اس دنیائے رنگ و بو میں موجود ہیں۔ پھر یہ ضروری نہیں کہ جہاں نیکی موجود ہو وہاں طاغوتی طاقت کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ایک بری عورت کائنات میں وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے گلستان میں خار اور تصویر میں غلط رنگ۔

عورت کے وجود نے حقیقت میں اس دنیا کو رونق بخشی مگر مختلف ادوار میں مختلف، مفکروں، مذہبی راہ نماؤں نے اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا۔ کسی نے اسے زمین کا بوجھ قرار دیا اور کسی نے اسے کائنات کی سب سے بدترین مخلوق قرار دیا مگر اسلام نے جو مقام عورت کو بخشا دراصل اسی کی طرف اقبال نے اپنے شعر کے اس مصرعے میں اشارہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ دنیا کی گہما گہمی، رونق اور چہل پہل ایک ماں، ایک بیوی، ایک بیٹی اور ایک بہن کی رہین منت ہے۔ اگر دنیا میں عورت کا وجود نہ ہوتا تو دنیا ایک بے رنگ و بے رونق مقام ہوتا۔ خدا نے عورت کی طبیعت میں رحم، محبت نرمی، خلوص، وفا شعاری اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور یہ وہ تمام خوبیاں ہیں جن کا فقدان ہی دنیا کو ایک جہنم کا نمونہ بنا دیتا۔ مگر سوچیے اللہ نے عورت کو پیدا کر کے کائنات پر کتنا بڑا احسان کیا ہے اور حسن بھی بخشا ہے۔ اگر بالفرض اس وسیع عریض زمین پر محض مرد ہی مرد ہوتے تو کیا زندگی اجیرن نہ ہوتی۔ کیا ان پر عرصۂ حیات تنگ نہ ہو جاتا۔ کیا وہ اپنی اس اداس زندگی سے گھبرا نہ اٹھتے۔ اور اس کا جواب اثبات میں ہے۔ عورت آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، دل کا سرور ہے، زخموں

کام ہم سے دکھوں کا مداوا، تنہائی کی رفیق، مصیبت میں معاون ہے۔ نسل انسانی کی بقا اسی سے ہے۔ اگر ان تمام باتوں سے ہم انکار کر دیں تو اقبال کے اس مصرعے کی تردید خود بخود ہو جائے گی۔ مگر ان حقائق سے انکار مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے آج خواہ مرد اپنی برتری جتانے کے لیے اور عورت کا رتبہ گھٹانے کے لیے کچھ بھی کیوں نہ کہیں مگر وہ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ عورت کا وجود راحت کا نہیں بلکہ تکلیف کا باعث ہے۔ اِس لیے اقبال نے درست ہی فرمایا ہے کہ عورت کے وجود نے ہی تصویر کائنات میں رنگ بھرا ہے ورنہ اس دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے لیکن یہ رنگینی، رونق اور حسن نہ ہوتا جو اسے عورت نے بخشا ہے۔

(پروفیسر مس نان)

شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا

انسان اس دنیا میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ انسانی فطرت کے اس پہلو کی طرف زمانہ قبل از تاریخ میں یونان کے حکیم ارسطو نے اشارہ کیا تھا۔ کہ جو تنہا رہ کر گزار سکے وہ فرشتہ ہے، یا شیطان، انسان نہیں۔ گویا انسان مدنی الطبع ہے اور وہ اس لیے کہ وہ ہر قدم پر دوسروں کی اعانت اور امداد کا محتاج ہے انسان، اپنی مختصر سی زندگی میں ہزار آدمیوں سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے اور کچھ لوگوں سے نفرت۔ لیکن ایک نہ ایک شخصیت ایسی بھی ہوتی ہے جو انسان کے ذہن پر چھا کر رہ جاتی ہے اور انسان اٹھتے بیٹھتے اُسی کے متعلق سوچتا ہے اور اسی کی تعریفیں کرتا ہے اور تنہائی میں کبھی کبھی یوں بھی کہتا ہے کہ کاش میں بھی اس جیسا ہو سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخصیت مجھے سب سے زیادہ پسند ہو وہ دوسروں کو بھی وہی پسند ہو یا شخصیت کے پسندیدہ ہونے کے سلسلے

ہیں جو معیار میرا ہے وہی دوسروں کا بھی ہو ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے ۔ کہتے ہیں کہ لیلیٰ را بہ نظر مجنوں باید دید ۔ لیلےٰ مجنوں کے لیے سب کچھ تھی ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے آپ کے لیے کچھ بھی نہ ہو ۔ یہی مجنوں کا اور آپ کا پسندیدگی کا معیار مختلف ہو جائے گا ۔ انسان متاثر ہونے پر آئے تو احمقوں سے متاثر ہو جاتا ہے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ احمقوں میں خدانخواستہ کوئی متاثر کرنے والی پوشیدہ قوت ہوتی ہے اور دوسرے لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں ۔

جس طرح پسندیدگی کے معیار مختلف ہیں ، ٹھیک اسی طرح پسندیدگی کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں ممکن ہے کہ عمر کے کسی خاص حصے میں آپ کو کسی ایک شخصیت نے متاثر کیا اور وہ شخصیت کچھ عرصہ آپ کے حواس پر سوار رہی اور پھر از دیدہ دور از دل دور ہو گئی ۔ یہ عارضی تاثر پسندیدگی کا ادنیٰ درجہ ہے ۔ اگر ایک آدمی اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کی فہرست تیار کرنا شروع کر دے تو ان کی تعداد سینکڑوں سے بھی تجاوز کر سکتی ہے ۔ بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ بس ذہن پر سوار ہو کر رہ جاتی ہیں آپ اگر کوشش بھی کریں تو ان سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتے ۔ ہاں تو بات بھی اسی شخصیت کی تھی کہ جس نے مجھے متاثر کیا ۔ مجھے ایک مولوی صاحب بہت پسند تھے ۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت لائق تھے بلکہ اس لیے کہ موصوف بڑے زود رنج تھے ۔ فوراً لال پیلے ہو جاتے اور شاگردوں کو ماں بہن کی گالیاں دیتے ۔ لڑکے جان بوجھ کر انہیں چھیڑتے اور ان کی گالیاں سن کر خوش ہوتے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے جانے کے بعد میں نے ان کو کافی عرصہ تک یاد کیا اور ان کے بغیر کمرۂ جماعت کو ویران محسوس کیا مگر وہ بھی اب حافظہ سے اتر چکے ہیں ۔

شاید آپ کا خیال ہو کہ میں کسی بہت بڑی اور بھاری بھرکم شخصیت سے متاثر ہوا ہوں گا ۔ معاف کیجیے گا آپ کو مایوسی ہو گی ۔ مجھ کو ایک ان پڑھ اور معمولی سے

انسان نے متاثر کیا جسے شادی کہتے ہیں۔ شادی اسی قصبے میں رہتا ہے جہاں میں رہتا ہوں اور اگر کبھی آپ کو وہاں جانے کا اتفاق ہوگا تو اسے آپ فٹ پاتھ کے قریب چھابڑی لگا کر سودا بیچتے ہوئے پائیں گے اسے یہ کام کرتے ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ شادی جب جوان تھا تو اس کی جوانی کی دھوم تھی۔ لوگ کہتے کیا خوبصورت گھبرو جوان ہے۔ پھر شادی فوج میں بھرتی ہو گیا اور سات سمندر پار لڑائی پر چلا گیا جب وہاں سے واپس آیا تو اس کی ایک ٹانگ اس کے ساتھ نہ آئی مگر اب اس کا بیٹا جوان تھا اس نے شادی کی ڈھارس بندھائی۔ لیکن شادی کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ بیٹے کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرے اس نے فٹ پاتھ پر چھابڑی لگالی اور اپنی روٹی اپنی محنت سے کمانا شروع کی۔ اب اسے اپنی ٹانگ کٹنے کا کوئی افسوس نہ تھا۔ اس لیے کہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنا تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اس کا بیٹا چار بچے اور ایک بیوی چھوڑ کر وہاں چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ شادی نے اس غم کو سینے پر پتھر کی سل رکھ کر برداشت کیا۔ ساتھ ہی اس کی ہمت میں پانچ گنا اضافہ ہو گیا۔ اس لیے کہ اب اس کے کنبے کے افراد میں پانچ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ بھلا شادی کی غیرت یہ کب گوارا کرتی کہ اس کے بیٹے کی بیوی اور بچے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔

ذرا سوچیں تو یوں لگتا ہے کہ شادی سپاہی پیدا ہوا تھا اب بھی سپاہی ہے اور مرتے وقت بھی سپاہی رہے گا۔ اس کی ہمت غضب کی ہے۔ بظاہر وہ معذور ہے مگر اسے معذور کہنا یا سمجھنا ہماری اپنی عقل کی معذوری ہوگی۔ وہ حالات کے سامنے چٹان بن کر ڈٹا ہے۔ جس طرح کبھی دشمن کے سامنے ناقابل عبور دیوار بن کر ڈٹ جایا کرتا تھا۔ مشکلیں اس کے راستے میں کبھی رکاوٹ نہ بن سکیں۔ اور نہ اس کی زندگی میں کبھی بن سکیں گی۔ اس کا حوصلہ کتنا بلند ہے اور اس کا ارادہ کس قدر مضبوط ہے اگر ہم سیکھنا چاہیں تو شادی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں وہ ہمیں پڑھنا لکھنا تو نہ سکھا سکے گا مگر وہ بات ضرور سکھا دے گا جو بہت کچھ لکھنے پڑھنے کے بعد بھی ذرا مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ (آر۔ پی۔ صدیقی)

اخبار بینی

اخبار بینی ایک مفید مشغلہ ہے اور آج کی دنیا میں اخبار بینی ہر پڑھے لکھے شخص کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے کیونکہ گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

اخبارات میں مختلف مصنوعات پر مفید معلومات ملتی ہیں۔ بعض اوقات ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جن سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ ذہنی تربیت ہوتی ہے اور نہ معلومات بڑھتی ہیں۔ مثلاً کچھ لوگوں کا شخصی پروپیگنڈا، ذاتیات پر بحث امراء اور احکام کی مدح سرائی۔ ایسی باتیں پڑھنے سے ذہن میں پراگندگی اور طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری نہیں کہ ہر اخبار کو اوّل سے آخر تک پڑھا جائے بلکہ سرخیوں کو دیکھ کر کام کی باتیں پڑھنی چاہیں۔ اور جہاں یہ محسوس ہو کہ کام کی باتیں کم اور مخرب اخلاق باتیں زیادہ ہیں تو آئندہ ایسے اخبار سے پرہیز ضروری ہے۔

جن اخبارات میں حالات پر بے لاگ تبصرہ ہو، معلوماتی مضامین ہوں، قومی تعمیر کے لیے مواد مہیا کیا گیا ہو۔ ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہو۔ ان کے مطالعے کو ترجیح دی جائے۔

اخبارات سے ہمیں بے شمار فائدے ہیں۔ روزانہ حالات سے واقفیت ہوتی ہے، جن کو جاننے کے بعد ہم اپنے کاروبار اور دوسرے مسائل کے متعلق رائے قائم کر کے زندگی میں صحیح قدم اٹھاتے ہیں۔ کبھی کبھی گزشتہ زمانے کے ان واقعات سے اخبار ہی ہمیں باخبر کرتے ہیں جو قوم کی زندگی اور موت کا ذریعہ بن چکے ہیں۔ بسا اوقات مستقبل کے متعلق اخبار ہمیں وہ راستہ دکھاتے ہیں جس پر گامزن ہو کر قوم اور

افراد فلاح و بہبود کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ انہی اخبارات کے ذریعے ہم قوم میں ہمدردی، حب الوطنی، اور تعمیر و ترقی کا جوش پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کے دامن میں ہمیں ملک کے انسانوں اور روزمرہ کے حالات کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

انہی کے ذریعے عوام کی آواز حکومت کے کانوں تک پہنچتی ہے اور فریادیوں کی دادرسی ہوتی ہے۔ حکومت لوگوں کے نظریات سے با خبر رہتی ہے اور ان کی خواہشات کے مطابق سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے۔ قومی اور سیاسی تحریکوں کو ابھارنے میں اخبارات اہم حصہ لیتے ہیں۔ ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ تحریک پاکستان میں ہمارے اخبارات خصوصاً "زمیندار" نے کتنا اہم حصہ لیا ہے۔ سیاسی شعور پیدا کرنا اور لوگوں کے دلوں میں اپنے حقوق کی نگہداشت کا خیال پیدا کرنا اخبارات کا کام ہے صرف یہی نہیں بلکہ ہم گھر بیٹھے دنیا کی سیر کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ دنیا پر کیا بیت رہی ہے۔ مختلف ملکوں کے درمیان دوستی کے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ اخبارات کے ذریعے ہی نئی کتابوں کا تعارف ہوتا ہے۔ اشتہارات کے ذریعے ضرورت مند فائدہ اٹھاتے ہیں۔

آج کل اخبارات نے بہت ترقی کر لی ہے۔ خوبصورت چھپائی، رنگین تصاویر، علمی و ادبی بحثیں، دلچسپ خبریں، نفسیاتی الجھنیں، قانونی مشورے، بچوں کے صفحات، عورتوں کے مسائل، تجاویز، اور اسی قسم کے بیسیوں کالم قاری کے لیے بڑی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ جنگ، مشرق، امروز، نوائے وقت اور مساوات ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے بہتر سے بہتر مواد پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ غرض ہر فن اور پیشہ کے لوگ مفید معلومات حاصل کرتے ہیں۔

اخبارات کو چاہیے کہ وہ غیر جانبدار ہوں اور انسان دوستی کے جذبات پیدا کریں۔ حق کی علمبرداری اور بے لاگ تنقید ان کا شیوہ ہو۔ اور ملک و ملت کی تعمیر اور ترقی کے لیے کوشاں رہیں۔

محنت کی برکتیں

محنت کا لفظ دنیا کے ہر کام میں کامیابی کی کنجی ہے۔ لوگ اسمِ اعظم کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اور انہیں کون سمجھائے کہ اسمِ اعظم تو یہی محنت ہے محنت اختیار کیجیے تو اس میں ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اپنے مقصد کے صحیح ہونے پر ایمان رکھیے اور اسے حاصل کرنے کے لیے صدقِ دل سے اپنی تمام قوتیں بروئے کار لایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی کامیابی کی منزل آپ سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ کو اپنے مقصد کے بارے میں شک ہے اور آپ اس کے حصول میں سستی سے کام لیتے ہیں تو پھر آپ کی کامیابی بھی مشکوک ہوگی۔ ہمارے ملک میں محنت کی عظمت سے لوگ عام طور پر ناواقف ہیں۔ معمولی قسم کے سفید پوش تو محنت کرنا کسرِ شان خیال کرتے ہیں۔ اگر انہیں بازار سے سبزی لانا ہو یا جوتے پر پالش کرنا ہو یا اس قسم کا کوئی اور چھوٹا موٹا ذاتی کام کرنا ہو تو بغلیں جھانکتے ہیں اور نوکروں کی امداد کے طالب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اس امر کی توقع رکھنا کہ وہ زندگی میں کوئی کام سرانجام دیں گے عبث ہے۔ انگلستان کے وزیرِ اعظم خود اپنے جوتوں پر پالش کرتے تھے اور اپنی ذاتی ضرورت کا ہر سامان خود تیار کرتے تھے۔ ایسا کرنے میں انہیں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ اور ہم لوگ اپنے ذاتی کام کرنے میں بھی شرم اور حجاب سے کام لیتے ہیں۔

دنیا کے ناموروں کی سوانح حیات اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام محنت کی عظمت اور برکت سے آشنا تھے۔ امریکہ کا مشہور عالم لنکن لکڑی جلا کر اس کی روشنی میں مطالعہ کرتا تھا۔ اور کتابیں حاصل کرنے کے لیے سینکڑوں میلوں کا سفر پیدل کرتا تھا۔ دور کیوں جائیں۔ ہمارے محبوب رہنما قائدِ اعظم رات کو بہت دیر تک

پڑھتے رہتے تھے اور جب ان سے دریافت کیا جاتا تو کہتے کہ اگر میں اتنی محنت نہ کروں گا تو بڑا آدمی کس طرح بنوں گا۔ ایک دفعہ بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس ہو رہی تھی۔ رات کے دو بجے تک قائدِ اعظم کے خیمہ میں روشنی جلتی رہی اور آپ کام کرتے رہے۔ ایک سنتری نے آپ سے پوچھا کہ ہندو لیڈر تو سو رہے ہیں۔ آپ اس وقت تک کیوں جاگتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ ہندوؤں کی قوم جاگتی ہے اس لیے اس کے لیڈر سوتے ہیں۔ مسلمان قوم سوتی ہے اسلیے ان کا لیڈر جاگتا ہے اور اس وقت تک جاگتا رہے گا جب تک کہ پوری مسلمان قوم نہ جاگ پڑے۔ ایسے ہی محنت کرنے والے لوگوں نے ہمیں آزادی دلائی اور ایسے ہی محنتی اسلاف کی ہم اولاد ہیں۔ اس لیے اب اگر ہم سستی اور کاہلی کا شکار ہوتے ہیں تو ہمارے لیے باعثِ ننگ ہے۔

یوں تو محنت کی ضرورت دنیا کے ہر کام میں ہوتی ہے مگر اس کی ضرورت اور اہمیت حصولِ تعلیم کے سلسلے میں دو چند ہو جاتی ہے کہ یہی ایک چیز دنیا میں ایسی ہے جو دولت سے خریدی نہیں جا سکتی بلکہ اس کے پیچھے پیچھے دور تک بھاگنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے جد و جہد کرنا پڑتی ہے۔ شوق اور محنت سے کام کرنا پڑتا ہے شوق جتنا تیز ہو گا اور محنت جتنی زیادہ ہو گی اس میدان میں کامیابی اتنی ہی بڑی اور اتنی ہی اہم ہو گی۔ یہ جاننا چاہیے کہ علم خود ایک دولت ہے جو دنیاوی دولت سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کے آگے زر و سیم گھٹیا قسم کی چیزیں ہیں اور زر و سیم کو اس پر سے قربان کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ لکھنے پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتے اور خاطر خواہ محنت نہیں کرتے انہیں اس میدان میں سربرآوردہ ہونے کی قطعاً امید نہیں رکھنی چاہیے کہ ایسا محال ہے۔ دنیا اپنی تاریخ سے کوئی ایسا معجزہ نہیں فراہم کر سکتی کہ کوئی شخص علم کے میدان میں بغیر محنت کے آگے بڑھ گیا ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زیادہ محنت کرنے سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اگر ہم اپنے کام کو بیگار سمجھ کر کریں گے۔ تو اس

طرح تھوڑا سا کام کرنا بھی ہماری صحت پر برا اثر ڈالے گا۔ اور اگر ہم کام کو اپنا فرض سمجھ کر کریں تو اس میں بڑی عجیب لذت ہوتی ہے۔ جس سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جنہیں محنت کرنے کی عادت ہو چکی ہے۔ ایسے لوگوں کو تو کام کرنے میں دلچسپی ہو جاتی ہے کہ وہ کھانا اور سونا جیسی اہم ضروریات بھی فراموش کر بیٹھتے ہیں۔

الغرض محنت ہی عظمت کی علامت ہے۔ دنیا کا کوئی کام بھی اس کے بغیر خاطر خواہ طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اور کوئی شخصیت بھی کسی میدان میں اس کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ،
جو دنیا میں کرتے ہیں محنت زیادہ

میری پہلی تقریر

میٹرک میں سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئے تو گھر والے ہماری اس غیر معمولی قابلیت سے بے حد مرعوب ہوئے اور ہمیں کالج میں داخل کرا دیا۔ چچا جان نے ہمیں مشورہ دیا کہ بیٹا خوب دل لگا کر پڑھنا اور کالج کے مختلف مشاغل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ اس سے جھجک دور ہو جائے گی اور پھر زندگی کے ہر امتحان میں کامیاب ہو گے

کالج میں داخل ہونے کے بعد ہم پر کیا بیتی؟ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ بہرحال ہم کالج کی زندگی سے مانوس ہو گئے۔ ایک دن نوٹس بورڈ پر نظر پڑی۔ مباحثہ کا نوٹس تھا۔ چچا جان کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے کہ مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ چنانچہ ہم فوراً معتمد کے پاس پہنچے اور اپنا نام لکھوا دیا۔ قرارداد یہ تھی۔

"حسن ایک فریب ہے"

پھر مباحثے کی تیاری شروع کر دی۔ لائبریری سے دیوان غالب۔ بانگ درا، کلیات اکبر، حتیٰ کہ فیض کی دست صبا بھی نکلوائی اور ورق گردانی کرنے لگے۔ پھر ہمارے ذہن رسا نے ایک خاکہ تیار کیا کہ سب سے پہلے قرار داد کے حق میں دو تین شعر پیش کریں گے۔ پھر مخالفین کا دندان شکن جواب دیں گے۔ اس کے بعد ہابیل قابیل کا قصہ سلمیٰ اور اختر شیرانی کا قصہ اور آخر میں مصطفیٰ زیدی اور شاہناز گل کی مثال دیں گے حسن کی کج ادائی اور بے وفائی پر کئی اشعار پڑھیں گے۔ لوگ ہماری سحر البیانی پر سر دھنیں گے اور ہم مسکرا مسکرا کر داد وصول کریں گے۔ ہال تالیوں سے گونجتا رہے گا اور ہم مخر و ناز سے سیٹ پر واپس آ جائیں گے۔

چنانچہ ہم نے ریہرسل شروع کر دی۔ اونچی آواز میں صدر ذی وقار کہتے اور پھر تقریر شروع کر دیتے۔ نکٹائی جوش میں کندھوں پر چلی جاتی۔ بال بکھر جاتے۔ ہاتھ دائیں بائیں حرکت کرتے۔ کمرے میں آواز گونجتی رہتی گھر والوں کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم تقریر تیار کر رہے ہیں۔

مباحثے والے دن نہا دھو کر شیو کر کے اجلے کپڑے پہن کر نئی نکٹائی لگا کر آئینے کے سامنے اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ مباحثہ صبح دس بجے تھا مگر ہم ساڑھے آٹھ بجے ہی کالج ہال میں پہنچ گئے۔ معلوم نہیں وہ لمحات کیسے گزرے پھر وہ سماں یاد ہے کہ سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج سجا ہوا تھا۔ صاحب صدر اپنی جگہ پر براجمان تھے اور بڑی بارعب آواز میں سامعین سے خاموش رہنے کی درخواست کر رہے تھے۔

تلاوت کلام پاک سے آغاز ہوا۔ کارروائی پڑھ کر سنائی گئی۔ لیکن ہمیں ان چیزوں سے کیا سروکار۔ ہم تو اپنی تقریر بار بار دہرا رہے تھے۔ پسینے کے سیال نگینے ہماری تابندہ پیشانی پر ظاہر ہوتے اور ہم اپنے رومال میں جذب کر لیتے۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ قائد ایوان کے قرار داد کے الفاظ کی وضاحت کی۔ کبھی ہال میں سناٹا چھا جاتا کبھی بلند قہقہے نمودار ہوتے۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ سامعین تشریف

وگ ہیں دل کو تقویت ہوئی۔ کپ پر نگاہ پڑی اور دل ہی میں دل میں سوچا۔ یہ چمکتا ہوا کپ ابھی کچھ دیر بعد ہمارے ہاتھوں میں ہوگا اور فوٹو گرافر ہماری تصویر لے رہا ہوگا میں کیا کچھ سوچتا ہوا جوش و جذبات میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے معلوم اس وقت ہوا جب پیچھے بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے میرے کوٹ کا کالر کھینچ کر زبردستی مجھے بٹھا دیا۔ دو تین مقررین آئے۔ ہال میں کچھ جگہ خراش آوازیں بلند ہوئیں۔ ہم نے دل کو سمجھایا قصور سامعین کا نہیں۔ مقررین کا ہے کہ انہیں تقریر کا آرٹ نہیں آتا۔ میں ابھی انہی خیالات میں گم تھا کہ سپیکر بڑی صاحب کے الفاظ ہال میں گونجے اب جناب۔ صاحب قرار داد کے حق میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔" فوراً ایک برقی رو سر سے پاؤں تک گزر گئی۔ نکٹائی درست کی۔ جیب سے کاغذ نکالا اور بڑی مستانہ چال سے سٹیج کی طرف بڑھے۔ گھبراہٹ میں لاؤڈ سپیکر کے تار سے پاؤں الجھ گیا۔ اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ ہال میں زور دار قہقہے بلند ہوئے پھر صاحب صدر کی آواز سنائی دی کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔

گرتے ہیں شاہسوار ہی میدان جنگ میں

میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔ لرزاں خیزاں مائک کے سامنے جا پہنچا۔ کاغذ کی تلاش میں ہاتھ جیب میں ڈالا صدر ذی وقار کہہ کر تقریر کے آغاز کے لیے کاغذ کے پرزے پر نگاہ ڈالی۔ نفرت بر دالے کاغذ کی بجائے دھوبی کو دیے ہوئے کپڑوں کی لسٹ تھی اور میں جلدی میں کہہ چکا تھا۔ بھائی جان کی قمیض ایک عدد!"

ہال میں بے ہنگم آوازوں کا طوفان اٹھا۔ میری زبان سے قوت گویائی رخصت ہوگئی۔ ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں۔ سارا ہال گھومتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ صاحب صدر کی درد مندانہ اپیل پر سامعین نے دم بھر کے لیے چپ سادھ لی۔ میں نے کہا "صدر محترم ہابیل قابیل۔ مرزا غالب اور مصطفیٰ زیدی۔

مع — عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

ہال میں پھر جگر خراش صدائیں بلند ہوئیں کرسیاں بجنے لگیں۔ لیکن میں برابر بولتا رہا یہ کچھ یاد نہیں کہ کیا کہا البتہ مکے کی ضرب سے روسٹرم الٹ چکا تھا۔ اور "پاگل" "پاگل" کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

(اخذ و ترمیم)

(بشکریہ کوہسار راولپنڈی)

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مرزا غالبؔ کے بہت سے دلکش اور حقیقت افروز اشعار زبان زد عام ہو کر ضرب الامثال کی سی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایسے ہی اشعار میں سے ایک شعر ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

شعر کیا ہے؟ حقیقت کی ایک منہ بولتی تصویر ہے، ہر روز کے مشاہدہ کی جیتی جاگتی تفسیر۔

آج سے مدت پہلے انگریزی ادب کے تاجدار شیکسپیئر نے کہا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی چیز اچھی یا بری نہیں۔ یہ ہمارا اپنا ہی زاویۂ فکر ہے جو کسی چیز کو اچھی یا بری بنا دیتا ہے۔ رنج و راحت یعنی خوشی اور غم کے باب میں اس حقیقت کو مولانا حالیؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

رنج و غم دنیا کے ہیں سب بے ثبات
اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

رنج کو ہم رنج کیوں سمجھتے ہیں؟ اس لیے کہ ہم رنج کی حقیقت سے واقف

نہیں۔ غم ہمارے لیے غم کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم غم کے فلسفہ سے بے خبر ہیں۔ اگر ہم رنج و غم کی حقیقت پر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہر تکلیف کسی نہ کسی آرام کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ہر مشکل کسی نہ کسی آسانی کے لیے راستہ صاف کر دیتی ہے۔

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانیؔ
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

مفلسی ہمیں کیوں ستاتی ہے؟ اس لیے کہ ہم امیروں کو دیکھ کر ان کی حالت پر رشک کرتے ہیں۔ ہمارے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہم بھی امیر بنکر دنیا کی گوناگوں نعمتوں سے لطف اٹھائیں۔ یہ رشک اور یہ خواہش ہمارے لیے مفلسی ناگوار بنا دیتے ہیں۔ بخلاف اس کے اگر ہم افلاس کی حالت میں بھی سکون قلب حاصل کرنے کی کوشش کریں تو یہی مفلسی ایک سعادت اور نعمت کا درجہ حاصل کر لے گی۔

بالکل یہی حالت ہے غم اور خوشی کی، تکلیفوں اور آرام کی۔ اگر ہم دوسروں کی خوشی دیکھ کر غمگین ہونا چھوڑ دیں، اپنے ہی غم سے دل بہلانے کا سامان ڈھونڈنے لگیں تو ہمارا غم غم نہیں رہ جائے گا۔ ہماری تکلیفیں تکلیفیں نہیں رہ جائیں گی۔

ایک طاقتور آدمی سے اگر اس کی طاقت چھن جائے تو اسے اس چیز سے دکھ ہوگا ایک دولت مند اپنی دولت سے محروم ہو جائے تو یہ محرومی اس کے لیے یقیناً اندوہ الم کے دروازے کھول دے گی۔ اور وہ شخص جو طاقت سے محروم ہے، دولت سے محروم ہے، لازمی طور پر اس دکھ اور غم سے بھی محفوظ ہے جو طاقت اور دولت کے چھن جانے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ عین اسی طرح وہ شخص جو خوشیوں کو ترک کر کے غم کی عادت ڈال چکا ہے۔ رنج والم کو اپنی روح کی غذا بنا چکا ہے، دنیا کی اکثر مایوسیوں سے بچا رہتا ہے۔ ایسی مایوسیوں سے جن کا دامن ہر خوشی سے بندھا رہتا ہے۔ ایسی مایوسیوں سے جو ہر خوشی کا ضروری نتیجہ اور قدرتی انجام ثابت ہوتی ہیں۔ تبھی تو حضرتِ فانی بدایونی، فرماتے ہیں ؎

غم بھی گذشتنی ہے، خوشی بھی گذشتنی

کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

گویا غم اختیار کر لینے سے غم ختم ہو گیا۔ خوشی کو خیرباد کہنے سے سکون قلب حاصل ہو گیا۔

اس بحث کو ہم ایک اور زاویہ سے بھی لے سکتے ہیں۔ وہ یوں کہ کوئی مشکل اسی وقت تک ایک مشکل بنی رہتی ہے جب تک ہم اس سے گھبراتے ہیں۔ اس سے دور دور رہتے ہیں۔ اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جوں ہی گرد و پیش کے حالات کا کوئی تھپیڑا ہمیں اس مشکل میں ڈال دیتا ہے ہم میں اس مشکل کو برداشت کرنے کے لیے خود بخود ایک نامعلوم سی طاقت آجاتی ہے۔ بالآخر ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جس چیز کو ہم اس قدر مشکل تصور کر رہے تھے وہ اصل میں اتنی مشکل نہ تھی، صرف یہی نہیں اس مشکل میں بھی ایک گونہ راحت بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم ایسی راحت سے محظوظ ہونے کے لیے مشکلوں سے گھبرانے کی بجائے مشکلوں کو دعوت دینے لگتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں پہنچ کر رنج و غم کی حقیقت پر سے لاعلمی کا حجاب اٹھ جاتا ہے۔

انسان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس مصیبت پر رہائی پانے کے بعد بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ خدا نہ کرے اگر اس مصیبت کے ساتھ ہی یا فوراً بعد اس سے بھی بڑی مصیبت آجائے۔ تو وہ اس بعد کی بلا سے نجات حاصل کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کوشش میں پہلی مصیبت کو قریب قریب بھول ہی جاتا ہے۔ اس سے یہ کیفیت واضح ہوتی ہے کہ مصیبتوں کا ہجوم، مصیبتوں کی شدت کو دور کر دیتا ہے، مشکلوں کی زیادتی مشکلوں کا ڈنگ نکال دیتی ہے۔ آلام کی کثرت آلام کو بزم کر دیتی ہے۔

قاعدے کی بات ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی بیماری لاحق ہو جاتی ہے تو وہ

اس بیماری کا علاج ڈھونڈنے کے لیے دربدر مارا پھرتا ہے۔ دن رات اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی اچھی سی دوا مل جائے۔ جو بیماری کو ہمیشہ کے لیے دور کر دے۔ مقام غور ہے کہ کبھی مرتبہ بیماری سے اتنی تکلیف نہیں پہنچتی۔ جسقدر علاج کے لیے مارے مارے پھرنے سے محسوس ہوتی ہے۔ مرض سے بڑھ کر دوا کی تلاش پریشان کرتی ہے اور اگر تھک ہار کر انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مرض لاعلاج ہے تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا ہے۔ ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔ لیکن اس کوفت سے بچ جاتا ہے۔ جو مارے مارے پھرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مجبوری کے عالم وہ علاج و معالجے کے جھنجھٹ سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اپنے مرض کو مرض سمجھنا چھوڑ دیتا ہے۔ اِس حقیقت کو مرزا غالب نے ایک مصرعے میں یوں ادا کیا ہے۔ ؎

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اسی حقیقت کو دوسرے پیرائے میں بیان کرنا ہو تو کہا جائے گا ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

ایک حادثہ

گرمیوں کے دن تھے۔ اور اسکول و کالج لمبی تعطیلات کے لیے بند ہونے والے تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں نے مل کر اپنے چچا صاحب کے ہاں ان تعطیلات کا کچھ حصہ گزارنے کا پروگرام بنایا اور اتفاق رائے ہونے پر چچا صاحب کو اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ جیسے ہی چھٹیاں ہوئیں۔ ہم مع ساز و سامان کراچی کے لیے عازم سفر ہوئے۔ رات بھر طرح طرح کے منصوبے سیر و تفریح کے بنائے گئے کیونکہ مدت سے دل میں کراچی دیکھنے کی آرزو جو کروٹیں لے رہی تھی اب اس کی تکمیل ہو رہی تھی۔ ہر ایک اپنی رائے کو دوسرے کی رائے پر

فوقیت دینے کی کوشش میں سرگرم تھا کسی کا خیال تھا کہ پہلے قائد اعظم کے مزار پر جائیں کوئی کہتا تھا کہ پہلے منوڑہ کی سیر ہو جائے۔ کچھ بضد تھے کہ پہلے گاندھی گارڈن چلیں۔ چھوٹے بھائی نے شور مچا مچا کر اپنا مطالبہ منوانے کی کوشش کی کہ ہم سب سے پہلے پاکستانی بحری بندرگاہ کو دیکھیں گے۔ بہت سوچ بچار کرنے کے بعد ہم سب نے چھوٹے کی دل شکنی مناسب نہ خیال کرتے ہوئے اس کی بات مان لی ویسے بھی چچا جان پریس کے محکمہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور ان کا بڑا بیٹا پاکستانی بحریہ میں ایک افسر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس لیے پاکستانی جہازوں کی قیام گاہ تک جانا اور ان کو دیکھنا ایسا مشکل کام نظر نہ آتا تھا۔ خیر ہم سب نے اس کو یقین دلایا کہ سب سے پہلے اسی جگہ کی سیر کریں گے جہاں تم چلنا چاہو گے۔ ہمارا تمام سفر بخیر و خوبی گزر گیا۔ اگلے روز بعد دوپہر کراچی پہنچے تو چچا جان ہماری آمد کی اطلاع مل جانے پر ہمیں سٹیشن پر لینے کے لیے موجود تھے۔ وہ نہایت شفقت اور محبت سے ہم سب کو اپنے ہاں لے گئے تو ان کے چھوٹے بچوں نے جو کئی روز سے ہم لوگوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں چچا صاحب کے ہمراہ آتے دیکھ کر خوب غل غپاڑہ کیا اور ہمارا پیچھا اس وقت چھوٹا جب کہ چچا جان کی بھاری بھرکم آواز گونجی "ارے بچو! تم ان کو نہا کر فارغ ہو جانے دو پھر دل کی باتیں کرنا۔" اباجان کی آواز سن کر ذرا چھوٹے میاں بھی سنجیدہ ہو گئے اور ہمیں اپنے ہوش درست کرنے کا وقت مل گیا۔ شام کو چائے سے فارغ ہو کر سب باہر گھاس کے میدان میں بیٹھ گئے اور اگلے دن کے لیے منصوبے باندھے جانے لگے۔ جب ہمارے چھوٹے بھائی نے سب کے سامنے اپنی پہلی تجویز دہرائی تو سب چھوٹے بڑے اس سے متفق ہو گئے۔ لہٰذا اپنے ارادے کی اطلاع چچا جان کو دے دی گئی اور انھوں نے بھی ہمیں پورٹ دکھانے کا وعدہ کیا۔

صبح صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر تیار ہوئے اور خوشی خوشی باہر نکلے مگر آہ! ہماری یہ خوشی کس طرح خاک میں ملی کچھ نہ پوچھیے۔ آپ شاید اتنا تو جانتے ہیں کہ کراچی میں

رٹریفک بہت زیادہ ہے۔ بس یہی رٹریفک ہماری خوشیوں پر اوس ڈال گئی۔ ہوا یہ کہ چچا جان کا منجھلا لڑکا بابر جو ذرا حد سے زیادہ شیطان واقع ہوا تھا سڑک پار کرتے ہوئے ہم سے پیچھے رہ گیا اور ہم سب دوڑ کر چچا جان کی حسب ہدایت ان کے ساتھ مل گئے۔ جب چچا جان نے لوٹ کر دیکھا۔ تو اسے آواز دے دی۔ بابر جلدی سے سڑک پار کرکے آجاؤ اور بابر نے جیسے ہی دوڑ کر سڑک پار کرنے کی کوشش کی ادھر سے ایک تیز رفتار بس نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اُف! بس کے نیچے کچل کر اس کے جسم کا نچلا حصّہ بالکل قیمہ بن چکا تھا اور ہم سب اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔ بابر بالکل بے ہوش ہو چکا تھا مگر زندگی کی رمق باقی تھی۔ چچا جان کا رنگ فق تھا۔ وہ دوڑ کر سڑک پر پہنچے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے جسم کو سمیٹ کر گود میں اٹھا لیا اور ہمارا یہ افسردہ قافلہ بجائے بندرگاہ دیکھنے کے ہسپتال کی طرف جا رہا تھا۔ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے بابر کی ٹانگوں پر پلاسٹر لگا دیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ زندگی بچنی محال ہے۔ ہم سب حیران و پریشان چچا جان کو وہاں چھوڑ کر اس حادثہ کی اطلاع دینے گھر آئے بس کچھ نہ پوچھیے۔ بے چاری چچی کا برا حال تھا۔ فوراً ہی تیار ہو کر وہ ہسپتال آئیں اس وقت بچے کو قدرے ہوش آچکا تھا۔ باپ نے بڑھ کر بیٹے سے اس کا حال دریافت کیا۔ بابر نے بولنے کی کوشش کی مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ باپ اگرچہ نہایت ضبط سے کام لے رہا تھا مگر کوشش کے باوجود روئے بغیر نہ رہ سکا۔

اگلے روز بابر اپنے معبود سے جا ملا مگر ماں باپ کے ساتھ ہی ہمیں بھی اس جان کا حادثہ میں ان کا برابر کا شریک بنا گیا۔ اور ہم جن آرزوں اور ارمانوں سے کراچی سیر کرنے گئے تھے وہ خاک میں مل گئے۔ اب جب بھی کراچی جانے کا خیال آتا ہے تو وہ حادثہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

حُبُّ الوطنی

تخلیق کائنات کے دو اجزا نہایت اہم ہیں۔ ایک آسمان اور دوسرا زمین۔ آسمان ارفع اور روحانی قدروں کا نمائندہ ہے اور زمین مادی اقدارِ حیات کی حامل ہے۔ اس لیے بعض صوفیا کے نزدیک آسمان زمین سے بہتر ہے، لیکن ایک اسلام ایسا مذہب ہے۔ جو معتدل اقدارِ حیات کا داعی ہے۔ ہمارے مذہب کے نقطۂ نظر سے زندگی روحانی اور مادی قدروں کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ چنانچہ ہمارے نظام حیات میں زمین کو بھی اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی آسمان کو، رسول اکرم صلعم نے فرمایا "حب الوطن من الایمان" یعنی وطن کی محبت جزو ایمان ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جو کوتاہ اندیش سرد مہر اس دھرتی سے محبت و وفا نہیں کرتا، جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا ہے، وہ کائنات کی کسی بھی دوسری چیز سے اعلیٰ اور سچی محبت نہیں کر سکتا۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جیسے کسی صورت میں نہیں دبایا جا سکتا۔ یہ ایک سدا بہار پھول کی مانند ہے جس کی تازگی اور شگفتگی ہر موسم میں برقرار رہتی ہے۔ چنانچہ ہر زمانے کے دانشور، ادیب اور شاعر اس پاکیزہ جذبے سے سرشار و مست رہے ہیں اور وطن کی محبت کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ فن کے شاہکار کی حیثیت حاصل کر گیا ہے۔ حُب وطن کے متعلق فارسی زبان کے ایک مشہور شاعر کے یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

حب وطن از ملک سلیمان خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بملک مصر شاہی می کرد
مے گفت گدا بودن کنعاں خوشتر

حُب وطن کے مقدس جذبے کو کیتنے خوب صورت انداز میں ظاہر کیا ہے۔

شاعروں اور دانش وروں پر ہی یہ منحصر نہیں ہے بلکہ ہر شخص خواہ وہ تہذیب یافتہ ہو، متمدن ہو اور عالم و فاضل ہو یا تہذیب و تمدن سے محروم اور علم و فضل سے بے بہرہ، اپنی مادر وطن سے محبت کرتا ہے اور کرنا بھی چاہیے۔ لیکن وطن سے محبت کرنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دوسرے ممالک کے افراد سے نفرت کی جائے۔ خصوصاً ہمارے مذہب اسلام نے اس کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ اس کی ایک منطقی وجہ یہ ہے کہ کل روئے زمین بھی ایک طرح کا وسیع و عریض وطن ہے اور اس پر بسنے والے افراد ایک دوسرے کے ہم وطن ہیں۔ نیز حب وطن اور نظریۂ وطنیت کے درمیان تمیز کرنا بھی ضروری ہے۔ حب وطن سے مراد یہ ہے کہ انسان اس خطۂ زمین سے پیار کرتا ہے۔ جس پر اس نے جنم لیا ہے اور جس کی خوب صورت فضاؤں میں اس نے پرورش پائی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی اور فطری جذبہ ہے۔ اس کے مقابلے میں وطنیت ایک سیاسی نظریہ ہے۔ اس نظریے کے حامل افراد محض اپنے وطن سے محبت نہیں کرتے بلکہ ایک طرح کے مفروضہ برتری کے جذبے سے سرشار ہو کر دوسری اقوام عالم سے نفرت کرتے ہیں۔ اور ان کو مطیع و محکوم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں عظیم لڑائیوں کی ایک بڑی وجہ بھی یہی بے جا جذبۂ افتخار تھا۔ ایسے مکروہ جذبات و خیالات سے اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھنا نہایت لازمی ہے۔ اسلام کا اخلاقی درس بھی یہی ہے کہ دنیا کے سب مسلمانوں (انسانوں) سے محبت کی جائے اور ان کے اخلاق و ایمان کی اصلاح کی جائے۔ علامہ اقبال نے اسی وجہ سے "وطنیت" کے نظریے کی بھرپور مخالفت کی تھی کیوں کہ وطنیت کا لبادہ انسانیت کے لیے کفن ثابت ہو سکتا ہے۔ وطنیت کے نظریے کے حامل افراد کا انداز نظر محدود اور ان کے سوچ کا اسلوب نہایت پست ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وطن سے محبت کرنے والے اصحاب کے قلب و ذہن میں بڑی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ خلوص و وفا کے اس کیف آفریں جذبے سے سرشار ہو کر وہ انسانیت کی بنیادی اقدار کو بھول نہیں جاتے بلکہ اس عالم

بے خودی میں دوسروں کو بھی گلے لگا لیتے ہیں۔

"حب وطن کے پاکیزہ جذبات کے لیے موزوں انداز کیا ہے؟" یہ سوال ذی شعور انسان کے فکر کا محور و مرکز رہا ہے اور اس نے جذب و عمل کے مختلف اسباب کو جنم دیا ہے۔ حب وطن کا سادہ ترین معیار تو یہ ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس سے اپنے وطن کی عظمت پر ہلکی سی آنچ آنے کا بھی خدشہ ہو اور ہر لمحہ یہ کوشش کی جائے کہ ہم اپنے مثبت انداز فکر و عمل سے ملک و وطن کی ہمہ جہتی پیش رفت کا باعث بنیں۔ ہم سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو سیاسی لحاظ سے وطن کی سلامتی کے خلاف ہو اور جس سے اغیار فائدہ اٹھا سکتے ہوں۔ کیوں کہ سیاسی انتشار اور بدنظمی وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے خلوص قلب سے کوشش کرنی چاہیے کہ ملک میں سیاسی استحکام جنم لے کیوں کہ اس کے ذریعے ملک عظمت و رفعت کے تمام مدارج بکمال سرعت طے کر لیتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے بھی وطن کے مجموعی مفاد کو ہر وقت پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ذاتی منفعت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے اور ذرہ بھر مادی نفع بھی پست فطرت انسانوں کو اعلیٰ و ارفع اقدار حیات سے محروم کر دیتا ہے۔ یہاں نازک مواقع آدمی کے جذبۂ حب الوطنی کی پرکھ کا باعث بنتے ہیں۔ اونچے درجے کے انسان اپنے وطن کے مجموعی مفاد پر اپنا سب کچھ نثار کر دیتے ہیں۔ سماجی لحاظ سے بھی وطن کی جمیل اور ارفع اقدار کی پائداری لازمی ہے۔ تخریب پسند عناصر سماجی انتشار کی وساطت سے ملک و وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ ان سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیئے۔ نہ صرف خود صالح و مثبت معاشرتی معیاروں کو اپنانا چاہیے بلکہ مستحکم اور فعال معاشرے کے قیام کے لیے بلند سماجی قدروں کی تہذیب و ارتقاء کے لیے بھی دل و جان سے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔ ان سب امور کی تبلیغ و تلقین کا موثر ذریعہ فنون لطیفہ ہیں۔ چنانچہ ثقافت کے تمام شعبوں میں بھی اظہار و ابلاغ کے ایسے وسائل کو برتنا چاہیے جن سے حب الوطنی کے جذبات فروغ پذیر ہوں اور وطن

دشمن عناصر کی حوصلہ شکنی ہو۔ ایسی تحریر و تخلیق کا سختی سے محاسبہ کیا جائے جس میں وطن دشمنی کا ہلکا سا بھی شائبہ ہو۔ غرض ہر لحاظ سے وطن کو مقدم رکھنا چاہیے اور اس کی عظمت کے لیے ہر وقت اور ہر جگہ مصروف عمل رہنا چاہیے۔ بقول علامہ اقبالؔ خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھتے ہوئے وطن کی تقدیروں کو ہر لحاظ سے برقرار رکھا جائے اور اس کی ناموس و بقا کے لیے اپنی جانیں تک قربان کرنے سے دریغ نہ کیا جائے۔ خوش بختی سے ہمارے ملک میں حب وطن کی ایک درخشندہ روایت بھی موجود ہے۔ اس سے ہماری مراد ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہے۔ جس میں وطن کے جیالے سپوتوں نے اپنے لہو کی سرخی سے تاریخ کا وہ باب لکھا ہے جس پر نہ صرف ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ بلکہ جو اقوام عالم کے لیے درس بصیرت کا سبب بھی ہوگا۔ اس معرکۂ حق و باطل میں وطن کے ہر فرزند نے اپنے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ خصوصاً بری، بحری اور ہوائی افواج کے بہادر نوجوانوں نے وطن عزیز کے تحفظ و بقا کے لیے جو شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں تاریخ عالم میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

ٹیلی ویژن

بے تار خبر رسانی (وائرلیس) کے حیرت انگیز کمالات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اب انسانوں کا، جانوروں کا، بے جان اشیاء کا اور تصویروں کا عکس ہزاروں میل کے فاصلے کے باوجود ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے اور ایک سفید پردے پر اس طرح دکھایا جا سکتا ہے جیسے سینما میں پردے پر تصویریں نظر آتی ہیں مثلاً لندن میں کوئی شخص تقریر کر رہا ہو تو ہم اس کی چلتی پھرتی تصویر، اس کے ہاتھوں، ہونٹوں اور چشم و ابرو کی ہوبہو حرکتوں کو ریڈیو کے ذریعے اپنے

گھر بیٹھے ایک پردے پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس ایجاد کا نام ٹیلی ویژن ہے۔

اس تصویر کے ساتھ ہی اس شخص کی آواز بھی منتقل ہو جاتی ہے۔ جب تصویر اس کی حرکات اور آواز بیک وقت ہم تک پہنچتی ہیں تو پھر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم تصویر دیکھ رہے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ شخص ہمارے سامنے کھڑا باتیں کر رہا ہے۔ حالانکہ اس شخص کو ہماری خبر تک نہیں ہوتی۔

یہ عجیب و غریب آلات صورت اور آواز کو سیکڑوں میل کی دوری پر منتقل کر دیتے ہیں۔ ان کے موجد جان ایل برڈ نے ان کی پوری کیفیت بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں ٹیلی ویژن کے تجربات کے دوران پہلی مرتبہ اس طرح عکسی تصویر دیکھنے میں ۱۹۱۵ء میں کامیاب ہوا۔ میں ایک کمرے میں ایک بڑی سی گڑیا رکھ کر ٹیلی ویژن کا تجربہ کر رہا تھا کہ یکایک گڑیا کی تصویر پردے پر صاف نظر آگئی۔ میں نے جوش مسرت میں کمرے سے باہر نکل کر اپنے ملازم لڑکے کو پکڑا اور اسے گڑیا کی جگہ بٹھا دیا۔ پہلے تو وہ ڈرا لیکن میں نے انعام دے کر راضی کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے کمرے میں پہنچا تو اس لڑکے کی ہو بہو تصویر پردے پر منعکس نظر آئی۔ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک انسان کا چہرہ ٹیلی ویژن کے ذریعے ایسی جگہ منتقل کیا گیا جہاں وہ موجود نہ تھا۔ اس کامیابی پر مجھے اتنی مسرت ہوئی جس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ اس کے بعد وہ مبارک تاریخ آئی جس دن دنیا نے زندہ اور متحرک انسانوں کی تصویریں ٹیلی ویژن کے ذریعے منعکس ہوتے ہوئے دیکھیں اور سائنس دانوں کا ایک حسین خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔ اس کے بعد بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی جاتی رہی یہاں تک کہ فروری ۱۹۲۸ء میں پہلے پہل لندن میں ٹیلی ویژن لگا کر امریکہ میں پردے پر تصویریں منتقل کی گئیں اور بحر اوقیانوس کو عبور کر کے ٹیلی ویژن نے عکاسی کا کرشمہ دکھایا۔ یہ تصویریں ریڈیو میں تصویریں فٹ کر دینے سے منعکس ہوئیں اور جو لوگ شہر نیویارک میں ریڈیو کے سامنے پردہ لگا کر دیکھ رہے تھے انہوں نے لندن کے

بولنے والوں کی تصویریں کو نمایاں اور صاف طور پر پردے پر دیکھا۔ مگر اس وقت صرف تصویر منتقل ہوئی تھی، ابھی ان کی آوازوں کا منتقل ہونا باقی تھا۔ چنانچہ شب و روز کی انتھک کوششوں کے بعد آواز کو بھی منتقل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اس کے لیے وائرلیس کے دو آلے استعمال کیے گئے۔ ایک کے ذریعے تصویریں منعکس ہو گئیں اور دوسرے کے ذریعے آوازیں منتقل ہوئیں۔

جولائی ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلی مرتبہ تھیٹر کے سٹیج پر دوسرے ممالک کے رقص سرود اور ناٹک کا پورا پورا پروگرام ٹیلی ویژن اور فونو ویژن کے ذریعے لندن میں دکھایا گیا جس کو دیکھ کر شائقین بہت متاثر ہوئے اور ماہرین فن نے بھی اس ایجاد پر مبارک باد دی۔

ریڈیو کی طرح یہ ایجاد بھی جو دراصل ریڈیو ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے، بے حد مفید ہے۔ باتوں باتوں میں تعلیم دینا اور بولنے والے کی تصویر و حرکات کا بچشم خود مشاہدہ کرنا ایک ان مٹ تاثر چھوڑتا ہے اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ تعلیمی لحاظ سے یہ ایجاد نہایت فائدہ مند ہے۔

ابھی اس ایجاد نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ پھر بھی انگلستان، امریکہ اور دوسرے ممالک میں اس کا رواج عام ہے۔ پاکستان میں بھی اس سے متعلق تجربات کیے جا رہے ہیں، لاہور میں ایک ٹیلی ویژن سٹیشن قائم کیا گیا ہے لیکن وہ محدود سطح پر کام کر سکتا ہے۔ بیرون لاہور رہنے والے لوگ اس سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ لیکن اتنے قلیل عرصے میں پاکستان میں ٹیلی ویژن نے جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ ترقی پذیر ممالک کے لیے قابل رشک ہے۔ دور حاضر کے اس مؤثر وسیلۂ اظہار و ابلاغ اور تفریح کی مقبولیت کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ شہر کے ہوٹلوں، قہوہ خانوں اور ثقافتی مراکز میں دن ڈھلتے ہی ٹیلی ویژن کے شائقین جمع ہونے لگتے ہیں اور پھر یورپ کے ترقی یافتہ ممالک کی مانند اہل لاہور بھی ٹیلی ویژن کے متنوع پروگراموں

سے استفادہ کرتے ہیں اور پھر یورپ کے "ترقی یافتہ" ممالک کی مانند اہل لاہور بھی ٹیلی ویژن کے متنوع پروگراموں سے استفادہ کرتے ہیں۔ خبریں، ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کی صوتی و عکسی روداد، ڈرامے، فیچر، فلمیں، موسیقی، شخصیتوں سے تعارف، مختلف موضوعات پر مذاکرات، بچوں اور خواتین کے تفریحی و اصلاحی پروگرام، حالات حاضرہ اور دیگر موضوعات وغیرہ کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں جن سے ناظرین اہم معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

سائنس کی موجودہ ترقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب ٹیلی ویژن ہمارے ملک میں عام ہو جائے گا اور گھر گھر یہ پروگرام سنے اور دیکھے جا سکیں گے۔

ملکی تعمیر میں خواتین کا حصہ

آج سے کچھ عرصہ پہلے شاید یہ بات کچھ مضحکہ خیز معلوم ہوتی کہ عورتیں بھی ملکی تعمیر و ترقی میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس زمانے میں عورت قدیم روایات و قیود میں کچھ اس طرح جکڑی ہوئی تھی کہ اس کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں اور یہ احساس کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی اور اس کا کام محض گھرداری ہے اس کے تمام اوصاف کو زنگ آلود کر رہا تھا۔ مرد اسے ناقص العقل تصور کرتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ وہ قدرتی طور پر ذہانت میں مردوں سے کمتر ہے۔ مرد عورت کا ایک حد تک احترام ضرور کرتے، مگر صرف ماں بیٹی یا بہن کے روپ میں۔ وہ عملی طور پر زندگی کی ہماہمی میں حصہ لے، یہ ان کو گوارا نہ تھا ؎

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن!\
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

مگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورت کسی طرح بھی ذہانت یا شعور میں مردوں سے کمتر نہیں۔ البتہ اس کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا۔ لیکن جب کبھی عورتوں کو مواقع میسر آئے، انہوں نے ثابت کر دیا کہ زندگی کے ہر میدان میں مردوں ہی کی طرح اہم کام سرانجام دے سکتی ہیں۔ حضرت عائشہؓ حضرت خدیجہؓ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، چاند بی بی، رضیہ سلطانہ کو قوم کیسے فراموش کر سکتی ہے۔ جنہوں نے ثابت کر دیا کہ عورت بہترین حکمران ثابت ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم خواتین میں مادام کیوری کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا، جھانسی کی رانی کا سرفروشانہ جذبہ آج بھی تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ گزشتہ صدی کے اواخر اور اس صدی کے آغاز کی عظیم خاتون، عطیہ فیضی کے وہ بصیرت افروز لیکچر ہمیشہ یاد رہیں گے جو انہوں نے غیر ممالک میں جا کر دیے اور جن کی دانش اور شعور کے مداح شبلی نعمانی اور اقبال جیسی ہستیاں ہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والی خواتین میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ محترمہ کو کون بھول سکتا ہے۔ جن کی ولولہ انگیز تقریروں نے قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

مگر یہ مثالیں خال خال نظر آتی ہیں۔ وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے کہ عورت کو مواقع ہی میسر نہ تھے کہ وہ ملکی کاموں میں حصہ لے۔ پاکستان بننے کے بعد قوم کو اس بات کا احساس ہوا کہ ان کی نصف آبادی تو بالکل عضو معطل اور بے کار ہے۔ چنانچہ عورتوں کی تعلیم وتربیت کی طرف بھی خاص توجہ دی جانے لگی۔ تعلیم یافتہ خواتین نے عملی اقدام کیا اور مختلف تحریکوں سے پاکستانی خواتین میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اپوا
(All Pakistan Women Association)
ان تحریکات میں پیش پیش ہے۔ اس کے بانی لیاقت علی خاں کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ یہ تحریک بہت کامیاب رہی اور آج اپوا کی شاخیں ملک کے کونے کونے اور بڑے بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ اس انجمن کا قیام پاکستانی خواتین کے مسائل

حل کرنا اور ان کی حالت بہتر بنانا ہے۔ چنانچہ کئی سکول، کالج اور صنعتی ادارے اسی انجمن کے تحت کام کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ریڈ کراس دوسری بڑی تحریک ہے جس کی صدر بیگم وقار النساء نون ہیں۔ یہ تنظیم عالمگیر حیثیت رکھتی ہے اور اس کا مقصد دکھی انسانیت کو آسائش مہیا کرنا اور ان کی تکالیف دور کرنا ہے۔ اس تحریک میں مرد اور عورتیں یکساں شریک ہوتے ہیں مگر جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے۔ عورتیں اس کی زیادہ مستعد اور سرگرم کارکن ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک و بھارت جنگ کے دوران میں جس طرح ریڈ کراس اور اپوا کی کارکنوں نے کام کیا، ان کی کارکردگی بہترین مثال ہے۔

ہنگامی حالات میں خاص طور پر خواتین کا رجحان فوجی تربیت، نرسنگ اور شہری دفاع کی طرف ہو گیا اور آج تک اس شوق کی شدت میں کمی نہیں آئی۔ مختلف اداروں میں اب بھی ایسی تربیت دی جا رہی ہے تاکہ بوقت ضرورت خواتین اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ قوم و ملک کی خدمت بھی کر سکیں۔ اس کے علاوہ ٹی بی ایسوسی ایشن اور خاندانی منصوبہ بندی میں بھی عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

یہ تو تھیں خواتین کی اجتماعی کاوشیں کہ وہ کس طرح مختلف تنظیموں کے تحت عمدگی سے اپنے فرائض نبھاتی ہیں اور صورت حال کا مقابلہ کرتی ہیں مگر جہاں تک ان کے انفرادی حالات کا تعلق ہے وہ آج اس وقت سے بدرجہا بہتر ہے، جب پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ اس وقت بہت کم لوگ اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانے پر مائل نظر آتے تھے کیونکہ ان کی نظر میں عورت کے فرائض محض گھر تک محدود تھے اور اس کے لیے وہ معمولی سی تعلیم کو کافی تصور کرتے تھے۔ عورت کی ملازمت تو ان کے نزدیک توہین کے مترادف تھی۔ آزادی کے بعد قوم کو احساس زیاں ہوا۔ چنانچہ عورتوں کی تعلیم کی طرف بھاری توجہ دی جانے لگی۔ حکومت نے الگ تعلیمی اداروں کا بھی بندوبست کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی مسلمان قوم جس میں تعلیم یافتہ خواتین

حال خال نظر آتی تھیں آج زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں نظر آنے لگیں۔ ڈاکٹری اور نرسنگ کے علاوہ بہت سی خواتین تعلیمی اداروں سے وابستہ ہیں اور نونہالانِ وطن کی آبیاری کر کے ان کو وطن کی خدمت کے لیے تیار کر رہی ہیں اسی طرح مختلف دفاتر میں خواتین مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں اور اپنی محنت اور کارکردگی سے ثابت کر چکی ہیں کہ وہ کسی طرح مردوں سے کم نہیں۔ بینکاری میں خواتین اس درجہ بہترین منتظم ثابت ہوئی ہیں کہ اب بینکوں کی الگ شاخیں خواتین کے لیے کھولی گئی ہیں۔ عدالتوں میں بھی خواتین نظر آتی ہیں۔ خواتین وکیل بھی ہیں۔ بیرسٹر بھی، مجسٹریٹ بھی اور جج بھی۔ وہ اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا چکی ہیں

صحافت کے میدان میں بھی عورتیں مردوں سے کم نہیں اور اسی طرح وہ ملک و قوم کی خدمت میں شب و روز گامزن ہیں۔ آج ملک کے کئی بڑے بڑے اخبارات اور رسالے خواتین کی زیرِ نگرانی شائع ہو رہے ہیں۔

پاکستان کی مشہور ہوائی سروس پی۔ آئی۔ اے میں میزبانی کے فرائض بھی خواتین ادا کرتی ہیں۔ سیاست میں وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ یونین کونسلوں کی ممبری سے لے کر قومی اسمبلی تک میں عورتیں نامزد و منتخب ہوتی ہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی تعمیر و ترقی میں خواتین کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ مردوں کا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عورتوں کے فرائض مردوں کے فرائض سے مشکل تر ہیں۔ مردوں کو تو فقط گھر سے باہر کے فرائض کو نبھانا ہوتا ہے جب کہ آج کل تعلیم یافتہ عورتیں معاشی طور پر خاوند کی مددگار ہونے کے ساتھ ساتھ خود ان کے آرام کا خیال، گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش ایسے فرائض سے بھی عہدہ برآ ہوتی ہیں اور اس کا ان کو مکمل احساس ہوتا ہے کہ ان کے بچے قوم کی امانت ہیں جن کی بہتر طور پر نگہداشت کرنا اور ان کو مستقبل کا بہترین شہری بنانا ان کا دینی فرض ہے۔ اس طرح گویا عورتیں صحت مند معاشرے

بانی کہلانے کی مستحق ہیں۔

پروفیسر شمیم عزیز

احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

انسان، اشرف المخلوقات ضرور ہے اور دنیا کی ہر ایک شے کو قابو میں کر کے اسے خاطر خواہ انداز پر ڈھال لیتا ہے۔ لیکن ماحول کے اثر سے خود بھی آہستہ آہستہ بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کے وجود، عادات اور احساسات میں بڑی لچک ہے اور اسی وجہ سے وقت اور ماحول کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ یہ چیز اس کی فطرت میں اس قدر رچی بسی ہوئی ہے کہ بعض حالتوں میں یہ خود کو نہ بدلنا چاہے یا اپنے جذبات و احساسات کی تبدیلی پر تحمل تا بھی ہے تب بھی تبدیلی کا عمل اس پر طاری رہتا ہے۔ مثلاً مشینی دور اور صنعتی انقلاب نے انسانیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ سماجی ڈھانچے بدل گئے۔ دانش وروں نے ان اثرات کو محسوس کیا۔ چنانچہ اقبال بھی اپنی مشہور نظم "لینن خدا کے حضور میں" لینن کی زبانی اس صورت حال کا اظہار یوں کراتے ہیں۔ ؎

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اس شعر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اگرچہ مشینوں کی ایجادات اور استعمال سے انسان نے مادی ترقی بہت زیادہ کر لی ہے مگر سائنسی دور نے خود انسان کو بھی مشین کی طرح بے حس کر دیا ہے۔ اس کے دل میں اب وہ سوز، دل گدازی اور محبت نہیں رہی جو مشینی دور سے پہلے تھی۔ غربت، جہالت، بیماری اور بے روزگاری، مادیت پرستی ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے ہم سے احساسِ مروت چھین

لیا ہے اور مشینوں کا کاروبار یوں بڑھا ہے کہ انسانوں کی قدر و منزلت کم ہو گئی ہے۔

ہم نے مشینی دور سے پہلے کا زمانہ نہیں دیکھا لیکن تاریخی واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ پہلے دور میں لوگوں میں خلوص و ایثار کا جذبہ موجود تھا کہ آج اس کا عشر عشیر بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ایک مسلمان لڑکی اپنے بھائیوں کو مدد کے لیے پکارتی تو مسلمانوں کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی اور وہ یلغار کرتے ہوئے دشمن کو پامال کر دیتے۔ فتح سندھ کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اس کے برعکس اس مشینی دور میں وہ غیرت و حمیت کہاں گئی؟ آج واقعات ہمارے سامنے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ مشینوں کی ترقی نے انسانیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اخلاقی اقدار مٹتی جا رہی ہیں۔ آج نہ بھائی بھائی رہا ہے اور نہ دوست دوست۔ ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

سائنس والے کہتے ہیں کہ موجودہ دور ترقی انسانیت کا دور ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک دھوکہ ہے۔ یہ ایٹم بم اور زہریلے ہتھیار انسانیت کو تباہ کرنے کے لیے ایجاد ہوئے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کو یاد کر کے دل تھرا اٹھتے ہیں۔ ؎

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

سائنس دان کہتے ہیں کہ انسانی عقل انتہائی بلندیوں پر پہنچ رہی ہے مگر ایک حساس انسان اس کو "جہل خرد" کہہ کر پکارتا ہے۔ ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

آج ہم دیہات میں جاتے ہیں جہاں کی معاشرت پر بہ قول اقبال غازۂ رنگ تکلف کے داغ نہیں پڑے ہیں اور سائنسی آلات نے لوگوں کا خون سفید نہیں کر دیا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ مجموعی طور پر ایک جسم و جاں رکھتے ہیں۔ ان سب کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ کسی ایک آدمی کا دکھ سارے گاؤں والوں کا دکھ بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس کسی بڑے مشینی شہر میں جایئے۔ سب سے پہلے کاروں کا دھواں اور پیٹرول کی بدبو دل و دماغ کو پریشان کر دے گی۔ ہر قدم پر جان جانے کا ڈر کسی مرگھٹ کے بھوت کی طرح آپ کو لپٹ جائے گا۔ کوئی شناسا مل بھی جائے تو یوں نظریں چرائے گا جیسے وہ کبھی آشنا نہ تھا۔ نفسانفسی کا عالم ہے۔ ہر ایک اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ بے نیازی کا یہ عالم کہ برسوں ایک پڑوسی کی دوسرے سے ملاقات نہیں ہوتی۔ باپ اپنی راہ جاتا ہے بیٹا اپنے سکوٹر کی راہ۔ کسی کو کسی سے محبت نہیں ہے۔ وہ صورتیں کہاں نظر آئیں گے جن کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہوتا تھا۔

ان حالات و واقعات کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہمارے دل سے یہ آواز کیوں نہ نکلے۔

ع   خداوندا بتا تیرے جہاں کو کس طرح بدلیں

اور اس بے چینی، بے مروتی اور بے نیازی کو مشینی دور کی پیداوار کیوں نہ سمجھیں جس میں انسان خود بھی ایک کل کا پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ اقبال نے سچ ہی تو کہا تھا

سہ   ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت

(پروفیسر عباسی)

قومی زبان ـــــ اُردو

پاکستان کے باشندوں کے لیے اُردو کی حیثیت قومی زبان کی ہے۔ اس لیے اسے ذریعہ اظہار کا وسیلہ ہونا چاہیے۔ قومی زبان کے بعد ہماری فکری زندگی کے لیے جن زبانوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اس میں عربی اور فارسی کی اہمیت مسلّم ہے۔ ہم مغربی علوم اور مغربی زبانوں سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ اب یہ ہمارے ماہرین تعلیم کا کام ہے کہ ہماری تعلیمی زندگی میں زبانوں کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے عربی اور فارسی کو ان کا حق عطا کریں۔ اس سے اردو کی حیثیت بھی مضبوط ہوگی اور پاکستان کے باشندوں کی ذہنی تربیت بھی صحیح خطوط پر ہو سکے گی۔ جب ہم اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دلانا چاہتے ہیں تو ہمارے نزدیک اُردو کے لیے وہ مقام ہے جو اب تک انگریزی نے حاصل کر رکھا ہے۔ کاروباری، معاشرتی، دفتری اور ادبی معاملات میں انگریزی کی جگہ اُردو کو حاصل ہونی چاہیے۔ لیکن اردو کو اس کا اس کا جائز حق اس وقت ملے گا۔ جب ہماری ذہنیت بدلے گی۔ ہم نے نیا ملک تو حاصل کر لیا ہے لیکن تین سو برسوں کی غلامی نے ذہنوں میں تقلید کا جو بیج بو دیا ہے وہ ابھی تک پھل رہا ہے۔ بعض لوگ اردو میں اپنا نام تک لکھنا گوارا نہیں کرتے۔ معاشرتی زندگی میں ہر وہ آدمی جو انگریزی میں خط و کتابت نہیں کرتا۔ شائستہ مجالس میں انگریزی بولنے سے گریز کرتا ہے اُسے غیر مہذب سمجھا جاتا ہے۔ کاروباری زندگی میں بھی خط و کتابت انگریزی میں کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ انگریزی لکھنا پڑھنا شائستگی کی علامت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اردو زبان کو گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ دوکانوں کے سائن بورڈ بھی انگریزی میں لکھے جاتے ہیں چاہے گاہکوں میں صرف دس فیصدی ان بورڈوں کا مفہوم اور مطلب سمجھتے ہوں۔ غلامی کی زندگی اپنی ہر چیز کو گھٹیا

اور ان کی ہر چیز کو گراں بنا دیتی ہے۔ اس کے لیے عام معاشرتی سطح پر پوری جد و جہد کی ضرورت ہے کیونکہ اس طرح کے رجحانات کے برقرار رہنے سے آزادی کے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔ نجی اور گھریلو زندگی میں بھی ہمیں اپنی ملکی زبان کو اس کا مناسب مقام دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ ہر ملکی زبان کو اس کا مناسب مقام دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ ہر ملکی زبان کا فطری حق ہے۔ اس طرح تعلیم میں بھی اردو کی قومی حیثیت کو برقرار اور بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کا زبانی اقرار کافی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی نظام تعلیم میں اردو زبان کو رائج کرنے سے ہمارے دفتری نظام کی بڑی حد تک اصلاح ممکن ہے۔ اس مرحلے پر شاید یہ بات بھی بے موقع نہ ہوگی کہ انگریزی اور دوسری آریائی زبانوں میں سائنسی موضوعات ادب اور معاشرتی علوم میں بے اندازہ ترقی ہو رہی ہے۔ ہمیں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انگریزی زبان کی تدریس باقی رہنی چاہیے۔ اردو کی حمایت میں جب کچھ کہا جاتا ہے تو اسے لازماً انگریزی کی مخالفت سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ صورت حال ممکن نہیں۔ ہم انگریزی کو یہاں ذریعہ تعلیم رکھنے کے مخالف ہیں انگریزی کی تعلیم کے مخالف نہیں زبان کی تدریس اور بات ہے۔ لیکن اسے ذریعہ تعلیم بنا لینا بالکل جدا چیز ہے۔ یہ تبدیلی ظاہر ہے بعض مسائل سے دوچار کرتی ہے۔ اصطلاحات کا مسئلہ، نصابی کتب، کا مسئلہ، ٹائپ کا مسئلہ رسم الخط کا مسئلہ یہ بھی مسائل اپنی جگہ اہم ہیں۔ اور اردو کو ذریعہ تعلیم بناتے وقت ان مسائل پر بھی غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ لیکن اب تک یہ معاملات ٹلتے رہے ہیں۔ انہیں عذر کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے اور ملکی زبان کو اس کا جائز حق ملنے کے راستے میں بہانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے ملکی زبان کے حامی ان مسائل کے اٹھانے والے کی طرف سے کچھ بدظن سے ہو گئے ہیں۔ اردو کو دفتری حیثیت دینے کے لیے بھی ایسے ہی حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں۔ عدالتی زبان کے طور پر اردو مدتوں سے رائج ہے۔ صرف اسے اعلیٰ عدالتوں تک لے جانے کی ضرورت

ہے دیہات میں پولیس اور دوسرے محکموں کا کاروبار اردو میں چلتا ہے۔ دفتری اصطلاحات کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو چکا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس تمام مواد سے کام لیا جائے اور سرکاری سطح پر دفتروں میں اردو زبان کو رائج کر دیا جائے۔

(ڈاکٹر وحید قریشی ۔ تلخیص)

ایک میچ

یوں تو میں ہاکی اور بیڈمنٹن بھی اچھی طرح کھیل لیتا ہوں لیکن جو دلچسپی کرکٹ میں ہے کسی اور کھیل میں نہیں ہے میں روزانہ باقاعدگی سے کرکٹ کی پریکٹس کرتا ہوں۔ ان دنوں بورڈ کے میچ ہونے والے ہیں اس لیے کالج کی تمام ٹیمیں تیاری میں مصروف ہیں۔ گزشتہ اتوار ہم بھی لائل پور سٹی کرکٹ کلب سے میچ کھیلے اور اٹھارہ رنز سے جیت گئے۔ تمام کھلاڑیوں کو مطلع کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ تمام ٹھیک آٹھ بجے کالج پہنچ گئے لائل پور سے ٹیم تقریباً نو بجے پہنچ گئی۔ پہلے ہی سے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ لہٰذا کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ پروگرام کے مطابق میچ ٹھیک نو بجے شروع ہوا۔ میچ دیکھنے کے لیے طلباء کے علاوہ پرنسپل صاحب پروفیسر صاحبان اور شہر کے معززین بھی حاضر تھے۔ گراؤنڈ کے اردگرد تماشائی جمع تھے۔ خوب رونق اور چہل پہل تھی۔ ایمپائر سفید لباس میں ملبوس انتظار کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایمپائروں نے دونوں ٹیموں کے کپتانوں کو ٹاس کے لیے بلایا۔ ہماری ٹیم کے کپتان نے ٹاس جیتا اور پہلے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ مخالف ٹیم فیلڈنگ کے لیے میدان میں پہنچ گئی اور ہماری طرف سے اسلم اور رضوان نے کھیل کا آغاز کیا جن کا تالیوں سے پرجوش استقبال کیا گیا۔ ادھر سے مجید

نے باؤلنگ شروع کی۔ دوسری بال پر رضوان نے چوکا لگایا۔ اور تماشائیوں نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔ اس کے بعد دونوں کھلاڑیوں نے قدم جما لیے اور بڑی تیزی سے سکور بڑھاتے رہے۔ تقریباً نصف گھنٹے میں سکور ۵۲ تھا۔ اس کے بعد رانا کی گیند پر اسلم کیچ آؤٹ ہو گیا۔ اور کرامت نے اس کی جگہ لی۔ لیکن اتفاق دیکھیے کہ وہ بھی پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہو گیا۔ اب سلیم کھیلنے کے لیے آیا اور اس نے آتے ہی جارحانہ کھیل شروع کر دیا۔ اور اس طرح سکور کو ۵۰ تک پہنچا دیا۔ اب مخالف ٹیم کی طرف سے تیز باؤلر فیاض باؤلنگ کر رہے تھے۔ وہ بڑی اچھی گیندیں پھینک رہا تھا۔ اور سکور بڑھنے سے روک دیا تھا۔ اس کی ایک گیند پر سلیم ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہو گیا۔ ابھی سکور ۵۶ تھا۔ اب ہم مایوس تھے۔ کہ آخری کھلاڑیوں کے کیا رنز بنائیں گے۔ اچھے کھلاڑی تو سب آؤٹ ہو چکے۔ لیکن اتفاق کی بات ہے۔ کہ آخری جوڑے نے ایسے قدم جمائے کہ مخالف ٹیم کے باؤلروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر ایک گھنٹے تک آؤٹ نہ کر سکے۔ سکور بڑھتا گیا محمود نے جب چھکا لگایا تو خوب واہ واہ ہوئی۔ بہرحال انھوں نے سکور ۱۲۰ تک پہنچا دیا۔

اب لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ اس لیے کھلاڑی باہر آ گئے۔ کھانا کھانے کے بعد مخالف ٹیم نے کھیل کا آغاز کرنا تھا۔ چنانچہ ان کے دو اچھے بیٹسمین میدان میں آئے۔ ہماری ٹیم کی طرف سے جاوید نے باؤلنگ شروع کی اور پہلی گیند پر ایک کیچ لے لیا۔ اس کامیابی پر جاوید کی خوب حوصلہ افزائی کی گئی۔ وکٹ نے ہمارا ساتھ دیا اور تقریباً دس منٹ تک ان کے دو کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ ان کی طرف سے شوکت اور عادل نے بڑے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا اور ان دونوں کا سکور ۶۰ تھا۔ باقی کھلاڑی ہمارے تیز باؤلروں کا مقابلہ نہ کر سکے اور باری باری آؤٹ ہونے لگے ان کا سکور ۹۸ تھا۔ اور ان کے تین کھلاڑی باقی تھے۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا لیکن یہ تین کھلاڑی صرف چار رنز بنا سکے۔ اور ان کا سکور ۱۰۲ رہا اس طرح ہماری

ٹیم ۱۸ رنز سے جیت گئی۔

میچ کے اختتام پر پرنسپل صاحب اور پروفیسر صاحبان اور معززین شہر نے ہمارے کھیل کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد تمام کھلاڑیوں کو چائے کی دعوت دی گئی۔

قیام پاکستان

برصغیر پاک و ہند پر تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل شہزادوں کی خانہ جنگی اور باہمی مخالفت کی وجہ سے سلطنت کمزور ہوتی گئی اور انگریزوں کا جو اس ملک میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اقتدار بڑھتا گیا اور وہ رفتہ رفتہ ملک کے بہت سے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مغل سلطنت کا چراغ، جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا، ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انگریز پوری طرح ملک پر مسلط ہو گئے۔

انگریزوں نے حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ مسلمانوں سے بدگمان رہتے تھے کہ اگر انہیں موقع مل گیا۔ تو اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس لینے کی کوشش کریں گے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے اس بدگمانی کو اور مستحکم کر دیا۔ انگریزوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ کہ یہ تحریک مسلمانوں کی اسی کوشش کا نتیجہ تھی۔ لہذا انہوں نے مسلمانوں کی قوت کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی پشت پناہی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمان روز بروز پستی کی طرف گرتے چلے گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔

یہ حالت دیکھ کر بعض درد دل رکھنے والے مسلمان رہنماؤں نے قوم کو تباہی

سے بچانے کا بیڑا اٹھایا۔ سر سید کا نام ان رہنماؤں میں سرِ فہرست تھا۔ انہوں نے قوم کو بیدار کرنے اور ترقی کی راہ پر چلانے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ بالآخر قوم نے جھرجھری لی، آنکھیں کھولیں، اپنی زبوں حالی کی طرف نگاہ ڈالی اور خدا کا نام لے کر اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

قوم کی اس کروٹ کو ایک طرف ہندوؤں نے شبہ کی نگاہ سے دیکھا تو دوسری طرف انگریزوں نے اُسے اپنے لیے خطرے کا پیش خیمہ سمجھا۔ دونوں نے مل کر مسلمانوں کی تحریک بیداری کو دبانے کی کوشش کی۔ لیکن مخلص رہنماؤں کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کی بدولت یہ تحریک زندہ رہی۔ اور مسلمان برابر اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے گئے۔ مسلمانوں کی دلی خواہش یہ تھی کہ سب سے پہلے ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرایا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے برادرانِ وطن سے پورا تعاون کرنے کی کوشش کی لیکن ہندوؤں نے اس تعاون کو کبھی سچے دل سے قبول نہ کیا بلکہ ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ مسلمانوں کے مفاد کو نظر انداز کیا جائے اور صرف اپنے فائدے پر نظر رکھی جائے۔ چنانچہ رہنماؤں کو جب یقین ہو گیا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی ترقی کسی طرح گوارا نہیں اور وہ اکثریت کے گھمنڈ میں مسلمانوں کو عام حقوق دینا تو درکنار ان کے جائز حقوق تک دینے کے لیے تیار نہیں تو انہوں نے اپنے لیے ایک الگ حکومت کا نقشہ اپنے ذہن میں بنانا شروع کر دیا۔

اس آزاد اسلامی حکومت کا واضح تصور سب سے پہلے حضرت علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں پیش کیا۔ اس وقت مسلم لیگ کا اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ علامہ اقبال اس کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ میری نگاہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی کشمکش کا واحد حل یہ ہے ہندوستان کے چند صوبوں میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔ انہیں ملا کر انگریزی حکومت کے زیرِ اثر یا اس سے آزاد ایک سلطنت قائم کر دی جائے جس میں مسلمان اپنے مذہب، اپنی

روایات اور اپنے تمدن کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کریں۔

اسی نصب العین کو مدِ نظر رکھ کر حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم کی۔ شروع شروع میں ہندوؤں کے علاوہ انگریزی حکومت نے بھی مسلمانوں کی اس تنظیم کی سخت مخالفت کی اور ان کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں۔ لیکن قائدِ اعظم کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ مسلمان قائدِ اعظم کی راہنمائی میں ایک زبان ہو کر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے۔ آخر کار ۱۹۴۰ء میں باقاعدہ قرارداد کی شکل میں آزاد اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ پیش کر دیا گیا۔ یہ قرارداد ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ اسی کی یاد میں ہم ہر سال ۲۳ مارچ کو یومِ پاکستان مناتے ہیں۔ اور قرارداد کی یاد زندہ رکھنے کے لیے لاہور میں اُسی مقام پر جہاں مسلم لیگ کا یہ تاریخی اجلاس ہوا تھا۔ ایک عظیم الشان مینار تعمیر کیا گیا ہے، جسے "مینارِ پاکستان" کہتے ہیں۔ اس قرارداد کے بعد حصولِ پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ سات سال تک مسلمانوں نے برابر جدوجہد جاری رکھی۔ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلیں جانیں قربان کیں۔ قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ لیکن اپنے مقصد سے ایک انچ بھی نہ ہٹے۔ آزمائشوں کے اس دور کی کہانی جتنی درد بھری ہے۔ اس قدر اس لحاظ سے باعثِ اطمینان بھی ہے۔ کہ مسلمانوں نے قائدِ اعظم کے حکم سے ذرا سرتابی نہیں کی ہر مصیبت خوشی سے برداشت کی اور ثابت قدمی سے ڈٹے رہے۔ میر کارواں کی اطاعت کی وہ مثال قائم کی جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے بعد اس آسمان نے شاید ہی کہیں دیکھی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ایثار، قربانی، جانبازی اور حق پرستی کو قبول فرما لیا۔ ہندو اور انگریز مسلمان کے بے پناہ جذبے کو نہ دبا سکے۔ انہوں نے اپنی تمام قوتیں آزما کر دیکھ لیں۔ ان کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ

یہ لوگ جس بات پر اڑ جائیں اُسے پورا کر کے رہتے ہیں۔ اسی لیے انگریز کو باوجود اپنی سلطنت کی قوت کے اور ہندو کو باوجود اپنی اکثریت کے گھمنڈ کے مسلمانوں کے مطالبے کے آگے جھکنا پڑا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آدھی رات کے وقت دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا، جس کا نام پاکستان ہے۔ دنیا کے نقشے پر ایک نئے آزاد ملک کے خطوط نمایاں ہوئے۔ وہ ملک جس میں ہم آزادی کے ساتھ خدا کا نام لیتے ہیں، اور عزت و آبرو کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس پیارے ملک پاکستان کے لیے ہمارے بزرگوں نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ہم بھی اس کی حفاظت کے لیے اور اس کی ترقی کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ پاکستان پائندہ باد

(ماخوذ)

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مولانا محمد علی جوہر نے سیدنا حسینؓ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جب یہ فرمایا تھا۔ ع

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تو گویا اسلام کے مزاج کے تعلق سے ایک اٹل حقیقت بیان کر دی تھی۔ جس پر تاریخ اسلام صاد ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام ایک سخت جان دین و مذہب ہے۔ باطل نے ماضی میں بھی اسلام کو پامال کرنے اور حرف غلط کی طرح مٹانے کی پوری کوشش کی مگر ہر بار اس کے خاکستر سے ایک ایسا پیکر نمودار ہوا جو ایک نئی روح کے ساتھ باطل سے ٹکراتا اور اسے زیر کرتا رہا۔

کربلا کے عظیم سانحہ کے بعد جس میں گلشن نبوت کی پامالی ہوئی۔ سخت جاں اسلام پر ہر دور میں کئی کربلائیں گزر چکی ہیں۔ مگر سید حسینؓ نے اپنی اور خانوادہ رسول ﷺ

کی بیش بہا جانوں کی قربانی دے کر مسلمان عالم کے لیے رہتی دنیا تک جو راہ متعین کی وہ مسلمانوں کو جبر و استبداد کے خلاف صف آرا اور ایک نیا جذبہ اور تازہ ولولہ بخشتی ہے۔ اور انہی کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے مسلمان عارضی شکست سے بد دل نہیں ہوتے بلکہ اسوۂ حسینؑ سے یہ سبق لیتے ہیں کہ اگر انہوں نے سبط نبی کی طرح جرائت، اصول پرستی، دوستی، جذبۂ عمل، یقین محکم، خود اعتمادی، آزادی خواہی، عزت نفس، جفاکشی، حق پرستی، فرض شناسی، سیاسی بصیرت، عزم راسخ، رجائیت پسندی، حق گوئی و بیباکی، مستقل مزاجی اور ایثار نفس سے کام لیا تو پھر حق ان کی طرفداری کرے گا اور فتح و نصرت ان کے قدم چومے گی۔

آیئے دیکھیں کہ نواسۂ رسولؐ کو جو شہرت و بقاء کے لیے دوام حاصل ہے اور جن کی نسبت جوش نے کہا ہے کہ

اسلام کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

اس کے پس پردہ کیا راز ہے؟ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ نہ تو انہوں نے حالات و ماحول کو بگڑتا دیکھ کر گوشۂ عافیت اختیار کیا نہ حالات سے سمجھوتا کیا حالاں کہ یہ دونوں ہی راستے ان کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ انہیں علم تھا کہ باطل کی قوتیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ ان کے آگے بے بس ہیں۔ وہ حق پر یقین رکھتے تھے اور انہیں اس کا ادراک تھا کہ ممکن ہے کہ انہیں اپنے گلشن کی آخری کلی تک قربانی دینی پڑے۔ مگر یہ قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے باطل کی قوت سے ٹکرانے اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا۔ اور تمام قسم کے موانعات اور مصائب کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے منزل مراد کی جانب بڑھتے ہی چلے گئے۔ وہ سچے مسلمان تھے اور جانتے تھے کہ ع

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ان کے ایثار اور ان کی قربانی اور ان کے بلند کردار نے کارزار کربلا میں ان کے ساتھیوں کے اندر حق طلبی، نصرت دین، استقلال، صبر و رضا اور توکل علے اللہ کا زبردست ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا اور اسی ولولے نے بھوک، پیاس، مشکلات، دشمن کی کثرت اور موت کی دہشت کو ختم کر دیا تھا۔ مرد تو مرد تھے، عورتیں اور بچے ہر قسم کی تکلیف و مصائب کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہے ان کے سامنے یقیناً اسوۂ اسماعیل تھا، اسوۂ ابراہیم تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار تھا جو ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

قرآن بتاتا ہے کہ "اللہ کے دوست کبھی خوف و حزن کا شکار نہیں ہوتے۔" بلکہ وہ موت کا خندۂ پیشانی سے خیر مقدم کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ فنا دراصل ان کے لیے بقائے دوام کا پیغام ہے۔ قرآن پاک کا یہ بھی ارشاد ہے۔

" خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ
مت کہو کیوں کہ وہ تو زندہ ہیں مگر تمہیں
اس کا شعور نہیں "

سید الشہدا کی زندگی میں ہمیں علم اور عمل کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شہادت یہ سبق دیتی ہے کہ ہمارے قول و فعل میں کبھی تضاد نہ ہونا چاہیے کہ یہ تضاد منافقت ہے اور قدرت منافقت کو معاف نہیں کرتی۔ شہادت حسینؑ یہ سبق بھی دیتی ہے کہ ہمیں نیک نیتی اور خلوص سے حق کی مدافعت اور اس کے فروغ کے لیے ایک نصب العین متعین کر لینا چاہیے، اور پھر اس کے حصول کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی مثال ہماری تاریخ قیام پاکستان ہے۔

سبطِ نبی نے ساتھیوں کی کمی اور وسائل کی کمی اور اپنی بے سر و سامانی

کے باوجود مخالفت پر یہ جتا دیا کہ حق کے حصول کے لیے جد و جہد کی راہ میں نہ مادی وسائل کی فراوانی کوئی رکاوٹ بن سکتی ہے، نہ افواج کی کثرت سے قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ عزم محکم، ذات خداوندی پر یقین اور قوت ارادی جہاد زندگی میں مردوں کی شمشیریں ہیں۔

سیدنا حسینؓ نے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کا خون ناحق نہ بہے۔ آپ نے جنگ میں پہل بھی نہ کی۔ اور نہ ہی آپ کا مقصد دنیوی جاہ و اقتدار کا حصول تھا۔ آپ کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا کہ آپ کے نانا نے اسلام اور حق کا جو شجرہ لگایا ہے وہ خشک ہونے نہ پائے اور اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے اور خانوادے کے خون سے اس شجر کو سینچا۔ چنانچہ آپ کی شہادت کے بعد دیکھتے دیکھتے اسلام پھر زندہ ہو گیا۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک طوطے کی آپ بیتی

میں ایک بوڑھا طوطا ہوں۔ میرا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔ کیونکہ میرے اتنے نام رکھے گئے ہیں۔ کہ مجھے اپنی شناخت کے لیے نام بتانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر حال بقول شیکسپیئر نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ مجھے "ٹوٹو" سمجھ لیں جو میرا پہلا نام تھا۔ اور ایک خوبصورت سی بچی نے رکھا تھا۔ بقول شاعر

ع ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

میں جب چھوٹا سا تھا۔ تو ایک دن گھونسلے سے گر پڑا۔ مجھ فقیر پر تقصیر پر غشی شبہ

کی نظر پڑی اور وہ ازراہِ ہمدردی اٹھا کر اپنے گھر لے گئی - وہاں اس نے میرا علاج کیا اور کچھ عرصے بعد جب میں تندرست ہوگیا - تو اس نے مجھے ایک خوبصورت پنجرے میں مقید کر دیا -

میں وہاں بہت خوش تھا جیسا کہ مرزا غالب نے کہا ہے -

ع گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے -

کیونکہ مجھے وہاں بہترین اور اعلیٰ غذا " چوری " روزانہ ملتی تھی - کبھی کبھی کوئی پھل اور بادام بھی میسر آجاتے تھے - کیونکہ جوانی کی راتیں مرادوں کے دن تھے - لیکن میں پھر اس گھٹی گھٹی فضا سے تنگ آگیا اور میرے دل میں بھی فضائے بسیط میں پرواز کرنے کی آرزو پیدا ہوئی - میں نے ان جذبات کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی اور دل کو سمجھایا - بھئی مجھے تنگ نہ کر ہوس بال و پر نہ کر

ع بچے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

لیکن اس دنیا میں کون کسی کی سنتا ہے - آخر ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا - تیلیوں کو کاٹا اور قفس سے باہر آگیا - ابھی نکلا ہی تھا کہ ایک باز صاحب نے جو شائد میری تاک میں بیٹھے تھے حملہ کر دیا - جل تو جلال تو پڑھتا ، چھپتا چھپاتا ایک اور گھر کے کمرے میں گھس گیا - وہاں مجھے ایک لڑکے نے پکڑ لیا -

ع اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس نے میرا نام " میاں مٹھو " رکھا - ایک خوبصورت سا پنجرہ خریدا اور اس میں بند کر دیا - میں وہاں ہرگز خوش نہ تھا کیونکہ کھلی فضا میں اڑنے کی لذت سے آشنا ہو چکا تھا - اور اب میری سرشت میں فرمانبرداری قسم کی چیز ختم ہو چکی تھی -

میں ہر وقت اُڑنے کی کوشش میں پھڑپھڑاتا رہتا۔ لیکن قسمت میں جو دانہ پانی لکھا تھا، ملتا تھا۔ ایک روز اتفاق سے ایک چھوٹا سا بچہ پاس آیا اور توتلی زبان میں کہنے لگا۔ "میاں مٹھو چوری کھاؤ گے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کھاؤں گا۔" اس نے دروازہ کھول کر چوری اندر ڈال دی۔ لیکن دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ میں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور مائل بہ پرواز ہوا۔ لیکن بُرا ہو ان دنیا والوں کا جنہوں نے جگہ جگہ مکر و فریب کے جال بچھائے ہیں۔ میں ان باتوں سے ناواقف تھا۔ کیونکہ میری عمر تو قفس میں کٹی تھی۔ ایک شکاری نے دانے ڈالے اور میں جھٹ نیچے آ گیا۔ اس نے جال میں پھنسا لیا۔ پھر وہی ہم تھے اور ماتم بال و پر کا تھا اب ایک امیر آدمی نے مجھے خریدا اور مجھے نیا نام دیا۔ اس نے مجھے نئی نئی باتیں سکھانے کی کوشش کی۔ لیکن میں تو زیادہ وقت تیلیوں سے نبرد آزما رہنے میں گزارتا۔ آزادی کی خواہش دل میں چٹکیاں لیتی۔ ایک دن میرا مالک مجھے ہاتھوں میں اٹھا کر پیار کر رہا تھا۔ میں نے لمبی اڑان لگائی۔ گویا اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بہر حال جان بچا کر ایک باغ میں پہنچا۔ اور وہاں زندگی کے بقیہ دن گذار رہا ہوں۔ لیکن آشیاں میں بھی جی نہیں لگتا۔ گزشتہ غلطیوں اور نادانیوں کو یاد کر کے روتا ہوں لیکن اب ——— دل کو روگ لگا گیا۔

کاش قفس سے سمجھوتہ کر لیتا تو آج کسی گوشے میں قفس کے سکون سے پڑا اللہ اللہ کر رہا ہوتا۔ کاش کوئی اس وقت آشیاں کو آگ لگا دیتا تاکہ اس کی یاد مجھے آزاد ہونے پر مائل نہ کرتی لیکن اب ان باتوں سے کیا حاصل!

جو بیت چکی سو بیت چکی   اب اس کی یاد ستائے کیوں

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔ میری ناکام زندگی سے سبق حاصل کیجئے

کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

نظریۂ پاکستان

(پاکستان کا مطلب کیا)

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور نظریاتی مملکت کا قیام خاص مقاصد کے تحت عمل میں آتا ہے۔ افراد مل کر اپنے مستقبل کی سوچ کے مطابق لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان برصغیر کا وہ حصہ ہے جہاں ایک عرصے تک مسلمان حکمران رہے مگر پھر جہاں غیر ملکی انگریز حکمران بن گئے اور یہ تسلط تقریباً ایک سو سال قائم رہا۔ مسلمان ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ ایک ایسی مملکت معرض وجود میں آئے جہاں مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں چنانچہ قائداعظمؒ کا یہ فرمان بجا ہے:

"پاکستان تو اس دن معرض وجود میں آگیا تھا جب یہاں سے پہلا آدمی مسلمان ہوا تھا۔"

نظریۂ پاکستان کے خدوخال مختلف صورتوں میں رونما ہوتے رہے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے اس کو نمایاں کرنے کی کوشش کی تو کبھی شاہ اسماعیل شہید نے اپنا خون دیا اور بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی گئی اس میں بھی نظریہ کارفرما تھا کہ کسی نہ کسی طریقے سے انگریزوں کا تسلط ختم ہو۔ لیکن یہ تمام کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں کیونکہ چند غداروں نے انگریز سامراج کے ہاتھ مضبوط کیے۔

آزادی کا یہ قافلہ کسی نہ کسی صورت میں رواں دواں رہا۔ سرسید اور تحریک علی گڑھ کا سب سے بڑا مقصد ذہنی انقلاب لانا تھا کہ مسلمان جدید تقاضوں کو سمجھ سکیں۔ اس طرح قومی تشخص کا احساس پیدا ہوا۔ نیز سیاسی تحفظ اور ملی انفرادیت کے حصول میں بھی سرسید احمد خان، نواب سلیم اللہ اور سر آغا خان نے انگریزوں سے بات چیت کی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑی اور ظاہر کیا کہ وہ ملک کی تمام قوموں کو ان کے حقوق دلوائیں گے لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہندو صرف اپنا تحفظ چاہتے تھے چنانچہ انگریزوں کی سرپرستی میں ہندوؤں

نے زندگی کے ہر شعبے میں برتری حاصل کی۔ ان کی قوت میں اضافہ ہوا اور وہ حکومت کے خواب دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی حکومت قائم کرلیں گے۔ مسلمان عمائدین نے اس خطرے کو محسوس کیا اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی۔ آخر ۱۹۴۰ء میں کل ہند مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہندو تعصب کو دیکھ کر بہت سے مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

قائد اعظم محمد علی جناح رح جو شروع میں کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ دل برداشتہ ہو کر مسلم لیگ کے پرچم تلے آ گئے اور اس کے تن مردہ میں زندگی کا خون دوڑا دیا۔ قائد اعظم رح کی قیادت میں مسلم لیگ نے نہ صرف یہ منوا لیا کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہے بلکہ وہ پاکستان جیسی عظیم الشان نظریاتی مملکت کے لیے ولولہ بھی رکھتی ہے۔ آپ نے سمجھایا کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے اور دشمنوں کے عزائم خطرناک ہیں۔ چنانچہ ایک بے لوث قائد کی ولولہ انگیز قیادت نے وہ منظر دکھایا جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا تھا۔ ایک دین، ایک قوم، ایک کعبہ، ایک خیال۔ پاکستان مسلمانوں کا نظریہ بن گیا۔ انہوں نے دلائل سے منوا لیا کہ پاکستان ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر آزادی، آزادی نہیں ہے۔ آپ کی پُر خلوص قیادت کا یہ اثر ہوا کہ بچہ بچہ پکار اٹھا۔

"لے کے رہیں گے پاکستان"

"پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ"

اس سے پہلے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد میں علامہ اقبال رح نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت (پاکستان) بنانے کی تجویز پیش کی تھی کہ مسلمانوں کو جہاں ان کی آبادی کثرت میں ہے، آزاد مسلم ہندوستان بنانے کا موقع دیا جائے جہاں وہ اپنے شعائر دین۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو پورا کر سکیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جداگانہ ریاست کے قیام ہی سے نظام شریعت کا نفاذ ہو سکتا ہے اور اس طرح ان کی سیاسی اور اقتصادی زندگی درست ہو سکے گی۔

قائداعظمؒ اس نظریے کو لے کر آگے بڑھے۔ ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ لاہور منظور ہوئی، اور حصولِ پاکستان مسلمانانِ ہند کا نصب العین بن گیا۔ آخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آگیا لیکن قائداعظمؒ کی نظر میں خود منزل نہ تھا بلکہ حصول اور قیامِ پاکستان تو منزلِ مراد پالینے کا ایک ذریعہ تھا جس کی وضاحت آپ نے ایک تقریر میں کی تھی:

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا ہمارا مقصود تھا جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔"

ایک اور موقع پر آپ نے کہا:

"ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔"

گویا کہ پاکستان کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ پر قائم ہوئی کیونکہ مسلمان ایک ایسی اسلامی ریاست چاہتے تھے، جہاں وہ اپنے عقیدے، نظریۂ زندگی اور اپنی طرزِ معاشرت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے دورِ جدید کے چیلنج کا مقابلہ کر کے اپنے مستقبل کو سنوار سکیں۔

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ مجوزہ مملکت میں مسلمانوں کو وہ تمام مواقع حاصل ہوں جن کی مدد سے وہ اپنی زندگیوں کو قرآن کے احکام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں نئے سرے سے مرتب کر سکیں۔

ہم نے لا الٰہ الا اللہ کے نام پر یہ ملک حاصل کیا تھا۔ اب ضرورت ہے کہ ہم واقعی اسے ایک اسلامی ملک بنائیں۔ نظامِ حکومت، نظامِ سیاست، نظامِ معیشت، نظامِ معاشرت غرضیکہ پوری زندگی کا نظام اللہ ہی کا تجویز کردہ ہو اور رہنمائی کے لیے اللہ کی کتابِ ہدایت (قرآن پاک) اور اس کے رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی

علامہ اقبال کے اس مصرع میں ان کی تعلیمات کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ اقبال زندگی میں مسلسل جدوجہد کے قائل ہیں۔ وہ یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کے متمنی ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا انحصار حرکت و عمل پر ہے۔ سہولت تن آسانی سستی۔ کاہلی سہل انگاری اور جمود کی زندگی کو موت سے بدتر سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو اپنے مقاصد کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں ؎

؎ محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ان کے نزدیک زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا۔

؎ زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اقبال ساحل پر کھڑے ہو کر موجوں کا تماشہ کرنے کے قائل نہیں۔ بلکہ وہ "موجوں سے لپٹ طوفاں سے الجھ" کا مشورہ دیتے ہیں۔

؎ بدریا غلط باموجش درآویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

جمود دراصل موت کا نام ہے۔

؎ اس راہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

راہ عمل پر چل کر ہی انسان انسانیت کی معراج حاصل کر سکتا ہے۔

؎ پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

قوموں کی داستان بھی عمل سے وابستہ ہے۔ جو قومیں ہر لحظہ اپنے عمل کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں۔ وہ زندہ رہتی ہیں۔ جو قومیں جدوجہد سے بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ انقلاب کی کشمکش ہی قوم کی زندگی ہے۔

؎ جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب!

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ خدا اس وقت تک قوم کے حالات نہیں بدلتا۔ جب تک اس کے افراد اس کے لئے کوشش نہیں کرتے۔ ظفر علی خان نے کہا ہے۔

؎ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

بود و تعطل کی زندگی کو کوئی زندگی تصور نہیں کرتا۔ جس انسان میں زندگی کی نمو نہیں۔ جو صرف خیالی پلاؤ پکاتا ہے۔ جو صرف شیخ چلی کی طرح خیالات کی دنیا میں گم ہے۔ وہ یہاں بھی اور آخرت میں بھی تمام مسرتوں سے محروم رہے گا۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ حضور نے فرمایا جو کچھ یہاں بوؤ گے۔ آخرت میں وہی کاٹو گے۔ جس نے یہاں کوئی عمل نہ کیا۔ اسے اگلی دنیا میں کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ رسالت مآب نے فرمایا تھا کہ تم فنا کے میدان میں ہو۔ زندگی کے لئے کوشش کرو۔ اور وہ بغیر ہلاکت میں ڈالنے مشکلات برداشت کرنے کے حاصل نہ ہو گی۔ اُس کوشش میں خطرات میں کود نا

پڑے گا لیکن اس کے بعد جس زندگی سے لذت آشنا ہونگے۔ وہ عین راحت ہے۔ قرآن نے اسے دارالسلام کہا ہے۔ یعنی سلامتی اور خیر کا گھر۔

ے بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

لیکن اس کے لئے شرط وہی عمل ہے۔ پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے مصائب کے کانٹے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ راحت کے پھول چننے کے لئے نوکِ خار سے نہیں گھبرانا چاہئے۔

ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی

انتھک کوشش اور مسلسل جدوجہد ہی سے گوہر مراد مل سکتا ہے اس کے بغیر مشکل ہے۔ اس ناپائیدار دنیا کی راحت ہو یا آخرت کی۔ سو عود جنت سے تمام نعمتیں کوشش سے وابستہ ہیں۔

انسان کو شروع ہی سے جنتی یا جہنمی نہیں بنا دیا گیا۔ بلکہ اسے میدان عمل میں بھیج دیا گیا ہے۔ اچھا اور بُرا دونوں راستے سمجھا دیئے گئے ہیں۔ اگر اس نے نیک عمل کیئے تو جنت اس کا دائمی گھر ہے۔ ورنہ بدعملی کے لئے دہکتی آگ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اگر تم میری نعمتوں کا شکریہ ادا کرو گے تو مزید نعمتیں عطا کروں گا۔ اگر کفران نعمت کرو گے۔ تو جان لو یہ بات قطعی یقینی ہے کہ میرا عذاب بڑا سخت ہے۔"

انسان اپنی تقدیر کا معمار خود ہے اور اس لئے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ے عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

ہمارا قومی تشخص

قوموں کے لیے ان کی مخصوص تہذیبی اور ثقافتی روایت وہی حیثیت رکھتی ہے۔ جو حیثیت جاندار مخلوق کے وجود میں جان کی ہوتی ہے۔ جاندار مخلوق میں انسان سب سے بلند و برتر ہے۔ اِنسان کا جسم فطرت کی صنعت گری کا معجزہ ہے نہ اس میں ہاتھی کی سی جسامت اور توانائی ہے نہ شیر و پلنگ کی سی چستی، نہ پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ سکتا ہے۔ لیکن اپنی بے پایاں ذہنی استعداد کے باعث اپنے سے ہزار گنا طاقتور درندوں پر غالب آجاتا ہے۔ ایسی کلیں بنالیتا ہے کہ ارض و سما کی دسترس اس میں آجاتی ہیں لیکن اسی بے پایاں صلاحیتوں والے وجود سے جب جان رخصت ہو جاتی ہے جب روح اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو وہ مٹی کا ایک بے حس و حرکت تودہ بن کر رہ جاتا ہے جو کچھ دنوں میں گل سڑ کر فنا ہو جاتا ہے۔ جاندار ہستی کے وجود کی طرح قوموں کے وجود میں بھی گل سڑ کر قوت ہوتی ہے۔ یہ قوت ان کا مخصوص نظام اقدار ان کی تاریخی روحانی اور جمالیاتی اور معاشرتی روایت ہے۔ یہ روایت قومی وجود میں روح کا درجہ رکھتی ہے۔ جاندار مخلوق کا وجود اپنے سفر زندگی میں ظاہری تغیرات سے دوچار ہوتا ہے۔ ننھا شیر خوار بچہ اس نوجوان سے ظاہری وجود میں مختلف ہے جو وہ پندرہ بیس سال کے بعد بنے گا۔ پھر اس نوجوان کی شکل و صورت اِس کا سراپا اس پیر کہن سال سے ذرا مختلف ہے جو وہ اپنے سفرِ زندگی کے آخری مرحلوں میں ہو گا۔ اسی طرح جغرافیائی مادی، معاشی اور دوسرے اثرات کے باعث قوموں کے ظاہری وجود میں کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا منفرد تشخص دراصل روح کی وجہ سے برقرار رہتا ہے۔ جان کی مخصوص روایت، مخصوص مزاج اور مخصوص وجدان ہے جب تک یہ روح قائم ہے نئے حالات نئے تقاضے اس روح میں ڈھل کر جاتے ہیں۔ شیکسپیئر اب سے چار

سو سال پہلے کا شاعر ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ بیسویں صدی کا شاعر ہے۔ ایک اپنی شاعری میں زرنگار کشتی کا ذکر کرتا ہے دوسرا دھواں چھوڑتی ہوئی ٹیکسی کا لیکن ان استعاروں کے بین فرق کے باوجود دونوں عظیم شاعروں کی تخلیقات کے پیچھے جو روایت ہے وہ مشترک ہے بنیادی وجدان ایک ہے۔

مولانا رومیؒ نے اب سے کئی صدیاں پہلے قونیہ کی مسجد میں بیٹھ کر مثنوی لکھی۔ اقبالؒ نے ہماری صدی میں لاہور میں اپنے تخلیقی وجدان کو نظموں کا پیرہن دیا۔ زمانی اور مکانی بعد کے باوجود دونوں ایک ہی سورج کی روشنی سے فیض یاب ہیں ان کی شخصیتوں کی تشکیل ایک ہی اجتماعی وجدان اور شعور نے کی ہے۔ خواجہ میر درد، سلطان باہوؒ، شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمٰن بابا مختلف زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ہمعصر بھی نہیں تھے لیکن بات ایک ہی کہتے ہیں۔

قوموں کی روحانی اور معاشرتی روایت ایک دریا کی طرح ہوتی ہے۔ وقتی تقاضوں کی ندیاں آتی ہیں اور اس دریا میں شامل ہو جاتی ہیں۔ وہ دریا ان ندیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے لیکن یہ دریا اگر سوکھ جائے تو قوم اپنا منفرد وجود کھو بیٹھتی ہے آج کل ہمارے ہاں اپنے اجتماعی تشخص اپنی قومی انفرادیت کو متعین کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ کچھ بیرونی عوامل بھی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے اصلی قومی مزاج سے دور ہو جائیں۔ یہ وقت ذہنی طور پر بڑا چوکس رہنے کا ہے۔

پاکستانی ملت پوری اسلامی دنیا کے دوش بدوش خود آگہی کے سفر پر تیزی سے رواں ہے۔ وہ لوگ جو اسلامی احیاء سے خائف ہیں ان کی بھرپور کوشش ہے کہ پاکستانی ملت میں ذہنی انتشار پیدا ہو جائے۔

اس وقت ہم میں سے ہر ایک کو یہ بات دل میں بٹھا لینی چاہیے کہ پاکستان صرف ایک جغرافیائی، سیاسی وحدت نہیں ایک آدرش ایک نظریے کی علامت بھی ہے ہماری قوم کی ترکیب دوسری قوموں سے مختلف ہے اس لیے کہ اس کے بدن میں روح توحید و رسالت

پر ایمان ہے۔ وہ ایمان ہے جس نے علوم و فنون کے معاشرت کے رنگا رنگ چمن تخلیق کئے تھے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اُسوۂ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم

سرکار دو عالم فخرِ موجودات سرورِ کونین ختم الرسل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ پاک ہر مسلمان کے لیے اسوہ حسنہ اور نمونہ عمل ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیئے ہمیں ہر قدم پر ہر شعبہ زندگی میں حضور کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاتِ انسانی کے ہر شعبے ہر گوشے میں مکمل ہدایات اور اپنے مثالی اعمال کے ذریعے ہمیں سیدھا، سچا، صاف، روشن اور بہترین راستہ بتایا ہے۔ رب العالمین نے آپ کو رحمۃ اللعالمین بناکر بھیجا اور تاکید فرمائی۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

بے شک تمہارے لیے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی قابلِ تقلید نمونہ ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی تاکید فرمائی۔

جو کچھ رسولؐ تم کو دے مضبوطی سے پکڑے رہو اور اسے ترک کر جس سے وہ منع کرے اور جس نے رسولؐ کی اطاعت کی فی الحقیقت اس نے خدا کی اطاعت کی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت میں اللہ تبارک تعالیٰ نے وہ سب کچھ سمو دیا تھا جس کی اس کائنات اور اس میں بسنے والی مخلوق کو ضرورت تھی۔ ان کی

زندگی تمام انسانیت کے لیے سراپا رحمت تھی - یہ آپؐ کی زندگی کا خصوصی اعجاز ہے کہ آپؐ کا پیغام اور آپؐ کی تعلیمات کسی ایک فرد یا کسی ایک قوم کے لیے محدود نہیں ہیں بلکہ یہ تو کون و مکان اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ایک مکمل ضابطہ حیات کی صورت میں ہے - جو ہر دَور اور ہر زمانے میں تمام بنی نوع انسان کے لئے ان کی فلاح و بہبود اور نجات کا سیدھا اور سچا نمونہ ہے اور کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رحمۃ اللعالمین بنا کر کس لیے بھیجا تھا - قرآن کریم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ہمہ رس رسالت اور ہمہ گیر اعلان کا اعلان یوں فرماتا ہے -

قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا ۝

کہہ دو کہ میں اللہ کی جانب سے تمام بنی نوع انسان کے لیے رسول بن کر آیا ہوں"

پھر ارشاد خداوندی ہے

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ

ہم نے تمہیں سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے -

چھٹی صدی عیسوی کے اس عرب معاشرے کا تصور کیجیے جس میں دنیا کی ہر بداخلاقی درندگی، وحشیانہ ظلم وستم روا تھا - جوا اور شراب کی ان کی گھٹی میں ملا تھا - جس کے قبیلے قبیلے کا بُت جدا تھا - غرض ان میں دنیا کا ہر وحشیانہ طرزِ عمل شامل تھا - اس وحشی اور درندہ صفت معاشرے میں آپ کی ذات سے جو انقلاب آیا اس کے نتائج سے دُنیا حیران ہے - اس وحشی اور درندہ صفت معاشرے نے دنیا کو امن و اخوت، عدل و انصاف اور زندگی کا جو چین اور قرینہ دیا ہے اس کا جواب دنیا آج بھی دینے سے قاصر ہے - اور یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا - اس کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ یہ اس کملی والے کا فیض تھا -

وہ دانائے سُبل مولائے کل ختم الرسل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا!

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی اور ان کے کردار کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالیئے آپ کو مردِ مومن اور مردِ کامل کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ملے گی۔ ایک عملی نمونہ جس نے ہر سطح اور ہر مقام پر انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار اور مدارج کو قائم رکھا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ضابطوں کی تکمیل کر کے وہ شاہراہیں استوار کیں اور ان شاہراہوں پر آپ نے اپنے عمل اور کردار سے ایسے روشن مینار قائم کیے جو اہلِ دل اور اہلِ بصیرت اور تمام انسانیت کے لیے ہمیشہ ہدایت بنے رہیں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زندگی میں عملی طور پر اپنے پیغام اور اپنی تعلیم کی حقانیت کو ثابت کر کے واضح کر دیا کہ ہر انسان تمام دشواریوں اور مشکلات کے باوجود صالح اور پاک زندگی بسر کرنے پر قادر ہے۔ آپ نے ایک عام آدمی کی حیثیت سے اپنی مختلف ذمہ داریوں سے خوبصورتی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی مثال قائم کی ہے جو ایک بے کس مظلوم شہری سے شروع ہو کر سربراہ سلطنت اور ہادی برحق پر ختم ہوتی ہے۔ آپؐ ہر حالت میں یادِ الٰہی میں سرشار آدابِ زندگی سے آراستہ اپنی منزلِ مقصود سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی توفیق دے کہ ہم ان کے بتائے ہوئے راستوں پر صدقِ دل سے چلیں۔

بقولِ اقبالؒ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں۔

اسلام مکمل ضابطۂ حیات

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے۔

آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام پسند کیا۔

گویا خدا کا پسندیدہ دین اسلام ہے جو ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے اور زندگی

کے ہر شعبہ پر ہو رہا ہے۔

اسلام کا اگر دیگر مذاہب سے مقابلہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر انسان خواہ کسی مقام، رنگ و نسل اور وقت سے تعلق رکھتا ہو مکمل اور مطمئن زندگی گزار سکتا ہے۔ ہندو مت۔ جین مت۔ بدھ مت۔ عیسائیت، یہودیت، ایسے ادیان میں جو تمام شعبہ ہائے زندگی میں رہنمائی نہیں کرتے۔ کسی حد تک آپ کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جلد ہی تہی دامنی اور کم مائیگی کا اظہار کر دیں گے۔ مثلاً ہندو مت میں چھوت چھات کا احساس ذات پات کی اذیت ناکی وغیرہ توہین انسانیت ہے۔ جین مت میں احساس محرومی انسان سے دستار فضیلت چھین لیتا ہے۔ عیسائیت میں دین و دنیا کی تقسیم روح و جسم کا امتیاز حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا پرتو نہیں بلکہ تحریف و ترمیم کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے عیسائی دنیا روحانیت کو چھوڑ کر مادیت پرست بن گئی۔

اسلام ایک مکمل دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے یعنی ہر دور کے لیے مکمل و جامع ہے۔ کسی قسم کی آلودگی سے پاک و منزہ۔ اس میں ہر ملک ہر قوم اور ہر شخص کے لیے ہدایت اور رہنمائی ہے۔ یہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے اور اس میں زندگی میں موجود اور غیر موجود مسائل کا حل بھی موجود ہے۔

بقول علامہ اقبالؒ۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

یعنی کائنات میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری ہے لیکن اسلام میں ہر نئی چیز کا حل موجود ہے اور تاقیامت اسلام ہی نوع انسان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہے گا۔

موجودہ انسانی زندگی کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سیاست معیشت

معاشرت یہ وہ دائرے ہیں جو انسانی زندگی پر محیط ہیں۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اسلام کے ہاں فریب کاری دھوکا بازی۔ ریاکاری۔ حصولِ طاقت کے لیے جائز و ناجائز ذرائع طریقے استعمال کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ سیاست سے مراد۔ امیر۔ فوج، رعایا۔ کے حقوق و فرائض کی نگہداشت اور آئین و قوانین کی تعیین ہے اسلام نے واضح طور پر بتا دیا کہ خلافت یا بادشاہت ایک امانت ہے جو انسان کے سپرد کی گئی ہے اور پھر اس کے فرائض کی نشاندھی کر دی گئی۔

حاکم کو قرآنی احکامات اور اسوہ حسنہ کی پیروی میں قدم بڑھانا ہو گا۔ اسے اپنے تقویٰ کی وجہ سے فوقیت ہو گی۔ سیاست میں کسی قسم کی بھی ریاکاری اور فریب کی اجازت نہیں سوادِ اعظم سے الگ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسلام میں پاپائیت۔ برہمنیت اور مذہبی مسند فروشی کا کوئی حصہ نہیں۔ کوئی شخص خواہ وہ کسی ملک قوم یا رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو اپنے تقویٰ کی وجہ سے محترم و مکرم ہے۔

معیشت کے میدان میں کسی فرد پر پابندی نہیں۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق محنت کرے۔ کمائے اور خرچ کرے لیکن اس طرح کہ انسانی حقوق پامال نہ ہوں خدا نے فیصلہ کر دیا ہے کہ زمین اور اس کے وسائل ہر انسان کے لیے بلا رنگ و تمیز وقف ہیں انسان وہی کچھ حاصل کرتا ہے جس کے لیے کوشش کرتا ہے اسلامی معاشرہ میں وہ شخص قابلِ قدر ہے جو زیادہ کمائے اور دوسروں کے لیے روزی مہیا کرے۔ حلال کی کمائی میں سے صدقہ و خیرات زکوٰۃ و خمس ادا کرے۔ دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی سخت مخالفت ہے خداوند کریم نے احسان پر بڑا زور دیا ہے یعنی جو کچھ بچ رہے اُسے دوسروں پر خرچ کرے اگر اسلام کے ان زریں اصولوں کو اپنایا جائے تو موجودہ دور کے پیچیدہ معاشی مسائل بآسانی حل ہو سکتے ہیں۔ سوشلزم۔ کمیونزم۔ سرمایہ داری کی تمام خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔

اسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ کسی ملک کے خاص رسم و رواج ،

تہذیب وتمدن، لباس، خورد ونوش کے طور طریقے بدلنے پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اس میں انسانیت کی رفعتیں مہیا کرتا ہے۔ مثلاً لباس میں یہ پابندی نہیں کہ کس رنگ یا کس انداز کا ہو بلکہ افادیت کے پیش نظر ستر پوشی اور سادگی کی تلقین کرتا ہے۔ اور فضول خرچی سے اجتناب کا درس دیتا ہے۔ اس طرح کھانے پینے میں پاکیزگی و طہارت کی پابندی ہے رہن سہن میں انسانیت کے بلند معیار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب اور معاشرہ مذہب سے ہٹ کر اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ اسلامی معاشرے میں عادات واطوار۔ رسم ورواج اور طرزِ معاشرت وہی اپنائی جاتی ہے جو اصول دین کے منافی نہ ہو۔ اور ایک خاص مقصد جو اسلامی معاشرے میں کارفرما نظر آتا ہے وہ مقصد اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی ہے۔

سورۃ النسا میں ارشاد ہوتا ہے۔

> اور خدا ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو
> شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ قرابت داروں یتیموں
> محتاجوں اور رشتہ داروں۔ ہمسایوں اور مسافروں
> سب کے ساتھ احسان کرو۔ خدا احسان کرنے والوں
> کو دوست رکھتا ہے اور تکبر کرنے والوں کو دوست
> نہیں رکھتا۔

غرض معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے بارے میں رشد وہدایت کی اس کتاب قرآن کریم سے رہنمائی حاصل نہ کی جا سکتی ہو۔ یہ مقدس کتاب الماریوں میں سجانے کے لیے نہیں بلکہ رشد وہدایت کا منبع ہے جو فرد کو صراطِ مستقیم کی جانب گامزن کرتا ہے۔ ہماری رہنمائی کے لیے خداوند کریم نے رسولِ اکرم رحمۃ للعالمین کو بھیجا جن کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہمارے لیے ضروری ہے۔

اگر ہر شخص اسلام کے سنہری اصولوں کی پیروی کرے اور قرآن واسوۂ حسنہ سے

سے اکتساب فیض کرے تو وہ مجسمہ اخلاق بن سکتا ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی عملی طور پر ادائیگی سے ایک مثالی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

اسلام ہی وہ دین فطرت اور ضابطہ حیات ہے جو انسانی معاشرے کی بہتری اور بہبود کا ضامن ہے جب تک اس دھرتی پر "انسان" نام کی کوئی مخلوق رہے گی۔ دین اسلام اس کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ (پروفیسر دیوان الیاس نصیب)

اسلامی تہذیب میں عورت کا مقام

عورت ایک ناگزیر برائی ایک پیدائشی وسوسہ ایک مرغوب آفت ایک غارت گر دلربائی اور ایک ترغیب معصیت ہے۔

یہ الفاظ عیسائیوں کے ایک عظیم راہب کے ہیں لیکن دراصل یہی وہ تصور تھا جو پورے مسیحی یورپ میں صدیوں تک عورت کے بارے میں چھایا رہا۔ ہندوستان میں عورتوں کو شودروں سے کمتر مقام دیا گیا۔ مصر، روم اور دیگر تہذیبوں میں بھی تقریباً یہی تصور تھا کہ عورت کا وجود ذلت اور گناہ کا وجود ہے عورت گناہ کی ماں اور جہنم کا دروازہ ہے۔

خود عربوں کے اکثر قبائل ایسے تھے جو لڑکیوں کے وجود کو اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے اور ان معصوموں کو زندہ درگور کرتے تھے۔ قرآن بھی ان کے اس مذموم فعل کا ذکر بڑے افسوس کے ساتھ کرتا ہے۔ یورپ نے کسی قدر آزادی دی ہے لیکن پھر بھی پہلے عورت اگر مس الف ہوتی ہے تو پھر "مسز ولیم" بن جاتی ہے۔ یعنی باپ یا خاوند کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔

گویا تمام تہذیبوں میں عورت کا مقام نہایت حقیر اور پست رہا۔ بیوی تو خادمہ

سمجھی جاتی تھی۔ بیٹی تھی تو ملازم شمار ہوتی تھی۔ پیدائش پر اسے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اور یہ عورت ہی تھی کہ جس کو اپنی زندگی مردہ خاوند کے ساتھ آگ میں جل کر زبردستی ختم کرنا پڑتی تھی۔

غرض عورت ہزاروں سال سے اپنی نگاہیں آسمان پر لگائے ہوئے تھی۔ کہ اے زمین و آسمان کے مالک :۔ کیا سرزمین پر میرے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ان خاموش صداؤں کا افلاک سے جواب آیا اور خدا نے اس عظیم انسان کو بھیجا جس نے عورت کو یہ اعزاز بخشا کہ وہ مرد کے دوش بدوش کھڑی ہو گئی۔ اسلام نے اس کا مقام بلند کر دیا۔ اگر وہ بیوی ہے تو خدا کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ بیٹی ہے تو آتش دوزخ سے بچانے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ ماں ہے تو اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔

حضور نے فرمایا تھا " اگر تم ماں کی تابعداری کرو گے تو جنت کے حقدار بن سکتے ہو۔ ورنہ اس کو دکھ پہنچا کر دنیا بھر کی نیکیاں بھی تمہارے کام نہ آسکیں گی۔

آج دنیا میں جہاں کہیں عورت کی عزت اور اس کے حقوق کا چرچا ہے۔ یہ اسلام ہی کا فیضان ہے۔ آج حقوق نسواں اور بیداریٔ نسواں الفاظ اسی انقلابی آواز کی صدائے بازگشت ہیں جو رسول اکرم کی زبان سے بلند ہوئی۔

آنحضرت نے صرف فکری اور نظری اعتبار سے عورت کا مقام و مرتبہ بلند نہیں کیا بلکہ قانون کے ذریعے سے بھی عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی۔ علاوہ ازیں آپ نے عورتوں میں اتنی ہمہ گیر بیداری پیدا کر دی کہ وہ اپنے جائز حقوق کو سمجھیں۔

اسلام نے اجتماعی زندگی میں مرد و زن کی حیثیتوں کو محفوظ رکھتے ہوئے اور خاندانی نظام کی حفاظت کے لیے جو مختلف تدابیر اختیار کی ہیں اس لحاظ سے دنیا کا کوئی نظام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلام نے خاندانی نظام کی بنیاد مرد و عورت کے باضابطہ رشتہ یعنی نکاح کو قرار دیا تاکہ وہ ایک مرد کی ہو کر رہے۔ اسے پردے کا پابند بنایا تاکہ غیر

مردوں کے ساتھ میل ملاپ نہ ہو سکے اور خاندانی نظام تباہ نہ ہو جائے۔ دونوں کے لئے الگ الگ دائرہ کار مقرر کر دیئے۔

مغربی تہذیب نے مرد و زن کی مساوات کے نظریے پر جس معاشرتی زندگی کی تعمیر کرنا چاہی اس کا المناک انجام پوری دنیا کے سامنے ہے۔ خاندانی نظام کی تباہی نے وہاں کے پورے تہذیبی و تمدنی ڈھانچے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ اس کی وجہ عورت اور مرد کے الگ الگ دائرہ کار کی فطری تقسیم کا خاتمہ ہے۔

اسلام نے مرد اور عورت کو ایک جیسا معاشرتی رتبہ دینے کے ساتھ ساتھ دونوں کے دائرہ عمل کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی ہے۔ گھر کے اندر زندگی کا نظام عورت کے سپرد ہے اور بیرون خانہ کی ذمہ داریاں مرد کو سونپی گئی ہیں۔ اسلام نے عورت کو وسیع معاشی حقوق دیے ہیں۔ وہ باپ سے شوہر سے اور قریبی رشتہ داروں سے ورثہ میں مال و دولت حاصل کر سکتی ہے۔ وہ تجارت کر سکتی ہے۔ اسلام نے دونوں کو شہریت کے حقوق دیئے ہیں اور اس کی آبرو اس کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی حکومت پہ ہے۔ اسلامی ریاست میں عورت کو تحریر و تقریر اور تنقید کی، پوری اجازت ہے۔

تاریخِ عالم میں سرورِ کونین کی ذات نمایاں ہے جنہوں نے عورت کو ادنیٰ مقام سے اٹھا کر ارفع مقام پر پہنچا دیا۔ اور وسیع حقوق دلوائے جنہیں صدیوں سے مرد نے سلب کر رکھا تھا۔ نیز جو حقوق اسلام نے دیے وہ کوئی دوسرا معاشرہ نہیں دے سکا۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے عورت کے حقوق اور معاشرتی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے لوگو! عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو"

یعنی معاشرے میں دونوں کی حیثیت مساوی ہے۔ اور ایک دوسرے کے باہمی مساوی تعاون واشتراک ہی سے زندگی سنورتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔

"تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے"

میر انیس کا مصرع ہے ؎

کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں بہت سے غیر اسلامی رسوم و رواج جڑ پکڑ گئے ہیں جو ایک ناسور بن کر معاشرے کے جسم میں زہر پھیلا رہے ہیں ہماری خواتین کو چاہیئے کہ وہ منظم ہو کر ان غیر اسلامی رسوم و رواج کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کریں۔ اور سرورِ کونین کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراؓ خاتونِ جنت کے اُسوہ کامل کی پیروی کریں۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول

مادراں را اسوۂ کامل بتول !

(پروفیسر کاظمی)

ہمارا نظام تعلیم

فرد ہو یا قوم تعلیم اس کے لیے ناگزیر حقیقت اور لازمۂ حیات ہے۔ تعلیم وسیع تر معانی میں تجربے کا نام ہے اور تجربات کا یہ عمل مہد سے لے کر لحد تک جاری رہتا ہے۔ زندگی کے تجربات اور خارجی ماحول سے مطابقت، ناسازگار قوتوں سے مزاحمت ہر زندہ و جاندار نامیاتی چیز کا خاصہ ہے اور زندگی کی بقا کا راز بھی حقائق کے اس شعور میں پوشیدہ ہے۔ جس میں اس شعور کی کمی ہے، وہ جلد ہی موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جاتا ہے۔ تعلیم دراصل فرد کو تجربے میں تنظیم شعور نو، ناقدانہ نظر، سائنسی طرزِ فکر اور معروضی نکتہ نگاہ عطا کرتی ہے کہ وہ ماضی کی روشنی میں اپنے حال و مستقبل کو سنوارتا ہے۔ قومیں اس لیے اپنی اجتماعی زندگی کے لیے شاندار مستقبل کے لیے نئی نسل کو قدرت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیتیں بلکہ رسمی طور پر تعلیمی اداروں، مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے ذریعے

اپنا تمام تر ثقافتی ورثہ اور علم کا سرمایہ منتقل کرتی ہیں تاکہ نسل کا قدم آگے بڑھے۔ ہر قوم کا نظام تعلیم اس کی امنگوں کا آئینہ دار اور مخصوص تقاضوں کا عکاس ہوتا ہے۔ روس، امریکہ، چین والے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام اپنے نظریہ حیات کے مطابق کرتے ہیں۔ اسی طریق سے پاکستانی قوم بھی اپنی ثقافت، روایات تہذیب و تمدن کے اعتبار سے منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس کا اپنا نظریہ حیات ہے اور ہمارا نظام تعلیم اسی نظریہ حیات کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

پاکستانی قوم کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اس قوم کا واضح نصب العین اور نظریہ ہوتے ہوئے بھی اس کی حفاظت اور پاسداری کا کوئی معقول اہتمام نہ کیا گیا۔ کسی قوم کا نظریہ حیات نصب العین قومی مقاصد، ملی تقاضوں کا پتا اس قوم کے آئین سے ملتا ہے آئین قوم کے معاملہ میں نشانِ منزل کا تعین کرتا ہے۔

پاکستان گو اسلامی نظریہ حیات پر قائم ہوا تھا مگر ملکی و ملی سطح پر اس نظریے کو فروغ نہ بخشا گیا اور اسلام سے بیگانگی کی بنا پر ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان کا نظام تعلیم بری طرح ناکام ہوا وہ مقصد حیات اور پاکستانی قوم کے نظریات اور ثقافت کا تحفظ نہ کر سکا بلکہ اپنی درسگاہوں سے اٹھنے والی کھیپ نے صوبائی تعصبات کی آگ کو بھڑکایا اور لاالہ کے وارث نے قومی یکجہتی اور ملکی سالمیت کو پارہ پارہ کر دیا۔

خدا کا شکر ہے کہ اربابِ بست و کشاد کو احساس ہوا ہے اور انہوں نے نظامِ تعلیم کی طرف توجہ دی ہے تعلیمی مسائل پر آگاہی اور ان کے حل کے لیے مختلف ادوار میں کمیشن بٹھائے گئے اور نظام تعلیم میں تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ ایک خوش آیند بات ہے کہ نظام تعلیم کو جامد نہیں بلکہ ایک تغیر پذیر متحرک عمل تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے نظام تعلیم کو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کے لیے مسلسل ارتقا کی منازل سے گزرنا پڑا ہے۔

چنانچہ نئی تعلیمی پالیسی میں مقاصد تعلیم کی واضح نشاندہی کر دی گئی ہے یعنی :

نظریۂ پاکستان کا تحفظ۔ اسلامی نظریۂ حیات ہماری پالیسی کا اولیں مقصد ہے اور ہم اس کے لیے کوشاں ہیں۔ اس گلشن کی آبیاری کا اہتمام تعلیمی درسگاہوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو تعلیم کی ہر منزل پر لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ طلباء کی نئی نسل کے ذہن کی تراش خراش اس نظریے کے مطابق ہو سکے۔ اسی طرح تعلیم کے مواقع سب کے لیے یکساں ہوں گے۔ میٹرک تک تعلیم مفت ہے۔ حکومت نے یکساں قسم کا معیار تعلیم نافذ کرنے کے لیے لازمی قرار دیا ہے کہ انگریزی سکولوں میں ذرائع تعلیم اردو زبان ہو گی۔ اسی طرح اپنی قومی زبان کو اپنایا جا رہا ہے اور اس کی تدریس انٹرسٹرز کی سطح تک۔ لازمی ہے۔

سائنس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے اور کورسز کو کافی حد تک جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالا گیا ہے اور علمی و سائنسی میدان میں روز افزوں تجربات و تحقیقات سے روشناس کرانے کے لیے ٹیکسٹ بک بورڈ قائم کیے گئے ہیں جو کتابوں کی تجدید کرتے رہتے ہیں۔

خواتین کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی ہے اور خواتین کے علیحدہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ خواتین کی تعلیم کو مردوں کے شانہ بشانہ تمام سہولتیں مہیا کی گئی ہیں اور تمام ضلعی مقامات پر گرلز کالجوں کا قیام ضروری قرار دیا جائے۔

ہمارے نظام تعلیم میں امتحانات کے لیے ثانوی تعلیمی بورڈ قائم ہیں۔ پرانے طرز کے امتحانات کی جگہ معروضی طرز امتحانات کو زیادہ فروغ مل رہا ہے

انتظامی سطح پر انتظام میں کافی تبدیلی عمل میں لائی گئی ہے۔ کالجوں اور سکولوں کی نظامت تعلیمات الگ کر دی گئی ہیں اور ضلع کی سطح پر زنانہ اور مردانہ شعبے الگ کیے جا رہے ہیں۔

ادب اور زندگی

ادب کیا ہے ؟ اس سلسلے میں مختلف ادوار میں مختلف نظریات کا اظہار کیا گیا ہے مگر ان تمام خیالات کی تہ میں جو مفہوم ہمیں مشترک نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ادب اور زندگی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب نہ صرف زندگی کا ترجمان اور ناقد ہے بلکہ یہ ہمارے رہن سہن کا لازمی جزو ہے۔ IT IS A SOCIAL MANIFESTATION OF HUMAN LIFE.

ادب اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کو ارتقائے حیات میں ایک دوسرے کا ممد و معاون ہونا چاہیے۔ لیکن ایک فنکار کی تخلیقات میں رنگ دوام تب پیدا ہوتا ہے جب ان میں زندگی کی دائمی قدروں کے ساتھ ساتھ فنی اور جمالیاتی اقدار کا بھرپور رنگ موجود ہو، رومی، سعدی، میر، غالب، اقبال وغیرہ کی ہمیشگی اور بقائے دوام، اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ انھوں نے جہاں زندگی کی بنیادی قدروں اور انسانی مسائل کو اپنے ادب میں سمویا ہے وہاں اپنے خلوص اور جذبے کی رنگ آمیزی بھی کی ہے۔ غالب نے اس حقیقت کا انکشاف یوں کیا تھا۔

؎ حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

اور اقبال نے کہا تھا

مع نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر

ادب برائے ادب کی تحریکیں بھی چلیں لیکن اس نظریے کے علمبردار بھی اپنی تخلیقات میں زندگی کی حقیقتوں کو نظر انداز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ادیب اپنے گرد و پیش کی زندگی سے دامن نہیں بچا سکتا۔ اردو غزل کو لیجیے اس کے دامن میں اپنے عہد کے سیاسی سماجی معاشرتی اور اقتصادی مسائل موجود ہیں۔ کیا درد کی غزلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور " زندگی کے طوفان میں جینے کے ہاتھوں " مر چلنے " کی شکایت اس دور کی سماجی بد حالی اور اخلاقی پستی کا نتیجہ نہیں، کیا سودا کی ہجویات اور شہر آشوب انہی حالات کی پیداوار نہیں۔ اور تو اور افسانوی ادب میں اس زمانے کی تہذیبی زندگی اور معاشرت کے جیتے جاگتے نقوش منعکس نظر آتے ہیں۔ ادیب کا کام تخلیق حسن کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرنا بھی ہے اقبال کے نزدیک اس شعر و ادب کا مرتبہ بلند ہے جس کا مقصد انسانیت کی تہذیب ہو۔

شعر را مقصود گر آدم گری است ؎\
شاعری ہم وارث پیغمبری است

ادب کا موضوع زندگی ہے اور زندگی بڑی متنوع ہوتی ہے۔ زندگی کی یہی رنگا رنگی ادب کا موضوع ہے۔ لیکن ادیب یا شاعر کا نقطۂ نظر زندگی اور اس کے حقائق کے بارے میں عامیانہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے احساسات کے اظہار کے لیے منفرد انداز اختیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معیاری ادب اخلاقی اقدار اور زندگی کے اجتماعی مسائل کا حل ہوتے ہوئے بھی محض تبلیغ اور پند و نصائح کا دفتر بن کر نہیں رہ جاتا۔ مجنوں گورکھپوری نے کہا ہے " ادب اپنے عہد اور اپنے اجتماعی نظام کی پیداوار بھی ہوتا ہے اور دونوں سے ماورا بھی " یہی وجہ ہے کہ عظیم ادب وقت کے ساتھ مر نہیں جاتا بلکہ زندہ رہتا ہے۔ وہ ایک ہی حقیقت میں نہ صرف حال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بلکہ ماضی کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ بھی ہوتا ہے۔ ادب کا کام ہمیشہ حقیقت کا ادراک رہا ہے۔ لوک گیتوں اور دیو مالائی قصوں سے لے کر آج تک ادب زندگی کا ترجمان اور اپنے حالات کا آئینہ دار رہا ہے۔

ادب اور زندگی کا رشتہ دائمی ہے۔ ادب کا سرچشمہ حیات ہے۔ حیات ہی سے اس کے سوتے پھوٹے۔ ادب پھول ہے تو زندگی اس کی مہک۔ ادب جسم ہے تو زندگی اس کی روح۔ ادب دل ہے تو زندگی اس کی دھڑکن اور جس روز یہ دھڑکن بند ہو گئی ادب کی موت واقع ہو جائے گی۔

(پروفیسر اے۔ بی۔ اشرف)

میری پسندیدہ کتاب

(بانگ درا)

آج کے زمانے میں تفریحی مشاغل کی یوں کثرت ہے کہ کتب بینی کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے، لوگ عام طور پر سینما، تھیٹر، کھیل تماشا دیکھنے یا سیاست پر بحث کرنے میں وقت صرف کرتے ہیں اگر کچھ وقت بچ رہا تو ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگرام سے جی بہلایا جاتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کے لئے وقت کہاں سے آئے لیکن پھر بھی کچھ دل جلے ایسے جنہوں نے پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کر لیا ہے۔ اور مختلف النوع مشاغل کے ہجوم میں بھی کتب بینی کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ کچھ ایسی کیفیت میری بھی ہے۔ میں کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہوں پڑھنے کے لیے بے چین رہتا ہوں۔ اخبار، رسالہ، کتاب جو بھی مل جائے پڑھ لیتا ہوں، اسی شوق میں بہت سی کتابیں پڑھ لی ہیں ان میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں اکثر پڑھتا رہتا ہوں۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مجھے مجبور کرتی ہیں کہ میں انہیں پڑھوں، ان کے مطالعہ میں لطف آتا ہے۔ اور ہر ملاقات پہلی ملاقات معلوم ہوتی ہے۔

بیکن نے کہا تھا کہ بعض کتابیں محض چکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ بعض چبانے کے لیے اور بہت کم ایسی ہوتی ہیں۔ جن کو چبا کر نگلنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنی پسندیدہ کتاب کو بار بار چبایا ہے اور پھر بھی لذت سے کام و دہن کبھی سیر نہیں ہوئے۔

یوں تو میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور کئی ادب پاروں سے متاثر بھی ہوا ہوں۔ نثر میں باغ و بہار (میرامن) زندگی (افضل حق) ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتون) نظم میں دیوان غالب، نقش فریادی (فیض) اور بانگ درا (اقبال) مجھے بہت پسند ہیں۔ لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کسی ایک کا انتخاب کروں تو میں بانگ درا کو ترجیح دوں گا کیوں؟ اس لیے کہ مجھے پسند ہے۔ ممکن ہے کسی کو اختلاف ہو لیکن پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا اقبال اور ان کے کلام سے وابستگی اس وقت سے ہے جب میں سکول میں پڑھتا تھا اور ہم سب بچے مل کر یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی مانند ہو خدایا میری

پھر زندگی کے مختلف ادوار میں میں کلام اقبال سے محفوظ ہوتا رہا اور ان سے عقیدت بڑھتی رہی۔ بانگ درا ہمیشہ میرے مدنظر رہی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ زندگی کے ہر دور میں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس میں بچوں کے ذوق کا سامان موجود ہے۔ جوانوں کے لیے غور و فکر کی دعوت بھی ہے۔ اور ان لوگوں کے لیے عبرت بصیرت کے اسباق بھی ہیں جو پختگی کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ عنوانات اور مضامین کی رنگا رنگی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے

جلوہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بانگ درا علامہ اقبال کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو پہلی بار ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ شیخ عبدالقادر نے دیباچہ میں لکھا۔ کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد

ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا۔ جو اُردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آ جائیں گے۔"

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ ۱۹۰۵ء تک کی نظموں کا ہے۔ دوسرا حصہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی غزلوں کا ہے اور تیسرا حصہ ۱۹۰۸ء سے لے کر اس وقت تک کے کلام پر مشتمل ہے، جب بانگ درا شائع ہوئی۔ کتاب کے تینوں حصے اقبال کے ذہنی ارتقاء کو ظاہر کرتے ہیں۔

پہلے دور میں نظر میں اتنی وسعت نہیں۔ شاعر کو مناظر فطرت سے پیار ہے وہ ایک سچے محب وطن نظر آتے ہیں لیکن وطن کا نظریہ محدود ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہیں، کبھی گل رنگین سے خطاب کرتے ہیں، کبھی شمع کی زبان سے بات کرتے ہیں، کبھی گل پژمردان کے دل میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ ابتدائی غزلوں میں بھی قدیم شاعری کا رنگ ہے۔ داغ سے متاثر ہیں۔ کچھ نظمیں انگریزی سے ترجمہ ہیں مگر خوبیِ اظہار کی وجہ سے اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ماں کا خواب۔ ہمدردی وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ چھوٹی سی نظم ہمدردی میں پیغام ملاحظہ ہو۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

دوسرے حصے میں شاعر محض شاعر ہی نہیں فلسفی بھی ہے۔ تخیل زیادہ بلندیوں پر پرواز کرتا ہے۔ "محبت" اور "حقیقت حسن" بڑی اہم نظمیں ہیں۔ غزلیات میں بھی فکر کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ حرکت کو زندگی اور جمود کو موت قرار دیتے ہیں۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسمِ قدیم ہے جہاں کی

؎ چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

تیسرے حصے کی نظموں میں ایک اٹھان اور بلندی کا احساس ہوتا ہے پہلی نظم "بلاد اسلامیہ" کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہے اور یہ نئی دنیا ہے ملت اسلام کی دنیا۔ اس حصے کی قابل ذکر نظمیں "نمود صبح، فلسفہ غم، ترانہ ملی، شکوہ جواب شکوہ، شمع و شاعر، طلوع اسلام، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضر راہ وغیرہ ہیں۔ طلوع اسلام اور خضر راہ، شمع و شاعر تو ایسی نظمیں ہیں۔ جن پر اردو شاعری بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

اقبال کے نظریات و تصورات کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی بقا اسی میں ہے کہ عالم اسلام ایک مرکز پر جمع ہو جائے۔

؎ فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

حق و باطل کی معرکہ آرائی ازل سے جاری ہے۔ شرار بولہبی چراغ مصطفوی سے ہمیشہ الجھتا رہا ہے۔ مگر حق کی روشنی ہمیشہ پھیل کر رہی۔ یقین محکم عمل پیہم اور محبت فاتح عالم میں نجات ہے۔ احکام نبوی کی پیروی ضروری ہے۔

؎ کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

تہذیب مغرب "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے"۔ مغرب کی کورانہ تقلید نقصان دہ ہے۔ بلکہ ان کا خیال ہے کہ

ـــہ اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

چند اشعار دیکھیے جو اپنے اندر معنی کی وسیع دنیا اور عالمگیر پیغام لیے ہوئے ہیں۔

ـــہ تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے

ہ

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

ہ

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ہ

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہ

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

ہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی!
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

؎ زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

٥

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

٥

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مضمون لکھنے کے لیے موضوعات

(نوٹ) اس میں وہ تمام موضوعات بھی شامل ہیں جو لاہور، سرگودھا اور ملتان بورڈ کے پرچوں میں اب تک آچکے ہیں)

۱۔ اُردو ذریعہ تعلیم۔

۲۔ عجائب گھر کی سیر۔

۳۔ سویرے جو کل آنکھ میری کھلی۔

۴۔ ؎ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

۵۔ پاکستان میں فلموں کی صنعت۔

۶۔ ایک دلچسپ سفر ۷۔ وقت کی پابندی

۸۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔

۹۔ میرے احباب ۱۰۔ ایک حادثہ

۱۱۔ تندرستی ہزار نعمت ہے۔

۱۲۔ موسم سرما کی ایک شام۔

۱۳۔ قومی اتحاد۔ ۱۴۔ میرے مشاغل

۱۵۔ کمرۂ امتحان میں چند لمحات ۱۶۔ الیکشن

۱۷۔ ادب اور زندگی ۱۸۔ جنگ کے فوائد اور نقصانات۔

۱۹۔ رواداری ۲۰۔ کرسی کی آپ بیتی۔

۲۱۔ روپے کی آپ بیتی۔

۲۲۔ گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔

۲۳۔ مغربی تہذیب کا پاکستان پر اثر۔

۲۴۔ خدمت میں راحت ہے۔

۲۵۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔

۲۶۔ میں نے سینما دیکھا۔

۲۷۔ کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں۔

۲۸۔ اتفاق میں برکت ہے۔

۲۹۔ کسی جلوس کا ظرافت آمیز منظر۔

۳۰۔ محنت کی برکتیں ۳۱۔ پاکستان کی صنعتی ترقی۔

۳۲۔ عوامی حکومت کے کارنامے ۳۳۔ اتفاق میں برکت ہے۔

۳۴۔ پاکستان میں مسئلہ بے روزگاری۔

۳۵۔ ریلوے اسٹیشن کا منظر ۳۶۔ ہمارا نظام تعلیم۔

۳۷۔ سائنس اور اردو میں تعلیم ۳۸۔ سائنس اور مذہب

۳۹۔ کالج کی زندگی ۴۰۔ اگر میں شاعر ہوتا۔

۴۱۔ سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں۔

۴۲۔ زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا۔

۴۳۔ کیا شاعری تضیع اوقات ہے۔

۴۴۔ مہمان بننا اچھا ہے یا میزبان۔

۴۵۔ میرا دل پسند شاعر ۴۶۔ میرا محبوب ادیب۔

۴۷۔ حب الوطنی ۴۸۔ سیلاب اور اس کی تباہ کاریاں۔

۴۹۔ پاکستان میں صنعتی تعلیم کی ضرورت۔

۵۰۔ ایک پاکستانی برات کا آنکھوں دیکھا حال۔

۵۱۔ گداگری اور اس کے نتائج۔

۵۲۔ موسم سرما کی ایک چاندنی رات۔

۵۳۔ اخبار بینی کے فوائد ۔ ۵۴۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

۵۵۔ مجھے پاکستان سے کیوں محبت ہے۔

۵۶۔ رشوت اور اس کا انسداد ۵۷۔ علم بڑی دولت ہے۔

۵۸۔ میرا نصب العین ۵۹۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

۶۰۔ ایک دعوت چائے۔

۶۱۔ میرے گاؤں کا رومانی گرد و پیش۔

۶۲۔ میری زندگی کا ایک ناگوار واقعہ۔

۶۳۔ مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال۔

۶۴۔ نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

۶۵۔ اردو کی ترقی کے وسیلے

۶۶۔ ایک تفریحی سفر۔

۶۷۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔

۶۸۔ اسلامی سوشلزم وقت کی آواز

۶۹۔ جہیز۔ ایک لعنت ۷۰۔ ہڑتالیں۔ ۷۱۔ نکما خان ۷۲۔ اخلاقی بے راہ روی میں پنجابی فلموں کا حصہ۔ ۷۳۔ ہمارے تعلیمی مسائل ۷۴۔ تحریک پاکستان۔ ۷۵۔ طالب علمی کا زمانہ۔

۷۶۔ ہماری تہذیب۔ ۷۷۔ عورت اور پردہ۔ ۷۸۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔

۷۹۔ کیا انسان کا مستقبل روشن ہے۔ ۸۰۔ قیام امن کے لیے جنگ ناگزیر ہے۔

۸۱۔ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔

۸۲۔ ۔ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

۸۳۔ ۔ اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

۸۴۔ ۵ شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے

سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

۸۵۔ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔ ۸۶۔ تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے

۸۷۔ جس شخصیت سے میں متاثر ہوا۔ ۸۸۔ ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا۔

۸۹۔ اگر میں وزیر تعلیم ہوتا۔ ۹۰۔ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ ۹۱۔ پاکستان شاہراہ ترقی پر۔ ۹۲۔ کسی دوست کا عجیب و غریب کردار ۹۳۔ ایک صحت افزاء مقام کی سیر۔ ۹۴۔ اگر میں صدر مملکت ہوتا۔ ۹۵۔ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ۹۶۔ نامی کوئی بغیر مشقت ہوا نہیں ۹۷۔ سقوط ڈھاکہ ۹۸۔ عوامی تعمیراتی پروگرام۔ ۹۹۔ پاکستان کس طرح ترقی کر سکتا ہے۔ ۱۰۰۔ تعمیر قومی میں اخبارات کا حصہ۔
